''چہارسُو''

زندگی کے ساتھ ساتھ
ماہنامہ
چہارسو
راولپنڈی
شکیلہ اختر ایوارڈ
محترمہ شائستہ فاخری
اداس لمحوں کی خود کلامی
اداس لمحوں کی خودکلامی
چوبیس زبانوں کی ہندوستانی کہانیاں

......آوازِ پا......

''آوازِ پا'' بادی النظر میں نجم الحسن رضوی کی یادوں پر مشتمل ہے،لیکن دیکھا جائے تو اس میں صرف ان کی ذاتی زندگی کے نمایاں اور یادگار لمحے ہی نہیں سمٹ آئے ہیں، بلکہ ان کے ساتھ ہمارے ادب،سماج،سیاست اور صحافت کے بھی کتنے ہی اہم واقعات اور ادوار کا ایک نقشہ مرتب ہوگیا ہے۔نجم الحسن رضوی کا کمال یہ ہے کہ انہوں نے یہ نقشہ ایک ذمہ دار اور سچے ادیب کی طرح خاصی معروضیت سے مرتب کیا ہے۔انہوں نے ہر جگہ خود کو فوکس کرنے کے بجائے حقائق اور واقعات کو اہمیت دی ہے۔یوں اس کتاب کے ذریعے ہم ایک ادیب اور اس کے عہد سے بہ یک وقت اور بخوبی آگاہ ہوتے ہیں اور ہم دیکھتے ہیں کہ زندہ ادیب کا اپنے دور سے کیا رشتہ ہوتا ہے اور وہ اسے کس طرح اپنے فن کا حصہ بناتا ہے۔بلاشبہ یہ نجم الحسن رضوی کی کامیابی کا نیا سنگِ میل ہے۔

......سید مظہر جمیل

اشاعت:۲۰۱۵ء، قیمت:۵۰۰روپے،دستیابی:اکادمی بازیافت،اردو بازار،کراچی۔

...... پیچاک ......

شاہد جمیل کے موضوعات میں بہت تنوع ہے۔آج کونسا ایسا ادیب ہے جس نے افسانوں میں سائنسی موضوعات،ڈی این اے وغیرہ کے موضوع کو اتنی سہولت سے اُردو ادب میں برتا ہے۔میرے علم میں تو نہیں،ان کے خیالوں کی دنیا،تلمیحات اور استعارے بہت انوکھے اور دلکش ہیں۔انہوں نے اپنے کام کا کبھی ڈھول نہیں پیٹا۔لیکن ان کا اظہار اتنا طاقتور ہے کہ پڑھنے والے پر ایک بہت ہی مثبت تاثر چھوڑنے میں کامیاب رہتا ہے۔ان کا کہنا ہے کہ پوری انسانیت ادیان،مافوق الفطرت،جادو پرستی،ستارہ پرستی ایسے تصورات کے پیچاک میں پھنسی بیٹھی ہے۔میں کہتی ہوں کہ میں ان کے افسانوں کی گھمن گھیریوں میں پھنسی بیٹھی ہوں مگر مجھے چکر نہیں آرہے۔جھولے مل رہے ہیں۔مزا آرہا ہے،یقین نہ آئے تو آپ بھی پیچاک کھول کر پڑھنا شروع کردیں۔۔۔لطف و کرم کی بارش برسنے لگے گی۔

...... نیلم احمد بشیر

اشاعت:۲۰۱۵ء، قیمت:۲۰۰روپے،دستیابی:الحمد پبلی کیشنز،لیک روڈ،لاہور۔

...... کرنوں کا رقص ......

نجیب عمر کے افسانوں کا مطالعہ کرتے ہوئے اس بات کا احساس قوی ہوجاتا ہے کہ اپنے اردگرد وقوع پذیر ہونے والے معمولی نوعیت کے واقعات بھی جب نجیب عمر جیسے افسانہ نگار کے قلم سے افسانے کا روپ دھارتے ہیں تو قابلِ ذکر ہوجاتے ہیں۔ان کے افسانوں میں غیر ضروری جزئیات کا کوئی دخل نہیں۔سادہ اور سلیس انداز میں اپنی بات کہنے کا فن جانتے ہیں اور موضوعات کا تنوع ان کی اضافی خوبی ہے۔نیم وا در بچہ کی پذیرائی یقیناً ادبی حلقے میں ''حصارِ نظر'' سے بھی زیادہ کی جائے گی۔

......احمد زین الدین

اشاعت:۲۰۱۵ء، قیمت:۳۵۰روپے،دستیابی:ویلکم بک پورٹ،اردو بازار،کراچی۔

متاعِ چہارسو

شاید پہلی دلت کہانی کا تخم اسی دن پڑ گیا تھا جب دلت کو داس کہا گیا۔ دلت لٹریچر کی خاص بات یہ ہے کہ ان کی کہانیوں میں جمالیات تلاش کرنے والوں کو مایوسی ہوگی کیونکہ جن کی زندگی میں جمالیات کا تصور نہ ہو ان کے چہرے اور عمل میں جمالیاتی حسن کیسے آسکتا ہے۔ ایک دلت کی زندگی اذیت، تکالیف، غیض وغضب اور جدو جہد کی حسیت سے بھر پور ہے۔ ایک دلت کو محبت کرنے کا اختیار نہیں تھا۔ جہاں عشق نہیں وہاں جمالیات کا تصور ہی بے معنی ہو جاتا ہے

جس وقت قلم میرے ہاتھ میں ہوتا ہے، اس وقت میں صرف اور صرف ایک عورت ہوتی ہوں۔ ایسی عورت جو اپنے آپ کو چھپانا یا پوشیدہ رکھنا نہیں چاہتی بلکہ اپنا گریبان پھاڑ کر اپنے اندر کے سچ کو باہر لانا چاہتی ہے اور سامنے والے کا گریبان چاک کر کے اسے اس کا سچ دیکھانا چاہتی ہے۔ ایک تخلیق کار خاتون اگر مصلحت اور پابندیوں میں جکڑ کر قلم اُٹھاتی ہے تو میرا خیال ہے کہ وہ اپنی تخلیق کے ساتھ پورا انصاف نہیں کر سکتی۔

قرطاسِ اعزاز

شائستہ فاخری

کے نام

فجر کی نماز پڑھ کر ابھی آمنہ بی کے پیر چوکی سے نیچے نہیں اترے تھے کہ ٹین کے دروازے پر دستک ہوئی۔ دستک تیز ہوئی، تیز سے تیز تر۔۔۔ آفندی کا بیٹا اچھل کر چارپائی سے نیچے کود پڑا۔ دروازے کھلنے سے پہلے ٹوٹ کر زمین پر آ گرا۔ اسلحوں سے لیس خاکی وردی سے آمنہ بی کا گھر بھر اٹھا۔ محلے میں اٹھتے شور کی آوازیں اندر آ رہی تھیں مگر آفندی کے گھر میں گہری خاموشی اور موت کا سناٹا تھا۔ آمنہ بی دونوں بازو پھیلائے بیٹے کے سامنے کھڑی تھی۔

گھڑی کی ٹک ٹک اور میرے دل کی دھڑکنیں رفتار میں جیسے ہوڑ لگا کر بڑھ رہی تھی۔ مجھے لگا کہ جیسے میں کسی کھنڈر میں بھٹکتی پیاسی بدروح ہوں جو مرد کو اپنے سنگار سے رجھانے کے لئے طرح طرح کے سوانگ رچاتی ہے۔ کبھی کمرہ اُجاڑتی ہے، کبھی سجا دیتی ہے۔ کبھی جسم بوسیدہ کر کے بدن کو مٹی کا ڈھیر بنا دیتی ہے اور کبھی نئی بیاہتا کی طرح سنگار کر کے ڈورے ڈالنے کے لئے تیار سیج پر بیٹھ جاتی ہے۔

''چہار سُو''

''پروازِ تخیل''

محمد انعام الحق

(اسلام آباد)

نام: شائستہ ناز

قلمی نام: شائستہ فاخری

والد محترم: سید محمد زاہد فاخری،

صاحبزادہ مرحوم مولانا حاجی سید محمد شاہد میاں فاخری،

سجادہ نشیں، خانقاہ دائرہ شاہ اجمل، الہ آباد

پیدائش: ۷ نومبر سلطان پور (یوپی)

تعلیم: ایم اے، پی ایچ ڈی

ملازمت: سینئر اناؤنسر، آل انڈیا ریڈیو (الہ آباد)

افسانوی مجموعے

۱۔ سَندھی بیلا (ہندی)

۲۔ ہرے زخم کی پہچان (اردو)

۳۔ دیہہ کا دکھ (ہندی)

۴۔ ہرے زخم کی پہچان (ہندی)

۵۔ اداس لمحوں کی خود کلامی (افسانوں کا مجموعہ)، اردو

ناول

۱۔ نادیدہ بہاروں کے نشاں (اردو)

۲۔ صدائے عندلیب بر شاخِ شب (اردو)

تراجم

۱۔ چوبیس زبانوں کی ہندوستانی کہانیاں (اردو)

۲۔ 'اتم ارڑئے'۔ نرل ورما کی ناول کا اردو میں آخری بیابان کے عنوان سے ترجمہ 'آج' (پاکستان) کے ادبی کتابی سلسلے شمارہ ۵۷ میں شائع۔

۳۔ ''مجاز ویکتتو اوم کرتو'' شارب ردولوی کی کتاب 'اسرار الحق مجاز' کا اردو سے ہندی میں ترجمہ۔

ریڈیو ڈراما

۱۔ حاشیے پہ لکھی تحریر (۱۳ ابواب پر مبنی، آل انڈیا ریڈیو دلی اور لکھنؤ سے نشر

زیرِ طبع:

۱۔ گوری سووے سیج پہ (ناول)

۲۔ خشک پتوں کی موسیقی (افسانوی مجموعہ)

۳۔ کوئی موسم رہے جاناں (شعری مجموعہ)

۴۔ ایشیا کی منتخب کہانیاں (ترجمہ: ہندی)

۵۔ پاکستانی شاعرات: کلام کا انتخاب (ہندی)

۶۔ بین الاقوامی کہانیوں کے تراجم (ہندی)

انعامات:

۱۔ ۱۹۸۷ میں پریاگ راج ٹائمز کی جانب سے اعزاز

۲۔ ۱۹۹۲ء میں اتر پردیش اردو اکیڈمی کی جانب سے کتاب ''ہرے زخم کی پہچان'' پر انعام

۳۔ ۲۰۰۰ء میں ادبی، کلچرل اور سماجی انجمن 'سمنوئے' کی جانب سے ''چیتنا شری'' کا خطاب

۴۔ ۲۰۰۲ اور ۲۰۰۳ میں متر کل، پریاگ کی جانب سے اعزاز

۵۔ ۲۰۱۳ میں کلچرل اور سماجی انجمن رنگ وتیکا کی جانب سے اعزاز

۶۔ ۲۰۱۳ میں بہار اردو اکیڈمی کی جانب سے 'اداس لمحوں کی خود کلامی' (افسانوی مجموعہ) پر ''شکیلہ اختر ایوارڈ''

۷۔ ۲۰۱۴ء میں اتر پردیش اردو اکیڈمی کی جانب سے افسانوں کا مجموعہ 'اداس لمحوں کی خود کلامی' پر انعام

۸۔ ۲۱ دسمبر ۲۰۱۴، ایٹاوا میں، سارسوت سمان

رابطہ:

C-9, Radio Colony,Auckland Road,

Allahabad-211001

Email: shaistanaaz2009@gmail.com

Mob:09454695090

''تین صدیوں کی گواہ''

صرف ایک ماہ قبل ایک سو سترہویں سالگرہ منانے والی جاپان کی معمر ترین خاتون مساؤ اکاوا ۳۰/۱ مارچ ۲۰۱۵ء کو انتقال کر گئیں۔ مساؤ اکاوا کا شمار اُن چند اہم شخصیات میں ہوتا ہے جو تین صدیوں کے شاہد رہے ہوں۔ مساؤ اکاوا مارچ ۱۸۹۸ میں پیدا ہوئیں۔ انتقال کے وقت اُن کے بڑے بیٹے کی عمر نوّے برس اور بڑے پوتے کی اڑسٹھ برس ہے۔

دلت کہانیوں کے حوالے سے

ایک مختصر مکالمہ

شائستہ فاخری

تانیثیت کی تحریک اور دلت تحریک کا علمی سطح پر قریب قریب ایک ساتھ اٹھنا یہ صاف ظاہر کرتا ہے کہ دبے کچلے اور معاشرے کے روندے ہوئے لوگوں کی حمایت میں ایک آواز اٹھی اور اٹھ کر پھیلتی چلی گئی۔ اس بات کی کوئی اہمیت نہیں ہے کہ یہ آواز ان روندے ہوئے لوگوں کی جانب سے اٹھائی گئی یا پھر ان تمام دانشوروں اور معاشرے کے نظام سے غیر مطمئن لوگوں کی طرف سے اٹھی جو ایک نئے نظام اور اس کی تبدیلیوں کے حامل رہے ہیں۔ بلکہ ہم تو یہی کہیں گے کہ جب تک اپنے تئیں ہونے والے ظلم کے خلاف ہم خود نہیں کھڑے ہونگے تب تک ہماری حمایت میں کی جارہی کوئی بھی جنگ پورے طریقے سے کامیاب نہیں ہوسکتی۔

تانیثیت کی تحریک کی شروعات فرانس کی سیمون دی بووار کی آمد کے ساتھ ہوئی۔۔۔ جب اس نے پہلی بار یہ اعلان کیا کہ عورت اور مرد کو ایک پلیٹ فارم پر آنا چاہئے۔ ایک خاتون کی آواز نے عالمی سطح پر ہر زبان، ہر ادب اور تہذیب میں ایک ایسا سر پھونک دیا جس کے اثرات سے بچنا ناممکن ہوگیا۔ بحثوں، مباحثوں، تحریروں کا ایک ایسا سلسلہ شروع ہوا کہ پھر اس نے تھمنے کا نام نہیں لیا۔۔۔ مختلف طریقوں سے مردوں کے ذریعے سے عورتوں کا کم وبیش ہر جگہ کسی نہ کسی شکل میں استحصال ہوتا رہا ہے۔ کم سے کم ایشیائی ملکوں کے لیے یہ بات تو کہی ہی جاسکتی ہے۔

شودر، داس، نیچ، تچھ، چھوٹا طبقہ، ہلکا طبقہ، سوری طبقہ اور نہ جانے کتنے کلمات ہیں جو دلتوں کے لیے استعمال کئے جاتے رہے ہیں۔ دلت کا تصور ہر ملک میں اپنے طریقے، اپنے نظریے اور قوم کے حالات کے اعتبار سے الگ الگ رہا ہے۔ ہم یہاں صرف ہندستانی تہذیب کے پس منظر میں دلتوں کی بات کریں گے۔ اگر ہندستانی تہذیب کی بات کرتے ہیں تو ہمیں بھارتیہ سنسکرتی کی جڑوں تک پہنچنا ہوگا کیونکہ انہیں جڑوں کی بنیاد میں دلتوں کا ماضی سویا ہوا ہے۔ دلت پرتاڑنا یعنی دلت استحصال کی کہانی ایک دوسال کی نہیں، ایک دوصدی کی نہیں بلکہ ہزاروں سال پرانی ہے۔

تاریخ کے ورق پلٹتے ہیں تو رونگٹے کھڑے ہوجاتے ہیں۔ اس قوم کے نصیب کو روندنے اور کچلنے کے لیے ایک دو نہیں پورے تین ہاتھی تھے جنہوں نے اپنے بھاری بھرکم قدموں کے نیچے دلتوں کی گردن کو رکھ کر مسلا ہے۔۔۔ کچلا ہے۔۔۔ پھر بھی جینا تو تھا ہی۔ دلتوں نے خود کو کچھوا بنالیا۔ زندہ رہنے کے لیے ان کا یہ شعوری عمل تھا۔ اور یہی وہ عمل تھا جس نے ہزاروں سال کا سفر کرتے ہوئے اکیسویں صدی میں آکر نیا رنگ دکھایا۔ ان دلتوں نے نہ صرف ہاتھی کے ان پیروں کو بے دم کردیا بلکہ اپنے کینچوے کی کھال کو چھوڑ کر کچھوے کی چال کو اپنالیا۔ مجھے افسوس ہے کچھوے کی چال، لفظ کا استعمال کرتے ہوئے۔ مگر کیا کریں کہ اپنی فکر اس لفظ کو سوچنے کے لیے ہمیں مجبور کرتی ہے۔ مگر میرے اس لفظ پر تیوریاں چڑھانے والوں کو یہ بھی سوچنا چاہئے کہ خرگوش اور کچھوے کی دوڑ میں جیتا کون تھا۔

اس سے قبل کہ ہم اردو فکشن میں دلت لٹریچر کی بات کریں، ہمیں ہندستانی تہذیب کے پس منظر میں دلتوں کی تاریخ پر ایک طائرانہ نگاہ ڈالنا ہوگی۔

ویدک کلچر میں جاکر جب ہم پرانوں کے صفحے پلٹتے ہیں تو وشنو پران میں ان کا ذکر ملتا ہے۔ وشنو کے مینہ سے برہمن، باہو (بازو) سے چھتری، جانگھ سے ویشیہ اور چرنوں (پیروں) سے شودر پیدا ہوئے۔ جنہیں چتر وڑ کہا جاتا ہے۔

یہاں برہمن، چھتری، ویشیہ، دلتوں کے لیے کسی بھاری بھرکم ہاتھی سے کم نہ تھے۔ منواسمرتی میں کہا گیا ہے کہ برہمانے اس کارخانۂ جہاں کو چلانے کے لیے اپنے جسم سے ان چاروانوں کو جنم دیا۔

پوڑانک مت ہے کہ جب ایک دور ختم ہورہا ہوتا ہے اور دوسرے عہد کی شروعات ہونے والی ہوتی ہے تو معاشرے میں افراتفری پھیلتی ہے۔ اس افراتفری کو روکنے کے لیے ہی نئے نظام کی ضرورت محسوس ہوتی ہے۔ معاشرے کو اس طرح تقسیم کرنا وقت کی ضرورت تھی۔ یہیں پر ایک بات اور صاف طور پر کہی گئی ہے کہ برہ مڑ کرت یوگ کے چھتری، تریتا یوگ کے ویشیہ، دواپر یوگ کے شودر کلیگ کے ہیں۔

اگر وایو اور براہمن پران کی اس بات کو مانا جائے تو موجودہ عہد جسے ہم کلیگ کہہ رہے ہیں، دلتوں کا یگ ہے۔۔۔ پوڑانک کال میں ہی یہ بات بھی واضح کردی گئی کہ آلام ومصائب پچھلے جنم کے اعمال کا ہی نتیجہ ہیں۔ اس سوچ نے شودروں کو اور بھی شرم سار کیا۔ وہ داس کہلائے جانے لگے۔ جو غلام ہے اسے آزاد زندگی جینے کا حق نہیں۔ یہ ہم نہیں ہمارے معاشرے کی سوچ کہتی ہے۔

غلامی کا یہی وہ نظریہ تھا جس نے دلتوں کے مقدر کی تحریر میں سیاہ رنگ بھردیا۔ بدلتے وقت اور عہد کے حساب سے سیاہی بھی بڑھتی گئی۔ بیسویں صدی کے شروعاتی پچاس سالوں تک اس کا چہرہ بد سے بدتر ہوتا رہا۔

آزادی کے بعد دلت تحریک نے کروٹ لی۔ ریزرویشن کی روپ ریکھا تیار کرنے کے لیے کالیلکر کمیٹی بنائی گئی۔ سیاسی سرپرستی کی بات آگئی تو دلتوں نے اپنا پرچم آپ اٹھایا۔ بابا بھیم راؤ امبیڈکر اور جیوتی باپھولے جیسے

مسیحا سامنے آئے۔ تحریک نے زور پکڑا— منڈل کمیشن بنا اور اب اس کی رپورٹ کو لاگو ہونے کے بھی **21** سال پورے ہو چکے ہیں۔ اس کمیشن کے بعد سے ہندستانی سیاست، ہندستانی معاشرہ اور اس کے نظام کا چہرہ بدلنا شروع ہوا۔

کسی بھی ملک کے جب سیاسی پس منظر بدلتے ہیں تو اس کا سیدھا اثر اس ملک کے ادب پر پڑتا ہے۔ ہندستانی زبانیں اور ان کے ادب بھی اس تحریک سے متاثر ہوئے۔ یہاں یہ بات بھی واضح کرنا بہت ضروری ہے کہ جہاں ہندستان کی دوسری زبانوں اور لٹریچر میں دلت تحریک بہت نمایاں ہو کر سامنے آئی وہیں اردو ادب میں اس تحریک کا اثر ہوا لیکن لہجہ شائستگی کا رہا۔ اس کی بھی وجہ ہے مگر ہم اس وجہ کی تفصیل میں نہ جا کر سیدھے دلت ساہتیہ کے پیرائے میں ہندستانی ادب کی بات کرتے ہیں۔

شاید پہلی دلت کہانی کا تخم اسی دن پڑ گیا تھا جب دلت کو داس کہا گیا۔ دلت لٹریچر کی خاص بات یہ ہے کہ ان کی کہانیوں میں جمالیات تلاش کرنے والوں کو مایوسی ہوگی کیونکہ جن کی زندگی میں جمالیات کا تصور نہ ہو ان کے چہرے اور عمل میں جمالیاتی حسن کیسے آسکتا ہے۔ ایک دلت کی زندگی اذیت، تکالیف، غیض وغضب اور جدوجہد کی حسیت سے بھر پور ہے۔ ایک دلت کو محبت کرنے کا اختیار نہیں تھا۔ جہاں عشق نہیں وہاں جمالیات کا تصور ہی بے معنی ہو جاتا ہے۔

ہندی زبان میں دلت کہانیاں لکھنے والوں میں اوم پرکاش بالمیکی کا نام اہم ہے۔ سورج پال چوہان نے اپنی آپ بیتی ''سن تپت'' میں اپنی زندگی کا سارا درد انڈیل کر رکھ دیا۔ یہ درد ان کی کہانیوں میں بھی نظر آتا ہے۔ ان کی کہانی سازش ہی دیکھ لیجیے۔ دلتوں کے خلاف کی جانے والی سازش اس کہانی کا موضوع ہے۔ بینک منیجر شرما ہیڈ کلرک ستیش بھاردواج کو کچھ یوں سمجھا رہا ہے۔

''مستقبل میں دھیان رکھنا کوئی بھی نیچ ذات کا نوجوان اپنا دھندہ شروع کرنے کے لیے بینک سے قرضے کے لیے عرضی دیتا ہے تو اس کے خاندانی دھندے میں ہی لگنے کے لیے اصرار کرنا ہے۔ اسے ایسا یقین دلاؤ کہ وہ اپنا خاندانی دھندہ چھوڑ کر دوسرے دھندوں کا تصور بھی نہ کرے...... اگر یہ اچھوت اپنا خاندانی دھندہ بند کر کے کوئی نیا دھندہ کرنے لگیں گے تو آنے والی نسلیں ہمارے گھروں کی گندگی کیسے صاف کریں گی۔ اس حالت میں گھر کی گندگی کیا تم خود صاف کرو گے؟''

موہن داس نیمش رائے کی دلت کہانی ''اپنا گاؤں''، شیوراج سنگھ بے چین کی کہانی ''ہڈیوں کے الفاظ''، پرہلاد چندر داس کی ''لٹکی ہوئی شرط''، پریم کپاڈیا کی ''ہریجن''، پرشوتم ستیہ پریمی کی لکھی ہوئی کہانی ''بدلہ'' کا شمار بھی اچھی دلت کہانیوں میں ہوتا ہے۔

مراٹھی دلت کہانی نویس یوگی راج باگھ مارے کی کہانی ''گزرے سیر'' میں اس المیہ کو واضح کیا گیا کہ انسانی لاشوں کے ڈھانچے فروخت کر کے زندہ رہنا ہی ایک خاص طبقہ کی مجبوری ہے۔ لیکن وہ آپس میں مل جل کر دکھ درد بانٹ لینے کا حوصلہ بھی رکھتے ہیں۔ وہ ہار نہیں تسلیم کرتے۔ زندہ رہنے کی خواہش ان کے اندر مضبوطی سے پر پھیلائے ہوئے ہے۔

بابوراؤ باگل کی کہانی ''جب میں نے ذات چھپائی'' میں دلتوں کے دلوں میں جمی اس ذلت کا کلیان ہے جو انہیں سچے من سے زندگی جینے نہیں دیتی۔ اس طرح دیا پوار کی کہانی ''صلیب''، انا بھاؤ ساٹھے کی ''شمشان میں سونا''، وامن ہووال کی ''منزلوں والا مکان''، ارجن ڈانگلے کی ''بدھ ہی مرا پڑا ہے'' یہ سب مراٹھی ادب کی چند ایک اہم کہانیاں ہیں۔

دلت کہانیاں فن اور تکنک کو نہیں بلکہ زندگی کے کڑوے سچ کو ہو بہ ہو رکھنے کے عمل میں لگی رہی ہیں۔ سپاٹ زمین پر لکھی ان کہانیوں میں غیر ارادتاً آئی ہوئی علامتیں چونکانے والی لگتی ہیں۔ جیسے ہووالا کی کہانی میں ''ویاجی'' کا مکان جلنے اور پھر بننے کی جو جدوجہد ہے وہ علامتی پیرائے میں بیان کی گئی لگتی ہے۔ ویاجی کا مکان بنتے ہی اونچی ذات والوں کے ذریعہ جلا دیا جاتا ہے۔ ابھی ویاجی کی چتا بھی نہیں جل پائی تھی کہ اس کا بیٹا مکان کی بنیاد کھودنا شروع کر دیتا ہے اور اس بار وہ برساتی والے مکان کی نہیں بلکہ دو منزلہ پکے مکان کی بنیاد کھودتا ہے۔ کیونکہ بیٹے کو اپنے باپ کا خواب پورا کرنا تھا۔ مکان یعنی تحفظ حاصل کرنے کا خواب محض دو آنکھوں کا نہیں بلکہ پوری دلت برادری کا ہے۔

ارجن ڈانگلے کی کہانی ''اور وہ مر گیا'' دلتوں میں پھیلی ہوئی قدیم دقیانوسی تہذیب پر گہری چوٹ کرنے والی کہانی ہے۔

تیلگو ادب میں بھی دلت کہانی خوب خوب لکھی جا رہی ہے اور اچھی لکھی جا رہی ہے۔ دلوں میں گہرے بیٹھے دکھ درد کا اظہار کرتی یہ کہانیاں خاموشی سے بہت کچھ سمجھا جاتی ہیں۔ آچاریہ کولک لوری اپناک کی کہانی ''گاؤں کا کنواں''، پی۔ رام کرشنا ریڈی کی کہانی ''وہ کیوں نہیں بولے''، تلمر لاکلا ندھی کی لکھی دلت کہانی ''سمجھوتہ'' اسی نظام سے نکلی کہانیاں ہیں۔

گجراتی ادب بھی دلت کہانیوں سے بھرا پڑا ہے۔ ہریش منگلم کی ذاتی، دلپت چوہان کی ''ٹھنڈا خون''، موہن پرمار کی ''بے داغ''، اروند ویگڑا کی ''جھولا''— یہ سبھی کہانیاں آپ بیتی یا درد کا اظہار ہیں۔

جب کوئی تحریک شروع ہوتی ہے تو ہر زبان کے ادب میں یہ تحریک خوشبو کی طرح چھا جاتی ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ کہیں کم کہیں زیادہ اثر ہوتا ہے۔ پنجابی ادب بھی اس سے متاثر ہوا۔ اترو جیت کی کہانی 'بچھو' میں اونچی ذات کے مزدور کی آنکھوں کی چمک ایک دلت وکیل اندر سنگھ کٹاریا کو پریشان کرتی ہے۔ نام ایک انسان کی کتنی بڑی پہچان ہوتی ہے— بچھو کہانی میں دلتوں نے اپنا نام ہی بدل کر اونچے کل کے نام رکھ لیے— چوپڑہ اور کٹاریہ میں ایک بات تو مشترک تھی کہ دونوں نے اپنی اصلی ذات برادری کی دھول اپنے اوپر سے جھاڑ دی تھی اور اپنے نام کے ساتھ اونچی ذاتوں کے نام ''چوپڑہ'' اور کٹاریہ

چپکا لیے تھے۔ چوہڑہ مہتر اور کٹارپہ چمار ماں باپ کی اولاد تھے۔

کیا اسے ایک خاموش بغاوت نہیں کہی جاسکتی—؟ ہاں کچھ بغاوتیں ایسی ہی ٹھنڈی ہوتی ہیں مگر رفتار تیز ہوتی ہیں۔

ملیالم کہانی میں ہم نارائن کی دلت کہانی ''واعظ کا جنم'' کا ذکر کرنا چاہیں گے۔ ''انسان ہمیشہ سے پاپی رہا ہے۔ گناہوں سے ہوکر اس کا جودائمی سفر ہے وہ نجات کے لیے ہے کیا—؟ کہانی کی شروعات انہیں جملوں سے ہوتی ہے اور رفتہ رفتہ اپنی رفتار پکڑتی ہے۔

ہندستانی ادب میں ایسی بے شمار کہانیاں ہیں جو دلتوں کے دکھ درد، انتقام اور نظام حاضر میں تبدیلی کی ترجمان بن کر خاموش کھڑی، وقت کے بدلاؤ کا انتظار کر رہی ہیں۔

اس تحریک کا اثر اردو ادب پر بھی پڑا مگر اس شدت سے نہیں جتنی شدت سے دوسری زبانوں میں نظر آیا۔ اس کی وجہ بھی صاف ہے کہ اردو تخلیق کار ابھی ان مسائل اور موضوعات میں الجھا ہوا ہے جو خالص اس کے لیے یعنی اس کی قوم پر عذاب کی شکل میں چھائے ہوئے ہیں۔ مگر اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہے کہ اس نے دنیا جہان سے آنکھیں موند رکھی ہیں۔ اپنے ملک کے ساتھ ساتھ عالمی مسائل بھی اردو لٹریچر کا حصہ رہے ہیں۔ جہاں عام ہندستانی زبانوں میں دلت کہانیاں آرہی ہیں تو اردو ادب اس سے اچھوتا کیسے رہ جاتا۔ یہ بھی سچ ہے کہ اردو میں دلت کہانیاں کم لکھی گئی ہیں مگر جو لکھی گئی ہیں پوری شدت سے لکھی گئی ہیں۔ اس سلسلے میں اقبال مجید، ذوقی، غضنفر وغیرہ کے نام لیے جاسکتے ہیں۔

اقبال مجید کی ''آگ کے پاس بیٹھی عورت'' ایک اچھی دلت کہانی کہی جاسکتی ہے۔ دلت سماج ہندستانی تہذیب میں کسی ناسور کی طرح رہا ہے۔ صدیوں سے اپنے آقاؤں کے ظلم و ستم کو سہتے ہوئے جیسے انہیں ذلت سہنے کی عادت پڑ گئی ہو۔ انہوں نے بہ آسانی قبول کرلیا کہ وہ ہماری سوسائٹی کے ''مل'' ہیں اور ''مل'' (گندگی) میں سانسیں بھرنا ہی ان کا مقدر ہے۔ آگ کے پاس بیٹھی عورت نے بیٹھے بیٹھے ہی اتنی خاموشی سے ایسا باکمال عمل کر دکھایا جس کا تصور اب تک کی کسی دلت خاتون نے شاید ہی کیا ہو۔ کہا جاتا ہے کہ گھورے کے دن بھی پلٹتے ہیں۔ ہم انہیں گھورا نہیں کہہ رہے ہیں مگر ان کا معاشرہ کسی گھورے سے کم نہ تھا۔ بہر حال جیسے تبدیلیاں پہلے آئی تھیں اور انہیں ہندستانی تہذیب کا حاشیہ مان لیا گیا تھا، ویسے ہی تبدیلیوں کی ہوا نے حاشیے (دلتوں) کو حاشیے پر رکھ کر ایسا فٹ نوٹ بنا دیا جسے پڑھے بغیر آگے بڑھنا جیسے خود کو نامکمل چھوڑ دینے جیسا ہوتا۔ اقبال مجید نے اسی فٹ نوٹ پر آ کر دلت سماج کے بدلے رویے اور ان کے آقاؤں کی پست ذہنیت پر وار کرتی ایک ایسی کہانی کو الفاظ کا لباس پہنایا جسے ہم نئے عہد کی ایسی کہانی کہہ سکتے ہیں جو آج کے کنزیومر ورلڈ کا آئینہ بھی ہے، جس میں بدلتے معاشرے کی مختلف تصویریں مختلف رنگوں میں اپنا عکس چھوڑتی ہیں۔ اور شدت سے اپنی پہچان بناتی ہیں۔

دلت سماج کے مردوں کی بات جانے دیجئے، عورت نے کیا کچھ ستم نہ اٹھایا۔ اس خبر کو یاد کیجئے جب ایک اونچی ذات کے حیوان مرد نے دلت عورت کی شرم گاہ میں وہ لاٹھی ڈالی تھی جس لاٹھی کا استعمال وہ ان کے مردوں پر کیا کرتا تھا۔ (شیومورتی کی کہانی)

یہ تصور سے پرے ہے کہ دلت سماج کی دبی کچلی روندی عورتوں میں انتقام کی وہ آگ آج موجود نہ ہو—معاشرے کے اس بدنما چہرے سے اردو تخلیق کار کیسے غافل رہ سکتے تھے—اقبال مجید کا افسانہ ''آگ کے پاس بیٹھی عورت'' وہ عورت ہے جو ایک پنڈت کو اس گندے گلاس میں پانی پلاتی ہے جس میں وہ سور کے بیمار بچے کو دودھ پلاتی تھی۔

اس کے بعد افسانہ نگار نے کتنی نزاکت سے اس عورت کے جذبات کی عکاسی کی ہے کہ اس کے چہرے پر ایسا سکون آگیا جیسے پیشاب کی حاجت سے فارغ ہونے کے بعد آتا ہے۔

بات اگر یہیں ختم ہو جاتی تو کوئی بات نہ تھی مگر بات وہاں پہنچتی ہے جہاں سے آتش فشاں پھٹا کرتے ہیں۔ اس عورت نے اس گلاس کو جس میں اس نے پنڈت کو پانی پلایا تھا، چمٹے سے اٹھایا اور دہکتی آگ پر رکھ کر پاک کر دیا۔ اونچی ذات کے مرد پر ایک دلت عورت کا ایسا بھرپور طمانچہ جسے ہم نئے عہد کی بہتی بیار کا خوشگوار جھونکا کہیں گے۔ یہ وہ کہانی ہے جو اکیسویں صدی کے موضوعات کے اعتبار سے تخلیق کے نئے روزن کھولتی ہے۔ جہاں سے ہم اپنے عہد کو جھانک کر دیکھ سکتے ہیں— حالانکہ فکشن کے موضوعات کا یہ ایک پہلو ہے۔

دلت ادب میں آنے والی ان تبدیلیوں کو مشرف عالم ذوقی کی کہانی سور باڑی میں بھی دیکھا جاسکتا ہے۔ کہانی کی شروعات یوں ہوتی ہے۔

''لٹے ہوئے سامان
حقارت سے دیکھتی ہوئی آنکھیں
ہم نے اب جینے کا عہد کرلیا ہے
ان بیڑیوں کو کاٹ کر
بیڑیاں جو نامرد بناتی ہیں ہمیں
کاٹ ڈالتی ہیں تنے ہوئے ان بازوؤں کو
جن میں روانی سے دوڑتے ہوئے خون
ہر پل احساس دلاتے ہیں آزادی کا''

ذوقی نے یہ کہانی 1986 میں لکھی تھی—ایک سور باڑی ہے۔ جہاں ڈوم رہتے ہیں۔ سور باڑی کے پاس ہی مڈل کلاس والوں کی فیملی ہے۔ اور آتے جاتے اس کلاس کا سامنا سور باڑی سے ہوتا رہتا ہے۔ پھر ایک وقت آتا ہے جب سور باڑی اجاڑ دی جاتی ہے۔ اور بھکا ڈوم کہانی کے آخر میں بغاوت اور احتجاج کی علامت بن جاتا ہے۔ یہ ایک ایسا افسانہ ہے جو اردو کے دلت

باقی صفحہ ۱۸ پر ملاحظہ کیجیے

براہِ راست

صاحب! اس رائے میں اب قطعاً کوئی وزن نہیں رہا کہ جناب ہمارے دور سے بڑے ادیب اور ادب ناپید ہو چکے ہیں۔ ضرورت جستجو، لگن اور محنت کی ہے۔ ہم اپنی بات کو مزید آگے بڑھانے سے قبل آج کی نشست کی مہمانِ خاص **محترمہ شائستہ فاخری** کی جانب آپ کی توجہ مبذول کرانا چاہیں گے۔ شائستہ فاخری صاحبہ نے جس قدر بھی لکھا اور جس معیار کا لکھا اُس سے ادب کا وسیع حلقہ بخوبی آگاہ ہے اور محترمہ شائستہ فاخری کی نسبت جو رائے قائم ہو رہی ہے وہ بھی ہم اور آپ سے پوشیدہ نہیں۔ ہم نے دیانت داری سے شائستہ صاحبہ کی شخصیت او رفن کو مربوط شکل میں آپ کے روبرو پیش کرنے کی کوشش کی ہے اور اس امید کے ساتھ کہ ہماری کوشش اور کاوش کی روشنی میں آپ بھی آج کے دور کی نامور قلم کار محترمہ شائستہ فاخری کی نسبت دو ٹوک رائے قائم کرنے میں یقیناً کامیاب ہو جائیں گے۔ اگر ایسا ہوا تو یہ ہماری بڑی کامیابی ہوگی جسے ہم اپنی خوش نصیبی سے تعبیر کرنے میں حق بجانب ہوں گے اور شائستہ فاخری صاحبہ مستقبل کو اپنی مٹھی میں بند کرنے پر قادر ہوں گی اور یہی امر اردو ادب کی کامیابی و کامرانی کا موجب بنے گا!!!

گلزار جاوید

☆ خانقاہ شاہ اجمل کی تاریخ اور اُس سے آپ کا تعلق ماضی اور حال کے آئینے میں بیان کیجیے؟

☆☆ شمالی ہندوستان میں شہر الہ آباد کی ادبی و تمدنی تاریخ میں دائرہ شاہ محمد اجمل کو خاص مقام اور اہمیت حاصل ہے۔ صدیوں سے یہ دائرہ علم و فضل کا مرکز خصوصی اور تہذیب و تمدن کا گہوارہ رہا ہے۔ بانی دائرہ شیخ محمد افضل الہ آبادی، وہ عظیم شخصیت ہیں جنھوں نے اس دائرہ میں علم و ادب کی بنیاد ڈالی۔ آپ نے سلسلہ چشتیہ میں بیعت کی لیکن تعلیم و تربیت سلسلہ قادریہ ہی کی ہوئی تھی۔

بادشاہ وقت شہنشاہ عالم گیر کے عہد حکومت میں اس دائرہ کا انعقاد ہوا۔ عالم گیر نے شیخ کے لئے ایک مکان مسکونہ موسوم بہ ''محل'' ایک مسجد اور ایک خانقاہ بھی تعمیر کرائی۔ جو اپنے نئے رنگ و روغن کے ساتھ اب بھی موجود ہے۔

حضرت شاہ محمد افضل عباسی الہ آبادیؒ اپنے وقت کے نہ صرف بہت بڑے صوفی اور بزرگ کامل گزرے ہیں بلکہ مشاغل خدمت خلق، رشد و ہدایت کے بعد ان کی زندگی کا بیشتر حصہ علم و ادب کی خدمت میں بسر ہوا تھا۔ انہیں عربی و فارسی کے بلند ادیب اور شاعر کی حیثیت حاصل ہے۔ قاموس المشاہیر کے مصنف نظامی بدایونی نے انہیں پچاس کتابوں کا مصنف بتایا ہے۔

اس دائرہ کی شاہ محمد اجمل وہ عظیم المرتبت شخصیت ہیں جنھوں نے علوم اسلامیہ کی تبلیغ و اشاعت کے علاوہ فارسی زبان و ادب کی اشعات و ترویج کی طرف خصوصی توجہ دی۔ اس کے بعد اس دائرہ کو بڑی شہرت حاصل ہوئی۔ ہندوستان اور بیرون جات کے علماء و شعراء کی آمد کا سلسلہ رہتا تھا۔ یہ تو تھا تاریخی پسِ منظر اگر میرے تعلق سے حال کے آئینے میں بات کی جائے تو میں اپنے دادا میاں کے ذکر سے بات کرنا چاہوں گی، جنھوں نے مجھ میں جانے کیا دیکھا کہ جب تک حیات میں رہے مجھے 'فاخری شیر' کہہ کر بلایا کرتے تھے۔ دادا صاحب کے دور میں، پہلی بار خانقاہ کی فضا تصوف اور ادب کے ساتھ سیاسی رنگ میں آئی۔ وہ اپنے وقت میں اعزاء میں سربلند، شہر میں محترم، ملک میں مقتدر، جمعیتہ العلماء، ہند کے مستقل نائب صدر اور صوبائی جمعیت کے صدر، کونسل کے ممبر، اسمبلی کے رکن، پارلیمانٹری سکریٹری تھے۔ شاعری خاندانی ملکیت تھی۔ میرے والد سید محمد زاہد میاں فاخری چار بھائیوں میں دوسرے نمبر پر تھے۔ بڑے ابّو جن کی میں مرید ہوں، ان کے پاکستان چلے جانے کی وجہ سے جب گدّی نشینی میرے والد کے حصے میں آئی تو یہ کہہ کر انہوں نے اپنے قدم پیچھے کھینچ لئے کہ وہ ایک سرکاری افسر ہیں۔ نوکری کے ساتھ گدّی نشینی کی ذمہ داری مشکل مرحلہ ہے۔ والد نے سجادگی کی پگڑی اپنے چھوٹے بھائی یعنی میرے چچا سید محمد ناصر فاخری کے سر پر باندھ دی۔ جو موجودہ سجادہ نشین ہیں۔

☆ آپ کا بچپن پیری مریدی، جھاڑ پھونک، نذر نیاز اور تعویذ گنڈے کے ماحول میں پروان چڑھا ہے۔ شعور کی آنکھ کھلنے کے بعد ان چیزوں کی نسبت آپ کا ردِعمل کس طرح کا تھا؟

☆☆ ظاہر ہے میری ذہنی تربیت اور پرورش اسی ماحول میں ہوئی۔ مگر جیسے جیسے شعور بالغ ہوتا گیا خود بخود یہ بے عمل بے معنی لگنے لگا۔ کیوں کہ ہاتھ اُٹھا کر اپنے رب سے دعا مانگنے کی جو تاثیر ہے وہ تعویز گنڈے میں کہاں ہوتی ہے۔

☆ اگر ہم اس رائے سے اتفاق کرلیں کہ آپ کا مزاج صوفیانہ ہے تو ہمارے دل میں آپ کی وارداتِ قلبی سے آگاہی کا اشتیاق بے جا نہ ہوگا؟

☆☆ کبھی کبھی ایک سادے سے سوال کا جواب بیحد پیچیدہ ہو جاتا ہے جب معاملہ وارداتِ قلبی یا دل کی کیفیت کا ہو تو یہ پیچیدگی اور بڑھ جاتی ہے۔ اس زُمرہ میں اتنا ہی کہنا چاہوں گی کہ بچپن میں میرے متعلق گھر کے بزرگوں کی عام رائے تھی کہ 'یہ بڑی بے نیاز اور خاموش بچّی ہے'۔ سچ مچ مجھے لوگوں سے ملنا جلنا اچھا نہیں لگتا تھا۔ اُس وقت میری عمر تقریباً چار پانچ برس کی رہی ہوگی۔ میں اپنے اللہ پاک سے ایک ہی دعا مانگا کرتی تھی کہ یا اللہ تو میری زبان کاٹ دے تو مجھے

بولنا نہ پڑے۔ یہ دعا تب تک جاری رہی جب تک میرا شعور بالغ نہیں ہوا۔ مجھے گھر کے کسی کونے میں بیٹھ کر کچھ سوچتے رہنا، کچھ دیکھتے رہنا اچھا لگتا تھا۔ کیا سوچتی تھی، خلا میں کیا تکتی تھی اب کچھ بھی یاد نہیں۔ میرے والد مجھے بتاتے تھے کہ یہ عادت میری گدّے پر سے تھی جب میں صرف دو چار ماہ کی تھی۔ میرے اسی رجحان کو دیکھتے ہوئے انہوں نے کم عمری میں ہی اپنے بڑے ابّو مولانا الحاج سیّد محمد خالد میاں فاخری سے مجھے بیعت کرادیا۔

☆ آپ کے بچپن کو مختلف بتانے والے کس امر کی نشان دہی کرنا چاہتے ہیں؟

☆☆ یہ نشان دہی ۱۰۔۱۲ برس تک کی ہے۔ اس کے بعد میرے اندر تیزی سے بدلاؤ آیا اور دل آس پاس کے ماحول سے باغی ہونے لگا۔ عورتوں کے مسائل اور ان کے حالات متاثر کرنے لگے۔ یہ عورتیں وہ ہوتی تھیں جو اپنے دکھ درد لے کر درگاہ میں آیا کرتی تھیں۔ تعویز، پھونک اور گنڈے سے اپنا علاج کرایا کرتیں۔ میں ان کے بیچ پہنچ کر خاموشی سے ان کی باتیں سنتی رہتی۔ گنتی رہتی۔

☆ آپ کی خاموشی میں بے چینی، بیزاری، سنجیدگی اور فکر وخیال میں تلاطم کا سلسلہ کب اور کیونکر در آیا؟

☆☆ خاموش رہنا میری عادت میں شامل ہے۔ کچھ کچھ سوچتے رہنا اچھا لگتا ہے۔ یہ ''کچھ کچھ'' کچھ بھی ہوسکتا ہے۔ کسی خواب کی ہوائی پرواز بھی، آسمان پر بادلوں کی بنتی بگڑتی تصاویر بھی، اپنے تراشے کرداروں کے دکھ درد بھی۔ اکثر میں ان کرداروں میں اُتر کر خود کو بھی بھول جاتی ہوں۔ میرے اندر بے چینی تب پیدا ہوتی ہے جب لوگ میری خاموشی کو میری ڈپلومیسی کہہ کر چوٹ پہنچاتے ہیں۔ ہاں! جب بھیڑ میں چپ بیٹھ کر لوگوں کا منہ تکتی ہوں تو خود سے بے زار ہونے لگتی ہوں۔ سنجیدگی اور فکر وخیال میں تلاطم کا سلسلہ کب شروع ہوا، یہ میں خود نہیں جانتی۔ تیرہ برس کی عمر میں تکئے کے نیچے ڈائری رکھ کر میں رات کے اندھیرے میں چھپ چھپ کر شاعری کیا کرتی تھی۔ وہ ڈائری اب میرے پاس نہیں ہے۔ جہاں سفر کے بہت سے سامان چھوٹ گئے، وہیں وہ کہیں پڑی ہوگی۔ بہت یاد آتی ہے اس کی۔ بہر حال آگے بڑھنا ہے.....اب اس ڈائری کے دو، تین بند یاد ہیں، میں وہ بند اس لئے آپ کو بھیجنا چاہتی ہوں کیوں کہ یہی وہ دور تھا جب دل نے تمام پابندیوں سے بغاوت کرنا شروع کیا تھا۔

رات کی بے پناہ تلخیوں میں جب
احساسِ تنہائی ذہر گھولنے لگی
بستر کی سلوٹوں پر جسم رگڑ رگڑ

☆

کھوجوں تجھ کو یوں ہی کب تک
آشاؤں کی چھاؤں میں
تیری یادوں کے کھنڈر میں
عمر بتاتی جاؤں میں

☆

دکھ کی گھٹا جب چھاتی ہے
تمہاری یاد بہت آتی ہے
آنسوں کے میگھ برستے ہیں
سوندھی دیہہ مہک مہک جاتی ہے
ساون کا مہینہ ہے
نتھ کنگن سب سونے ہیں
تم واسی ٹھرے دور دھام کے
میں سیج ادھوری لئے کھڑی ہوں

☆ گفتگو کے آغاز ہی سے آپ کی اُداسی اور افسردگی کا مقابل کو بخوبی اندازہ ہوجاتا ہے مگر آپ نے اس پر فکر وفلسفے کی چادر تان رکھی ہے؟

☆☆ اس سلسلہ میں یہی کہوں گی کہ کچھ معاملات کی وضاحت نہ ہو تو بہتر ہے۔

☆ آپ کے ہاں خوف کی انجانی کیفیت کا ذکر بھی اکثر کیا جاتا ہے؟

☆ زمین کے حوالے سے بھی خاص طرح کا خوف آپ کے ہاں گھر کئے ہوئے ہے؟

☆ آپ کے ہاں خواب کی تکنیک کا استعمال بھی کثرت سے کیا جاتا ہے؟

☆☆ میں آپ کے تینوں سوالات کے جواب اکٹھے دینا پسند کروں گی۔ بیشتر شرفاء مسلم گھرانوں میں، خاص طور سے خانقاہی ماحول میں پلی بڑھی لڑکیوں میں خوف پرورش کا ایک حصہ ہے۔ لڑکیاں جب برس ڈیڑھ برس کی ہوتی ہیں اور ڈگر مگر قدموں سے صدر دروازے کی طرف بڑھتی ہیں تو انہیں آنکھیں پھاڑ کر، چہرے پر مصنوعی خوف لا کر بتایا جاتا ہے کہ باہر باگڑ بلاّ بیٹھا ہے، کاٹ کھائے گا۔۔ظاہر ہے اس کے پیچھے منشاء یہ ہوتی ہے کہ بچی گھر سے باہر نہ نکلے مگر بچی باگڑ بلاّ کا مطلب سمجھے بغیر خوف زدہ ہوجاتی ہے۔ وہ جب دو ڈھائی برس کی ہوتی ہے اور گھر کے کسی لڑکے نے اگر خدانہ خاستہ لڑکی کا منہ چوم لیا تو باپ تنبیہہ کرے گا کہ لڑکی ذات ہے، آیندہ ایسی حرکت مت کرنا۔ بچی کچھ نہ سمجھتے ہوئے اپنی گلابی ہتھیلی سے چہرہ رگڑ لیتی ہے۔ آیندہ ایسی حرکت پر وہ خود منہ گھما لیتی ہے یا رونے لگتی ہے۔ جب لڑکی چھ سات برس کی ہوجاتی ہے تو گھر میں ہنگامے شروع ہوجاتے ہیں۔ ماں کو آوازیں پڑنے لگتی ہیں کہ دیکھو! لڑکی ننگی ٹانگیں نہ گھوے، پائجاما پہناؤ، زمانہ خراب ہے۔ بچی زینہ بہ زینہ خوف کی منزلیں طے کرتے ہوئے عمر کے دائرے پھلانگتی رہتی ہے۔ ۱۳۔۱۴ برس تک پہنچتے پہنچتے جہنم کے دہکتے انگاروں کا خوف ایک موٹی ردا کی شکل میں اس کے وجود کو لپیٹ لیتا ہے اور پھر خوف ایک ٹیبو بن جاتا ہے۔ پھر وہ زندگی کے خوبصورت لمحوں میں

بھی گناہ کے عنصر تلاشنے لگتی ہے۔ میری پرورش بھی خانقاہی تہذیب میں ہوئی، وہ تہذیب جو بیسویں صدی تک آتے آتے نئی شکل اختیار کر چکی تھی۔ جہاں تک کہانیوں میں خوف سے جڑے خواب کی بات ہے، تو جب انسان نیند کی غفلت میں ہوتا ہے لاشعور میں قسم قسم کے خوف ناگ پھنی کے کانٹوں کی طرح پھلنے پھولنے لگتے ہیں اور خواب کی شکل میں سامنے آتے ہیں۔ حرف حرف حساب کا دن، انگلیوں پر گنتی کا سفر، آخری پہر کا ڈوبتا منظر، ریچھ،کلر بلائنڈ اور خوفِ گنبد میں روشن آنکھیں جیسی کہانیاں اسی کیفیت کی ہیں۔

☆ دائرہ شاہ جمال کے اسلامی ماحول کی پروردہ لڑکی اردو یا اسلامیات کے بجائے سنسکرت میں ایم۔ اے کن احساسات کے تحت کرتی ہے؟

☆☆ میرے گھر کا ماحول بہت اسلامی اور ادبی تھا۔ میرے والد کا جھکاؤ شروع سے دین اور مذہب کی طرف تھا۔ انہیں ادب میں بھی خاص دلچسپی تھی۔ شام ہوتے ہی جب آفس سے وہ آ جاتے تو دیر رات تک ڈرائنگ روم اس قسم کی گفتگو میں دلچسپی رکھنے والے لوگوں سے بھرا رہتا۔ جب میں نے پہلی کہانی لکھی اور اس پر بات چیت ہوئی، تبھی سے لوگوں کو خطرے کی کچھ بو محسوس ہو گئی۔ اس کہانی پر میرے والد کا ردِعمل خاموشی کا تھا مگر ناگواری ان کے چہرے پر تھی۔ جس نے مجھے خوف ذدہ کر دیا تھا۔ خوف کا پہلا بیج میرے خمیر میں داخل ہوا اور میں نے اپنی ادبی زندگی کی پناہ ہندی اور سنسکرت زبان میں ڈھونڈھنی شروع کر دی۔

☆ آپ نے پہلی ہندی کہانی ''آنگن'' ساتویں درجہ کے دوران لکھی تھی۔ کیا آپ اُن احساسات وتجربات میں ہمارے قاری کو شریک کرنا پسند کریں گی جو اس کہانی کے ظہور میں آنے کا جواز بنے؟

☆☆ کہانی کا عنوان آلنگن تھا جس کے معنے ہیں، ایک دوسرے کی باہوں کی گرفت میں آ جانا۔ رومانٹک کہانی تھی۔ کہانی کچھ اس طرح کی تھی...ایک گاؤں کی فضا جہاں کھلے عام محبت کے اظہار پر سخت پابندی ہوتی ہے۔ وہاں ایک غریب لڑکے کو پردھان کی بیٹی سے محبت ہو جاتی ہے، محبت جیسے جیسے پروان چڑھتی ہے، ویسے ویسے مخالفت بڑھنے لگتی ہے۔ لڑکی کی بغاوت دیکھ کر اپنی عزت کی خاطر پردھان خاموش ہو جاتے ہیں۔ لڑکا کسی کام سے شہر جاتا ہے وہاں پردھان کے آدمیوں کے ذریعہ اس کا قتل کروا دیا جاتا ہے اور خبر یہ اُڑا دی جاتی ہے کہ لڑکے کی موت کی وجہ ہندو مسلم دنگا ہے جو عام طور پر شہر میں ہوا کرتا تھا۔ خبر گاؤں میں آتی ہے۔ لڑکی اپنے محبوب کی جدائی برداشت نہیں کر پاتی اور کوئیں میں کود کر جان دے دیتی ہے اور پھر آسمان کی بلندی پر دونوں کا آلنگن ہوتا ہے۔ جو کبھی زمین پر ممکن نہ ہو سکا اسے آسمان کی وسعت نے پورا کر دکھایا۔ کہانی کا اختتام یہیں پر ہو جاتا ہے۔

اس کہانی کے موضوع نے لوگوں کے کان کھڑے کر دئے اور میں نے راستہ بدلنے میں ہی اپنی ہوشیاری سمجھی۔ لکھنے کے لئے اس طرح کا موضوع چننا اس وقت ایک لڑکی کا بے باک قدم مانا جاتا تھا، جو گمراہی کی علامت ہوتا تھا۔

☆ اپنے خوابوں کی نسبت کچھ معلومات دیجیے مثلاً آپ خواب کس نوعیت کے دیکھتی اور اُن کی تعبیر کس طرح کی ہوتی ہے؟

☆☆ ہر چند یہ سوال ذاتی نوعیت کا ہے مگر اس کے حوالے سے میں صرف یہ کہنا چاہوں گی کہ میرے خواب اور اُن کی تعبیر میری تخلیقات کی شکل میں آپ کے سامنے ہیں۔

☆ آپ کہانی کا آغاز درمیانی واقعے یا اختتامی کلمات سے ہی کیوں کیا کرتی ہیں؟

☆☆ جب کسی موضوع پر کہانی لکھنا ہوتا ہے تو میں اسے تب تک قرطاس پر نہیں اتارتی جب تک کہ ایک ایک جملہ ذہن میں نہ تراش لوں۔ جس زمین کے کردار ہیں اس زمین پر خود کھڑی ہو کر ان کے ساتھ نہ جیوں۔ ان کے دکھ درد، ان کے مسائل کو اپنا نہ بناؤں تب تک قلم انگلیوں کی گرفت میں نہیں لیتی۔ اس لئے ایک کہانی لکھنے کے لئے میں خود کو کافی وقت دیتی ہوں۔ جب ذہن میں پوری طریقے سے کہانی تیار ہو جاتی ہے تو پہلا سین کیا بننا ہے، اس پر زیادہ سوچنا نہیں پڑتا۔ کردار ضرورت کے حساب سے خود بخود اپنی کہانی کہتے ہوئے آگے بڑھتے ہیں۔ ہاں کچھ کہانیوں میں ایسا بھی ہوا ہے کہ اختتام ذہن میں پہلے گندھ گیا ہے اور میں بغیر کوئی اپنی منطق لگائے کہانی کو وہیں سے شروع کر دیتی ہوں۔

☆ کہا جاتا ہے شائستہ فاخری کہانیوں کے کردار و واقعات اپنے آس پاس سے لیتی ہیں۔ جس قدر تجربات ومشاہدات آپ کے ہاں بیان ہوئے ہیں اُن کا کسی ایک ماحول یا مقام پر دستیاب ہونا ناممکن نہیں تو مشکل ضرور ہے؟

☆☆ ہاں یہ سچ ہے کہ میں کہانیاں اپنے اردگرد سے اُٹھاتی ہوں۔ کرداروں کی کمی نہیں رہتی۔ سب ہمارے آس پاس ہی رہتے ہیں۔ بس ضرورت ہوتی ہے کہ آپ خاموشی سے ان کی تہوں میں اُتر جائیں۔ انہیں معلوم بھی نہ ہو اور آپ ان کے اندر کی دنیا میں داخل ہو کر سب کچھ اپنی فکر اور احساسات کی پوٹلی میں باندھ لیں اور پھر اپنے جمالیاتی حسن اور فنکارانہ صلاحیتوں سے پلاٹ تیار کر کے ان کرداروں کو قرطاس پر اُتار لیں۔ اب اپنے ہاتھ میں ہوتا ہے کہ آپ کتنے گل بوٹے سجا پاتے ہیں۔ اسی نکتے پر آ کر ایک تخلیق کار کی اپنی بساط کیا ہے اس کی جانچ بھی ہو جاتی ہے۔ کہانی لکھتے وقت سب سے اہم بات یہ ہوتی ہے کہ جو آپ نہیں لکھ رہے ہیں، اُن نادیدہ تحریروں کو بھی قاری بہ خوبی سمجھ لے کیوں کہ کہانی کا یہی حصہ اہمیت کا حامل ہوتا ہے۔

☆ آپ کے ہاں بیانیہ اور علامت ساتھ ساتھ نظر آتے ہیں۔ اصل میں آپ کا مزاج اور میلان ہے کیا؟

☆☆ یہ میری ذاتی رائے ہے کہ کہ تخلیق کار کو کسی خاص تحریک سے جڑ کر نہیں لکھنا چاہئے۔ فکشن رائٹنگ کی یہ خوبی ہوتی ہے کہ وہ اپنا راستہ آپ بناتی ہوئی آگے بڑھتی ہے۔ کردار ہے تو مکالمہ بھی ضرور ہوگا، مکالمہ ہے تو نریشن بھی

آئے گا۔ نریشن میں سب کچھ کھل کر بیان نہیں کیا جاتا۔ اسی مقام پر آ کر قلم کار مصوّر بن جاتا ہے۔ مصوّر برش کے ذریعہ ایک اسٹروک میں اپنی بات کہتا ہے اور تخلیق کار ایک علامت کے بل پر پوری داستان بیان کر دیتا ہے۔ بیانیہ، فکشن رائٹنگ کے لئے بہت خوب ہے مگر علامت خوب سے خوب تر ہے، بہ شرطہ کہ وہ قاری کے لئے اسپیڈ بریکر نہ بنے۔

☆ ذرا اس خیال کو سمجھنے میں ہماری رہنمائی کیجیے کہ ''شائستہ کی کہانیاں حقانیت کے داخلی ارواح سے مصافحہ کراتی ہیں؟''

☆☆ بھئی گلزار صاحب! ہم تو زیست کی جلتی سڑک پر ننگے پاؤں چلنے والے قلم کار ہیں۔ دل خوش ہوا تو شاعری کر کے جی کو بہلا لیا۔ دل پر دباؤ بڑھا تو کہانی میں اپنے کرداروں کے ساتھ دکھ درد بانٹ لیا۔ اتنی حقانی باتیں تو میری سمجھ سے بالاتر ہیں۔

☆ یہ جملہ بھی توجہ کا طالب ہے ''عدم توازن ہی کامیابی کی ضمانت ہے؟''

☆☆ بیشک! عدم توازن ہی کامیابی کی ضمانت ہے۔ اگر اس جملے میں صداقت نہ ہوتی تو شائد نہ ہم یہاں کھڑے ہوتے اور نہ آپ مجھ سے سوال کر رہے ہوتے۔ عدم توازن کے بغیر انسان تارِ عنکبوت کی طرح ہوتا ہے جو آندھی کی زد میں آ کر پھٹ جاتا ہے اور پھر ریزہ ریزہ ہو کر اپنے وجود کو خطرے میں ڈال دیتا ہے۔

☆ یہ کہانیوں کی سیڑھی اور چوپال کا چبوترہ بننے والی بات کا مفہوم بھی وضاحت طلب ہے؟

☆☆ اگر ہم یہ کہیں کہ چوپال کے چبوترے سے کہانی نے فروغ حاصل کیا ہے تو شائد غلط نہ ہوگا۔ پنگھٹ اور چوپال کا تصوّر شاعری میں خوب خوب آیا ہے مگر اس کی سچائی فکشن رائٹنگ میں دیکھنے کو ملتی ہے۔ جہاں تک سیڑھی کی بات ہے تو جب کوئی شئے یا صنف فروغ حاصل کرتی ہے تو زینہ بہ زینہ اوپر چڑھتی ہے مگر اس کی حقیقت زمینی سچائی سے جڑی رہتی ہے۔ اسی لئے آج اچھی کہانیاں وہی مانی جا رہی ہیں جس کی جڑیں اپنی زمین سے وابستہ ہوں۔

☆ ایک مسلم اور مذہبی گھرانے کی خاتون کے حوالے سے آپ کے موضوعات اور اُن کا برتاؤ بھی قاری کو چونکانے کا سبب بنتا ہے؟

☆☆ جس وقت قلم میرے ہاتھ میں ہوتا ہے، اس وقت میں صرف اور صرف ایک عورت ہوتی ہوں۔ ایسی عورت جو اپنے آپ کو چھپانا یا پوشیدہ رکھنا نہیں چاہتی بلکہ اپنا گریبان پھاڑ کر اپنے اندر کے سچ کو باہر لانا چاہتی ہے اور سامنے والے کا گریبان چاک کر کے اسے اس کا سچ دیکھانا چاہتی ہے۔ ایک تخلیق کار خاتون اگر مصلحت اور پابندیوں میں جکڑ کر قلم اُٹھاتی ہے تو میرا خیال ہے کہ وہ اپنی تخلیق کے ساتھ پورا انصاف نہیں کر سکتی۔

☆ کسی بھی خاتون کے لیے ہم جنسی جیسے قبیح فعل کو موضوع سخن بنانا اور اُس عمل سے کامیابی کے ساتھ گذر جانا بہت سے سوالوں کو دعوت نہیں دیتا؟

☆☆ یہ رویہ کیا صرف خاتون کے لئے ہے؟ مرد کہیں تو سچ! عورت بولے تو بے غیرت!۔ پتھر مارنا ہے تو مارو! شیشے کا گھر تمہارا ہے ہمارا نہیں۔ ایک دن اسی پتھر سے اپنا سر پھوڑنا اور رقیہ سخاوت حسین کے خواب کو سچ کر دکھانا۔

☆ رقیہ سخاوت حسین سے آپ کی ذہنی قربت کن معنوں میں لی جانا چاہیے؟

☆☆ رقیہ سخاوت حسین کے اسم کو میں صرف ایک قلم کار کے نام سے ہی نہیں جوڑتی بلکہ عورت کے تئیں ایک کھلی سوچ رکھنے والی اس تحریک کو بھی ان سے جوڑتی ہوں جس نے عورت کی کھلی پتھرائی آنکھوں میں خوابوں کا کاجل لگایا۔ ایک سپنا دکھا کر یہ سمجھایا کہ جینے کا حق ہم عورتوں کو بھی ہے۔

☆ آپ کے بے شمار کرداروں میں ان گنت سوالات تڑپتے، مچلتے نظر آتے ہیں۔ کبھی اُن سوالوں کے جواب دینے کو جی نہیں چاہا؟

☆☆ کہانی کے کرداروں کے ذریعہ سوال اُٹھانا اور پھر اسے دور تک لے جانے میں کسی تخلیق کار کا اہم رول ہوتا ہے۔ یہ کسی ایک قلم کار کا کام نہیں ہوتا بلکہ اس میں لوگوں کی سلسلہ وار کڑیاں جڑتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ بیسویں صدی کے آغاز میں تانیث کی جو آواز اُٹھی وہ تحریک بن کر دور تک چلی۔، جس کا مثبت اور نفی دونوں پہلو عالمی سطح پر صاف نظر آتا ہے۔

میری کہانیوں میں جو سولات اُٹھائے گئے ہیں، اُن کے جواب یا ان مسائل کے خاتمے کے راستے فوراً نظر نہیں آئینگے مگر آہستہ آہستہ ایک ذہن سے دوسرے ذہن میں منتقل ہوتے ہوئے آنے والے وقت میں یہ اپنے جواب خود تلاش لیں گے۔

☆ آپ کی کہانیوں کے بہت سے کردار ''Post Traumatic Stress Disorder'' کیوں نظر آتے ہیں؟

☆☆ میں سچ کو ملمّع بازی سے ڈھکنا نہیں جانتی۔ 'دوٹوک ہو کر قلم اُٹھانا' میرا اپنے آپ سے کیا ایک وعدہ ہے۔ جب میں اپنے کرداروں کی گہرائی میں اُترتی ہوں تو ان کا نفسیاتی جائزہ لینے کے بعد جو نتیجہ میرے سامنے آتا ہے اسے میں کرداروں پر اُتار دیتی ہوں۔ آپ اس بات سے انکار نہیں کر سکتے کہ اکیسویں صدی کے مسائل اور طرزِ زندگی کا جو stress ہے وہ ہمیں نہ صرف بیماریوں کے غار میں دھکیل رہا ہے بلکہ post Traumatic Stress Disorder کی طرف بھی لے جا رہا ہے۔ اس لئے میرے کچھ کردار آپ کو اس صف میں کھڑے نظر آتے ہیں۔ نہ کہانی جھوٹی ہوتی ہے، نہ کردار۔ بس لوگوں کے برتنے کا طریقہ الگ الگ ہوتا ہے۔ میرا طریقہ صاف گوئی کا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ایسے کردار میری کہانیوں میں کھل کر سامنے آئے ہیں۔

☆ کبھی آپ نے اس امر پر غور کیا ہے کہ آپ کے موضوعات اور اُن کا برتاؤ آپ کو Feminist تحریک کا مبلغ بنا رہی ہے؟

☆☆ میں اس سلسلہ میں کچھ نہیں کہنا چاہتی۔

☆ آپ کی کہانی ''سندھی بیلا'' کو ضرورت سے زیادہ شہرت ملنے کے اسباب کیا ہیں؟

☆☆ یہ سچ ہے کہ ۱۹۸۰ میں 'سندھی بیلا' نے ہندی کہانی کاروں کے درمیان مجھے کافی شہرت دلائی بلکہ اسی مجموعہ سے اردو ادب کے لوگوں نے بھی یہ تسلیم کرلیا کہ میں ایک ہندی رائٹر ہوں۔ میرا مستقبل ہندی ادب میں ہی پروان چڑھے گا۔ مگر میرے لئے وہاں ٹکے رہنا ممکن نہیں تھا۔ کیوں کہ مادری زبان کی کشش مجھے کھینچ رہی تھی۔ اردو ادب کی چاشنی مجھے اپنے سے دور نہیں جانے دے رہی تھی۔ جہاں تک 'سندھی بیلا' کی شہرت کی بات ہے، میں نے اس کے موضوعات مسلم معاشرے سے لیے اور ٹیکنک ہندی ادب سے کھینچی پھر جو کہانیاں سامنے آئیں وہ اس وقت کے تمام ہم عصر کہانیاں لکھنے والوں میں ایک الگ پہچان دے گئیں۔

☆ جو لوگ آپ کی کہانیوں کو حقیقت پر مبنی کہانیاں گردانتے ہیں اُن کے لیے آپ کے پاس کیا جواب ہے؟

☆☆ کہانیاں ہوں یا ناول نہ وہ پوری طرح سے سچ ہوتی ہیں اور نہ جھوٹ۔ آدھا سچ اور آدھے جھوٹ سے فکشن رائٹنگ فروغ کی سیڑھیاں طے کرتی ہے۔ یہ بات صرف مجھ پر ہی نہیں، ہر اس کہانی کار اور ناول نگار پر اُترتی ہے جو اپنے تخلیقی عمل میں سنجیدہ ہے۔ ہماری کہانی کے کردار اور پلاٹ حقیقت پر مبنی ہوتے ہیں، اس میں دو رائے نہیں مگر اس کا وسیع کینوس تیار ہوتا ہے، ہمارے اپنے تخیل، فکری معیار اور اندازِ بیان سے۔ اس میں اظہار کی بے ساختگی کا بھی کافی دخل رہتا ہے۔

☆ ''صدائے عندلیب بر شاخ لب'' کے لیے گندی بستیوں میں گزارے ڈیڑھ سال کا احوال اور دیگر تخلیقات کے لیے کی گئی جستجو کی نقاب کشائی بھی ضروری ہے؟

☆☆ بے شک اس ناول نے اپنے اختتام تک پہنچتے پہنچتے میرے ذہن کو ریگستان بنا دیا تھا۔ اس ناول کے پلاٹ کو اپنے اندر تحلیل کرنے کے لئے میں الگ الگ بستیوں میں جاتی تھی۔ یہ بستیاں کبھی ریلوے کراسنگ کی ہوتیں، کبھی اسٹیشن کے آس پاس کی۔ کبھی پل کے نیچے بنی ہوئی جھگی جھوپڑی میں پہنچ جاتی اور کبھی ان آدھی تعمیر ہوئی بڑی عمارتوں کے اِردگرد چکر کاٹتی، جہاں سالوں کام چلتا رہتا ہے اور یہ طبقہ بنجاروں کی طرح اپنا ڈیرا ڈالے رہتا ہے۔ اکثر اُن غریب بستیوں میں بھی جاتی تھی جو بنگلوں کے پچھلے حصے میں نوکر چاکروں نے آباد کی ہوئی ہوتی ہیں۔ جانے سے پہلے اچھی طرح سے میں اپنے منھ پر ڈھاٹا لپیٹ لیتی تھی۔ تاکہ میری شناخت ظاہر نہ ہو۔

جاڑے کی، خاص طور سے ماگھ اور پوس کی راتیں ان کے لئے کسی قیامت سے کم نہیں ہوتیں۔ مسلسل بارش بھی ان کے لئے عذاب ہوتی ہے۔ ایسے میں انہیں کوئی گرم کپڑے یا پرانا کمبل دے جائے یا بارش سے بچنے کے لئے موٹی پلاسٹک کی شیٹ پہنچا دے تو وہ ان کے لئے بھگوان بن جاتا ہے۔ میں بھی ان کے لئے بھگوان کی اوتار تھی۔ کہانیوں میں اتنی محنت نہیں کرنی پڑتی کیونکہ اس کے کردار آس پاس موجود رہتے ہیں اور عام طور پر ہم میں سے ایک ہوتے ہیں۔ کہانی کا کینوس بھی بہت وسیع نہیں ہوتا۔

☆ ایک اہم سوال آپ کی ازدواجی زندگی سے متعلق بھی آپ کی اجازت کے ساتھ کرنا ضروری ہے؟

☆☆ گلزار صاحب! زندگی کے سو کے سو فیصد رنگ کسی کا مقدر نہیں بنتے۔ اگر ایک رنگ نہیں ہے تو ۹۹ تو ہیں۔ میں شکر گزار ہوں اللہ پاک کی، اس نے مجھے بہت کچھ دیا ہے۔ ایک رنگ حاصل نہ ہونے کا نہ کوئی گلا ہے، نہ شکوہ، نہ کوئی ملال۔

☆ یہ رائے کہاں تک درست ہے کہ ''صدائے عندلیب بر شاخ لب'' ازدواجی زندگی کی ناکامی کا شاخسانہ ہے؟

☆☆ یہ ناول اعلیٰ طبقے اور بالکل نچلے طبقے کی عورتوں کے مسائل پر مبنی ہے۔ ''صدائے عندلیب بر شاخ شب ازدواجی زندگی کی ناکامی کا شاخسانہ ہے۔'' یہ رائے میں تسلیم نہیں کرتی کیوں کہ اگر ایسا ہوتا تو رحمت علی اور ڈاکٹر رحمان جیسے کردار سامنے نہ آتے۔ ہاں یہ سچ ہے کہ صدائے عندلیب مردوں سے الگ عورتوں کے حوصلوں کی اُڑان کی داستان ہے۔

☆ شاعری کے اسرار و رموز جاننے کے لیے بحر و اوزان سے واقفیت لازمی تصور کی جاتی ہے آپ کے ہاں اس حوالے سے صورت حال کیا ہے؟

☆☆ شروع سے ہی مجھے پابندیوں میں لکھنا پسند نہیں رہا کیوں کہ جہاں پابندیاں ہوتی ہیں وہاں عام طور سے اظہار کی بے ساختگی ختم ہو جاتی ہے۔ جو باتیں میں نظموں میں کھل کر کہہ لیتی ہوں، مجھے نہیں لگتا کہ میں انہیں غزل کی پابندیوں میں باندھ کر اتنی شدّت سے کہہ پاؤں گی۔

☆ غزل سے آپ کی دوری دانستہ ہے یا غیر دانستہ دونوں صورتوں میں معقول جواز کا ہونا بھی لازمی ہے؟

☆☆ غزل سے میری دوری دانستہ ہے۔ کیوں کی شاعری کے بحر و اوزان سے میری واقفیت بہت کم ہے۔ ایک بار سیکھنے کی کوشش کی۔ ایک شاعر صاحب کی نگرانی میں دو غزلیں تیا ہوئیں۔ مگر ان کے جاتے ہی میں نے غزل کا بستہ بند کر کے رکھ دیا۔ پھر کوشش نہیں کی۔

☆ ایک طرف آپ کی شاعری کو ہمہ جہت اور پُر تاثیر گردانا جاتا ہے دوسری طرف سادگی اور معصومیت کی سند بھی عطا کی جاتی ہے؟

☆☆ اس سلسلہ میں آپ کو کیا جواب دوں۔ میں تو اپنے خیال کو نظموں میں ڈھال دیتی ہوں۔ نہ اس میں کوئی بناوٹ ہوتی ہے نہ تصنع، سیدھی سادی ڈگر کی سیدھی سادی بات۔ اچھی لگے تو اچھا ہے، بری لگے تو بھول جاؤ۔

☆ آپ کے افسانے عصری معاملات سے جڑا ہونے کے سبب بلاغت کا ثبوت پیش کرتے ہیں مگر آپ کی شاعری پرعشق ومحبت کا رنگ غالب نظر آتا ہے؟

☆☆ میں بنیادی طور پرخود کو ایک افسانہ نگار اور ناول نگار کی حیثیت سے ہی دیکھتی ہوں۔فکشن رائٹنگ کا سفر بے حد تکالیف بھرا ہوتا ہے۔طرح طرح کے کردار اپنا دکھ درد ہم پر پھینک دیتے ہیں اور ہم انہیں اپنا بنا کر تب تک ان کے ساتھ جیتے رہتے ہیں جب تک وہ پوری طریقے سے پک کر قرطاس پر نہ اُتر آئیں۔یہ سفر تھکا دینے والا ہوتا ہے مگر شاعری کا معاملہ اس کے برعکس ہے۔وہ ذہن کو تازگی اور شگفتگی دیتی ہے۔جب فضا خوش گوار ہو،ذہن ہلکا پھلکا ہو تو حسّیات جمالیات کی طرف مڑ جاتی ہے کیوں کہ تخلیق کار بنیادی طور پر حسن پرست ہوتا ہے۔اس کے خمیر میں رومانیت کا عنصر زیادہ ہوتا ہے۔میں بھی اس سے جُدا نہیں ہوں۔

☆ آپ کے خیال میں ایک تخلیق کار بالخصوص صنف نازک کی جانب معاشرے کی طرف سے کس طرح کی ذمہ داریاں عائد ہوتی ہیں؟

☆☆ صنف نازک کے تئیں معاشرہ اپنی تنگ نظری چھوڑ دے،سارے فساد خود بہ خود حل ہوتے چلے جائیں گے۔

☆ اگر اس نشست میں ہم آپ سے یہ دریافت کرنا چاہیں کہ آپ نے اپنی تخلیقات میں صنف نازک کے جذبات واحساسات کو درست انداز اور تناسب سے برتا ہے تو ہمیں کس طرح کے جواب کا سامنا ہوسکتا ہے؟

☆☆ اس سلسلہ میں میں یہ کہنا چاہوں گی کہ ایک عورت کے لئے عورت کے مسائل کو سمجھنا بہت آسان ہوتا ہے۔عورت تخلیق کار ہے تو اپنی حسّیات سے وہ اپنے ساتھ دوسری عورتوں کے مسائل کو بھی پوری شدّت سے محسوس کرتی ہے۔ایسے میں تمام عورتوں کے دکھ درد،مسائل اور مصائب ایک پلیٹ فارم پر آ کر کھڑے ہو جاتے ہیں۔پھر تخلیق کار اپنے قلم کے ذریعہ انہیں قرطاس پر اُتارتا ہے۔قلم کی قوت جتنی زوردار ہوگی،اظہار بیا اتنا شاندار بنے گا۔

☆ اور وہ جو 1988 میں جناب آل احمد سُرور نے نئے لکھنے والوں سے زبان وادب کے رموز واسرار سمجھنے کی آرزو کی تھی اُس کی بابت آپ کے دل میں کس قدر اطمینان ہے؟

☆☆ ۱۹۸۸ سے لے کر ۲۰۱۵ تک کا ایک طویل وقت گزر رہا ہے،جس میں نئے لکھنے والوں نے چاہے وہ تنقید کے حوالے سے ہو یا تخلیق کے،بدلاؤ آیا ہے۔کل جو نئے تھے آج وہ سینئر ہو چکے ہیں،کل جس طرح کی تحریریں سامنے آ رہی تھیں،آج اس سے بالکل مختلف ہیں۔دور کے حساب سے قلم اور زبان وادب کے رموز واسرار کی تبدیلی یقیناً بہتر ہوئی ہے۔مگر یہ بھی سچ ہے کہ سو فیصد بات کہیں نہیں اُترتی۔ممکن ہے،آج ہمیں جو بہتر لگ رہا ہے،وقت کے ساتھ اس سے بالکل انکار کر دیا جائے۔پھر کوئی اور بات سامنے آئے اور اسے بھی نئے سرے سے جانچا پرکھا جائے۔

☆ اس خیال میں کس حد تک حقیقت ہے کہ آپ کسی خاص شخصیت یا تخلیق کار کو سامنے رکھ کر ایک خاص مقام یا شناخت حاصل کرنے کی خواہاں ہیں؟

☆☆ کچھ تو لوگ کہیں گے،لوگوں کا کام ہے کہنا۔ہم اپنا کام کرتے رہیں گے،انہیں اپنا کام کرنے دیجئے۔وقت کی چھلنی سے چھن کر ایک نہ ایک دن سچ سامنے آتا ہی ہے۔پھر کام اور کلام بولتے ہیں،زبانیں خاموش ہو جاتی ہیں۔

☆ ناقدین کے حوالے سے تخلیق کار اکثر شاکی رہا کرتے ہیں۔آپ کے ہاں اس حوالے سے صورت حال کیا ہے؟

☆☆ ناقدین کے حوالے سے اب تک کا میرا جو ذاتی تجربہ رہا ہے وہ کافی اطمینان بخش ہے۔

☆ چہارسو کے گذشتہ شمارے میں جناب مجتبیٰ حسین نے اردو کے قاری کی نسبت جس اندیشے اور قحط سالی کا ذکر کیا ہے اُس حوالے سے آپ ہمیں اپنے تجربات میں شریک کیجیے؟

☆☆ جناب مجتبیٰ حسین نے جس دلچسپ انداز میں اردو کے قاری کی نسبت جس اندیشے اور قحط سالی کا ذکر کیا ہے،وہ واقعی اردو زبان وادب کے لئے ایک اہم مسلہ ہے۔میرے بچے مجھ سے کہتے ہیں،لکھو..لکھو..خوب لکھو..تم کو پڑھنے والے دو چار بوڑھے بچے ہیں،انہیں کی خاطر لکھ لکھ کر جان دیتی رہو۔اب تک انگریزی میں اتنا کچھ لکھا ہوتا تو کم سے کم ہم لوگوں کی کچھ شناخت بن چکی ہوتی۔دوستوں کو بھی نہیں بتا سکتے کہ میری ماں کیا لکھتی ہے....حالات واقعی بے حد نازک ہو چکے ہیں۔

☆ ایک طبقہ اردو زبان کی زبوں حالی پر نوحہ کناں،دوسرا ہندی کے مستقبل سے مایوس دکھائی دیتا ہے۔ہر دو صورتوں میں مشرقی علوم وفنون کے مستقبل سے کس طرح کی امیدیں وابستہ کی جاسکتی ہے؟

☆☆ یہ سب بحث کے مدّے ہیں،جو وقت کے ساتھ چلتے رہیں گے،مٹتے رہیں گے اور نئے سرے سے پھر ایک سوال بن کر اُبھرتے رہیں گے۔اردو زبان ہو یا ہندی ہر جگہ حال کو لے کر آپ کو بے چینی نظر آئے گی۔یہ بے چینی کہیں نہ کہیں سے یہ اطمینان بھی دلاتی ہے کہ ابھی ہم زندہ ہیں۔ہمیں اپنی زبان کو اپنے ادب کو بچائے رکھنے کے لئے کچھ نیا کرتے رہنا ہے۔یہ نیا پن ہم کہیں باہر سے نہیں لاتے بلکہ اپنے ملک اور اپنے معاشرے میں چل رہی تبدیلی سے حاصل کرتے ہیں۔کوئی بھی زبان اور ادب تب تک مر نہیں سکتی جب تک اس کے پڑھنے اور سمجھنے والے زندہ ہیں۔امیدیں علامت ہوتی ہے حرارت اور حرکت کی۔یہی زندگی کی بھی علامت ہے۔سوال چاہے زبان وادب کا ہو یا مشرقی علم وفنون کا،مجھے کہیں اندھیرا نظر نہیں آتا۔

افسانہ

آفندی کا بیٹا

شائستہ فاخری

آمنہ بی عشاء کی نماز پڑھ کر جیسے چوکی سے اترنا ہی بھول گئی۔ فرض، سنت، نفل اور پھر نفلوں کا سلسلہ شروع کر دیا۔ جب تھک جاتی تو چوکی پر آلتی پالتی مار کر تسبیح پڑھنا شروع کر دیتی تھی۔ آج اسے کتنے برسوں بعد خدا نے خوشی عطا کی تھی، یہ خود اسے یاد نہیں رہا۔ دماغ پر زور دیتی ہے تو کچھ کچھ یاد پڑتا ہے کہ وہ شادی کا جوڑا پہن کر دلہن بن کر جب اس گھر کی دہلیز میں داخل ہوئی تھی تو اس کے لئے وہی دن اس کی زندگی کا سب سے بڑا خوشی کا دن تھا۔ اسے اپنے سارے کنوارے خواب سچ ہوتے لگ رہے تھے۔ سچ ہوئے بھی تھے مگر کس طرح۔۔۔ اس نے دماغ جھٹک دیا۔ آج وہ کوئی کڑوی بات یاد نہیں کرے گی۔ ہرگز نہیں۔۔۔ آج کی شب اسے اتنی بڑی خوشیوں کی سوغات دے گئی تھی کہ وہ ماضی میں اترنا ہی نہیں چاہتی تھی۔ اس نے جھٹ چار رکعت نفل نماز کی نیت باندھ لی اور لَو خدا سے لگا لی۔ سلام پھیرا، مسکراتا چہرہ بیٹے کی جانب آ کر ٹھہر سا گیا۔ آنکھوں میں شفقت اور محبت لئے وہ لگاتار امنے بیٹے کو نہارے جا رہی تھی جو دن بھر کی محنت مشقت کے بعد تھک کر سویا ہوا تھا۔ سُتلی کی بنی ہوئی کھردری چارپائی پر بے سدھ پڑا اس کا سویا جسم۔۔۔

آمنہ بی کا دل چاہ رہا تھا کہ وہ نماز کی چوکی چھوڑ کر بیٹے کے قریب جائے اور اسے سر سے پیر تک اور پھر پیر سے لے کر سر تک بوسے دے ڈالے۔ جیسے وہ کبھی اسے بچپن میں دیا کرتی تھی۔ مگر اب اسے اچھا نہیں لگا۔ بیٹا ہے تو کیا ہوا جوان تو ہے۔ اس نے اس کے اوپر سے نظریں ہٹا لیں۔ چارپائی کے پاس ہی رنگوں سے خالی بالٹی اور برش رکھا تھا۔ ماں بیٹے کی زندگی کا سہارا بالٹی اور برش۔۔۔ چودہ سال کی عمر ہوتے ہی آمنہ بی نے اپنے بیٹے کو محلوں کے ان مزدوروں کے ساتھ لگا دیا جو گھروں کی پتائی کرتے تھے۔ مگر بیٹے کا دل ان لوگوں کے ساتھ نہیں لگا۔ رات کے اندھیرے میں چھت تاکتے ہوئے وہ کیا سوچتا رہتا تھا یہ آمنہ بی کو کبھی سمجھ میں نہیں آیا۔ بہلا پھسلا کر پوچھتی تھی تو وہ مختصر سا جواب دیتا کہ اسے ابا کی یاد آ رہی ہے۔ ہاں اکثر راتوں میں جب کبھی دروازے پر اجنبی ہاتھ دستک دیتے اور لوگ اس کا نام لے کر پکارتے تو ضرور آمنہ بی کا کلیجہ منھ کو آ جاتا۔ یہ سلسلہ بڑھنے لگا اکثر راتوں میں آفندی کا بیٹا اسے بستر سے غائب ملتا۔ کبھی کبھی وہ بچوں کی طرح سبک سبک کر رونے لگتا۔ ماں پوچھتی تو ہر سوال کا ایک ہی جواب ہوتا کہ ابا کی یاد آ رہی ہے۔ ابا کا کیا قصور تھا؟ ابا کبھی بھی جیپ سے کود کر بھاگ نہیں سکتے ہیں۔ پھر ابا کی پیٹھ پر گولی کیسے لگی۔۔۔ اس سے آگے اس کی آواز گلے میں رندھ جاتی۔ آمنہ بی اندر اندر ہی گھٹ کر رہ جاتی۔ ان کے بیٹے کا نام یوں تو سلطان تھا مگر محلّہ ٹولہ اور سبھی جاننے والے اسے آفندی کا بیٹا کہتے تھے۔ سلطان نام تو بس بچپن میں شاید آفندی نے ہی پکارا ہو۔ آمنہ بی کو بھی سلطان کو آفندی کا بیٹا کہنا اچھا لگتا تھا کہ اسی بہانے اپنے مظلوم پیارے شوہر کا نام اس کی زبان پر دن بھر میں کئی بار آ جاتا تھا۔

ایک دن آفندی کے بیٹے نے اسے آ کر بتایا کہ اب وہ محلے کے مزدوروں کے ساتھ گھر گھر جا کر پتائی نہیں کرے گا۔

''پھر کیا کرے گا؟ میں نے تجھے تو پڑھایا بھی نہیں۔۔''

آمنہ بی کی روح کانپ اٹھی۔ یہ ملک اس کا اپنا تھا۔ یہیں وہ پیدا ہوئی اور یہیں اس کی شادی بھی ہوئی۔ مگر آفندی اس کے ملک کا نہیں بلکہ افغانی تھا۔ وہ بتاتا تھا کہ اس کے دادا اپنے دوستوں کے بہکاوے میں آ کر افغانستان جیسا پر امن، پرسکوں ملک چھوڑ کر اس ملک میں آ بسا اور پھر یہیں کا ہو کر رہ گیا۔ پھل پھول میووں سے بھرا ملک جو اپنی مہمان نوازی کے لئے جانا جاتا تھا پرایا ہو گیا اور غیر ملک اپنا۔۔ آمنہ بی کے آتے ہی گھر کی پوری فضا ہی بدل گئی۔ رہن سہن کھان پان سب کچھ۔۔۔ آمنہ بی خود کو دونوں ملک کی سرحد پر کھڑا پاتی کیونکہ لوگ اسے افغانی دلہن کے نام سے آوازیں دیتے۔

اچانک بیٹے نے کروٹ بدلی۔ تسبیح پر تیزی سے چلتی انگلیاں لمحے بھر کے لئے ٹھہر سی گئیں۔ کہیں آفندی کا بیٹا پیاسا نہ ہو مگر اگلے ہی لمحے وہ گہری نیند سو چکا تھا۔۔ آمنہ بی مطمئن ہو گئی۔ چہرے پر شفقت، ہونٹوں پر مسکراہٹ اور آنکھوں میں محبت لئے وہ بیٹے کو ایک ٹک نہارتی رہی۔ کتنے مہینوں یا پھر یوں کہیں کہ سالوں کے بعد آفندی کے بیٹے نے حامی بھر لی۔ وہ شادی کے لئے تیار ہو گیا تھا۔ آمنہ بی کے گھر میں بھی خوشیاں اتریں گی، بہو آئے گی۔ چوڑیوں کی کھنک اور پازیب کی رُن جھُن کی آواز اس گھر میں بھی زندگی پیدا کرے گی۔ یہ باتیں سوچ سوچ کر آمنہ بی کی روح سرشار ہوئی جا رہی تھی۔

ٹین کے صندوق میں ابھی بھی مانگ ٹیکہ اور دو کنگن کے ساتھ اس کا نکاحی جوڑا صحیح سلامت بچا ہوا تھا۔ مشکل سے تین بار ہی تو پہن سکی تھی وہ۔ ایک اپنی شادی میں ایک اس موقع پر جب آفندی کا بیٹا پیدا ہوا تھا اور آفندی نے خوشی میں ایک چھوٹا سا جشن گھر پر رکھا تھا۔ تیسری بار اس وقت جب ایک شب اس کے کچھ افغانی دوست اس سے ملنے آئے تھے۔ ادھار مانگ کر ان کی خوب خاطر داری کی گئی تھی۔ دوستوں نے رخصت ہونے سے پہلے بھابھی یعنی آمنہ بی کو منھ دکھائی دینی چاہی۔ آفندی بھاگ کر اندر گیا اور دروازے کی اوٹ میں چھپ کر باتیں سنتی آمنہ بی کا ہاتھ پکڑ کر کھینچ کر صندوق کے پاس لایا۔ سرخ جوڑا پہنانے میں اس نے اپنی بیوی کی مدد کی۔ مانگ ٹیکہ لگایا، کنگن پہنایا اور سر پر آنچل ڈال دیا اس نے خاص تاکید کی۔ ''دیکھو شرم و حیا پردے میں اچھی لگتی ہے۔ خبردار! منھ

دکھائی کا مطلب یہ ہرگز نہیں ہے کہ آفندی کی بیوی کا چہرہ کھلا ہو۔''

اس نے بے حد پیار سے دوپٹہ ماتھے سے کھینچ کر نیچے کر دیا مگر گوری رنگت اور چمکتا حسن دوپٹے سے بھی جھانک رہا تھا۔اس رات کا ایک ایک لمحہ گلابی ہو کر گزرا کیونکہ آفندی بے حد خوش تھا اس کے دوستوں نے کئی قیمتی تحفے دیے تھے۔آمنہ بی کے سلیقے اور حسن کی تعریف کی تھی۔آمنہ بی آفندی کی بیوی ہے تو آفندی کا حق بنتا ہے کہ وہ جیسے چاہے اپنی بیوی کو پیار کرے۔چاہے پلکیں چومے یا پیر کے ناخنوں کو بوسہ دے۔یا پھر گدگدا کر اسے ہنسا ہنسا کر بے حال کر دے۔آمنہ بی کی جھوٹی ناراضگی پر بھی دلیلیں دے کر اسے بہلا لیتا تھا۔

رات بھر کی جگائی اور چھیڑ چھاڑ کے بعد دونوں تھک کر ایک دوسرے میں الجھے گہری نیند سو رہے تھے کہ دروازے پر زور سے دستک ہوئی۔دستک کا شور بڑھنے لگا اور پھر لگاتار بڑھتا چلا گیا۔جب تک آفندی کی نیند ٹوٹے اور وہ اٹھ کر دروازے کی کنڈی کھولے تب تک لکڑی کا دیمک زدہ بوسیدہ دروازہ زمین پر آ گرا۔ سامنے سرکاری وردی میں لوگ کھڑے تھے۔ ایک۔۔ دو۔۔تین۔۔چار۔۔۔آمنہ بی نے جھانک کر دیکھا پولیس کی دو جیپ ان کے گھر کے سامنے کھڑی تھیں۔چیتے کی سی پھرتی سے ان سپاہیوں نے آفندی کو جیپ میں لادا اور روانہ ہو گیا۔آمنہ بی چیختی چلاتی جیپ کے پیچھے کچھ دور تک دوڑی مگر آفندی نے آواز دے کر اسے وہیں روک دیا۔'' پردے میں جاؤ''۔

آفندی کی پوری آواز پوری فضا میں گونج اٹھی۔وہ بھاگ کر اندر آئی، پانچ سال کے بچے کو جھنجھوڑ کر جگا دیا۔''اٹھ، جلدی اٹھ! تیرے باپ کو داروغہ اٹھا لے گیا ہے۔تو آفندی کا بیٹا ہے، تو نہیں جائے گا تو کون جائے گا؟''

آمنہ بی نے آنکھ ملتے بچے کو ٹوٹے دروازے کے باہر دھکیل کر خود بوسیدہ دیوار کی آڑ میں بیٹھ گئی اور آہ و زاری کرنے لگی۔کوئی مدد کو نہ آیا۔غریب بستی کے چھوٹے چھوٹے گھروں میں دبکے لوگ آمنہ بی کے پاس آ کر تسلّی دینے کی بھی ہمت نہ جٹا سکے۔

تین دن گزر گئے۔آمنہ بی آفندی کے بیٹے کو سینے سے لگائے روتی رہی سکتی رہی۔مدد کے لئے اللہ پاک کو پکارتی رہی۔

تیسرے دن کی شام کی دعا قبول ہوئی۔آفندی گھر لوٹ آیا مگر برے حال میں۔خوش باش، زندہ دل آفندی بجھ گیا۔بڑھی داڑھی، بکھرے بال، میلے گندے کپڑے، آنکھوں میں ویرانی اور ہونٹوں پر خاموشی کی مہر۔نہ روتی بلکتی بیوی کو دیکھ کر کوئی ہمدردی جاگی نہ سینے سے لپٹ کر سسکتے معصوم بچے کو اس نے چپ کرایا۔بس خلا میں دیکھتا رہتا، اپنے آپ میں کھویا رہتا۔آمنہ بی نے غور کیا کہ وہ اب پہلے والا آفندی نہیں رہا۔وہ نہاتا نہ وقت سے کھاتا پیتا۔نہ بیوی بچوں سے کوئی تعلق رکھتا۔بس اپنے میں ہی کھویا کچھ سوچتا رہتا۔آمنہ بی کو اس کی دماغی حالت پر شک ہوا۔اور یہ شک اس دن اپنے یقین میں بدل گیا جب ایک بھری دوپہر آفندی نے آمنہ بی سے چراغ مانگا۔

''چراغ! چراغ کیا کرو گے؟''اس نے حیرانی سے پوچھا

''مجھے روشنی چاہئے۔'' آفندی نے اسی طرح بجھی سی آواز میں جواب دیا۔

''روشنی! دیوانے ہوئے ہو؟ چمکتا ہوا سورج آسمان پر ہے اور تم روشنی چاہتے ہو۔''

''میں کہتا ہوں چراغ دو۔'' آفندی غصّے سے چیخ اٹھا۔

آمنہ نے گھبرا کر چراغ جلایا اور آفندی کو پکڑا دیا۔آفندی وہ چراغ لے کر گھر سے باہر نکل گیا۔

'یا خدا! میرے شوہر کی دماغی حالت ٹھیک کر دے، کہیں لوگ اسے دیوانہ، پاگل نہ سمجھ لیں' آمنہ بی نے دل ہی دل میں دعا کی۔

جب تک دھول بھری سڑک پر آفندی نظر آتا رہا، آمنہ بی اسے دیکھتی رہی۔وہ جلتے ہوئے چراغ کو ہتھیلی پر رکھے آہستہ قدموں سے آگے بڑھ رہا تھا اور ہوا سے بجھ نہ سکے اس لئے تھرتھراتی لو کو اپنی دوسری ہتھیلی سے آڑ کئے ہوئے تھا۔لوگ ہنس رہے تھے، مذاق اڑا رہے تھے، پوچھ رہے تھے۔''آفندی بھائی! سورج کی روشنی میں چراغ لے کر کیوں چل رہے ہو۔''

''تاکہ لوگ دیکھ سکیں۔'' آفندی نے برجستہ جواب دیا۔

'آفندی پاگل ہو گیا ہے۔'لوگوں نے کہنا شروع کر دیا۔یہ سلسلہ مہینوں چلتا رہا۔اس بیچ آمنہ بی نے بھی آفندی کو سمجھانا چاہا۔

''جب کڑی دھوپ نکلی ہو تو سڑکوں پر جلتا چراغ لے کر کیوں چلتے ہو؟''

''تم نہیں سمجھو گی آمنہ! لوگوں نے آنکھیں کھول کر دیکھنا بند کر دیا ہے۔۔سوچنا چھوڑ دیا ہے۔۔سمجھنا چھوڑ دیا ہے۔۔جاننا چھوڑ دیا ہے۔۔میں چاہتا ہوں کہ لوگ اس چراغ کی روشنی میں اپنے آپ کو پہچانیں۔۔۔

آمنہ بی بڑبڑاتی ہوئی دوسری طرف چلی گئی۔۔۔۔۔۔'لوگ سچ کہتے ہیں آفندی پاگل ہو گیا ہے۔'

بھور کا اندھیرا ابھی چھٹا نہیں تھا کہ ان گنت سرکاری بوٹوں کی آوازیں آفندی کے گھر میں گونج اٹھیں۔آمنہ بی نے اوٹ سے جھانک کر دیکھا۔کئی پولیس کی گاڑیاں دروازے پر کھڑی تھیں۔آفندی نے سب کے سامنے پولیس والوں کی موجودگی میں آمنہ بی کو زور سے اپنے سینے سے لگایا۔پیشانی پر بوسہ دیا اور پھر اپنے بیٹے کو پیار کر کے اس طرح پولیس والوں کے ساتھ چلا گیا جیسے اسے انھیں کا انتظار تھا۔

اگلی صبح آمنہ بی کے پاس خبر آئی۔آفندی چلتی جیپ سے کود کر بھاگنے لگا تھا۔پکڑنے کی کوشش کی گئی مگر پولیس جب ناکام ہونے لگی تو مجبوری میں پیر پر فائرنگ کی گئی۔افراتفری میں گولی پیٹھ پر لگی اور آفندی مارا گیا۔

آفندی جیسے لوگوں کی موت عام بات ہوتی ہے مگر آمنہ بی اچھی

طرح جانتی تھی کہ اس کے شوہر کو افغانی ہونے کی قیمت ادا کرنی پڑی۔ آفندی چلا گیا، بہت دور جہاں سے کوئی واپس نہیں لوٹتا۔ مگر آفندی کا بیٹا رہ گیا آمنہ بی کا دل بہلانے کیلئے۔ آمنہ بی کو پتہ ہی نہیں چلا کہ اس معصوم جان پر باپ کی موت کا کیا اثر ہوا اور آفندی کا بیٹا راستے کے کس موڑ پر آ کھڑا ہوا۔

آمنہ بی کے دروازے پر اتنے برس بیت جانے کے بعد خوشیوں نے دستک دی تھی۔ اس کا بیٹا شادی کے لئے رضامند ہو گیا تھا۔ سویرا ہوتے ہی وہ اپنے اس پرانے صندوق کو کھولے گی۔ نکاحی جوڑا نکال کر دھوپ دکھائے گی اور پھر رخشندہ بہن کو جا کر ہاں کہہ دے گی۔ اس کی سلیقہ مند بیٹی بچپن سے ہی اس کی نگاہ میں تھی۔

اس نے ایک بار پھر چارپائی پر لیٹے اپنے بیٹے پر نگاہ دوڑائی۔ جوان محنت کش بیٹا اسی طرح گہری نیند میں سویا ہوا تھا۔ کتنا ملتا جلتا ہے یہ اپنے باپ سے۔ فرق اتنا ہے کہ آفندی خوش مزاج تھا، مہمان نواز تھا، بے حد نیک اور خدا سے خوف رکھنے والا، بندہ نواز انسان۔۔۔ جبکہ اس کا بیٹا خود میں گم سم، کم گو، کم لوگوں سے ملنا جلنا، مگر آمنہ بی کو یہ باتیں بری نہیں لگتی تھیں کیونکہ اسی میں اسے اپنے بیٹے کی عافیت نظر آتی۔

فجر کی نماز پڑھ کر ابھی آمنہ بی کے پیر چوکی سے نیچے نہیں اترے تھے کہ ٹین کے دروازے پر دستک ہوئی۔ دستک تیز ہوئی، تیز سے تیز تر۔۔۔ آفندی کا بیٹا اچھل کر چارپائی سے نیچے کود پڑا۔ دروازے کھلنے سے پہلے ٹوٹ کر زمین پر آ گرا۔ اسلحوں سے لیس خاکی وردی سے آمنہ بی کا گھر بھر اٹھا۔ محلے میں اٹھتے شور کی آوازیں اندر آ رہی تھیں مگر آفندی کے گھر میں گہری خاموشی اور موت کا سناٹا تھا۔ آمنہ بی دونوں بازو پھیلائے بیٹے کے سامنے کھڑی تھی۔

''پہلی گولی مجھ پر چلاؤ، پھر میرے بیٹے کو قتل گاہ تک لے جاؤ۔''

پولیس انچارج کی آنکھوں میں نرمی تھی مگر وہ وردی سے مجبور تھا۔

''امّاں! آپ کا بیٹا کچھ دنوں میں واپس آ جائے گا۔''

جواب میں وہ بولی۔'' آمنہ بی کو اب واپسی کا کوئی انتظار نہیں۔۔۔تم اپنا فرض نبھاؤ۔ گولی چلاؤ مجھ پر۔۔۔ اور آفندی کی اس نشانی کا بھی خاتمہ کر دو۔''

انچارج نے سمجھانا چاہا۔''امّاں بی! ہم آفندی کی فائل دیکھ کر آئے ہیں۔ مجھے اپنی ڈیوٹی پوری کرنے دیجئے۔ میں آپ سے عزت اور احترام کے ساتھ کہتا ہوں۔ میرے کام میں رکاوٹ مت ڈالئے۔ خفیہ ایجنسی کی پختہ خبر کے ساتھ میں آپ کے بیٹے کو لینے آیا ہوں۔''

آفندی کے بیٹے نے بے حد نرمی سے اپنی ماں کے پھیلے بازو کو نیچے گرا دیا اور روتی ہوئی آمنہ بی کو اپنے سینے سے لگا لیا۔ اچانک بیٹے کی پھسپھساتی آواز نے آمنہ بی کو خاموش کر دیا۔ اس کے الفاظ لپکتے شعلوں کی طرح آمنہ بی کو دہکا گئے۔

''امّاں! میں امن کا طلبگار تھا اور تشدّد کی راہ پر نہیں چلنا چاہتا تھا۔۔۔ امن اپنی شرطوں پر۔۔۔ کوئی بھی قربانی دے کر۔۔۔''

آفندی کا بیٹا چلا گیا۔ آمنہ بی سوچتی رہ گئی۔ یا خدا! یہ کیسا امن ہے جو تشدّد کی راہ سے گزرتا ہے۔

جیپ اسٹارٹ ہوئی۔ گرد اڑاتی ہوئی گاڑی آفندی کے گھر سے دور ہوتی چلی گئی۔

ٹوٹی شاخ کی طرح جھکی ہوئی وہ اکیلی رہ گئی۔ کبھی شوہر کے لئے، کبھی بیٹے کے لئے۔۔۔ نماز کی چوکی، آہ و زاری۔۔ دعاؤں کے پیچ جھولتی عورت کے مجروح مقدر کے ساتھ آمنہ بی ایک بار پھر نماز کی چوکی پر کھڑی ہو گئی۔

- بقیہ -

ایک مختصر مکالمہ

افسانوں کی نمائندگی کرتا ہے اور یہ بتاتا ہے کہ تخلیق کار کسی زبان، کسی ادب، کسی تہذیب کا ہو مگر بنیادی طور پر وہ ہندستانی ہوتا ہے اور ہندستان کے جگر میں پلنے والے سارے مسائل اس کے اپنے مسائل ہوتے ہیں۔ جن کا اظہار وہ اپنی اعلیٰ فنی صلاحیتوں سے کرتا رہتا ہے۔ اسی طرح اردو کے ایک اہم فکشن نگار غضنفر نے بھی اس موضوع پر اپنا قلم اٹھایا اور وش منتھن جیسا ناول لکھ ڈالا۔ اختر آزاد، ام مبین، اشتیاق سعید نے بھی دلت موضوعات پر کہانیاں لکھی ہیں۔

مختصر یہ ہے کہ دلت تحریک نے آج کے ہندستانی ادب کو نہ صرف چھوا بلکہ اپنی اہمیت کا بھی احساس کرایا۔ تمام ہندستانی زبانوں کی طرح اردو ادب بھی اس سے اچھوتا نہ رہا۔

ہزاروں سال کے تاریخی پس منظر میں دلت تحریک کا یہ آئینہ ہمیں آنے والے عہد کی ایسی شکل دکھاتا ہے جہاں دلت کہلانا اپنے آپ میں ایک فخر کی بات ہوگی۔ یقیناً اکیسویں صدی میں آ کر اس بات کی شروعات ہو چکی ہے۔ ابھی لہجہ دھیما اور سر آہستہ ہے مگر آنے والے پچاس برسوں میں ہونے والی تبدیلیوں کی آہٹ ابھی سے محسوس ہونے لگی ہے۔ اور یقیناً ان کے اثرات دیگر زبانوں کے علاوہ اردو ادب پر بھی پڑیں گے۔

☆

شائستہ فاخری کے افسانے

پروفیسر گوپی چند نارنگ
(دہلی، بھارت)

شائستہ فاخری کا تعلق جس خانوادے سے ہے (میری مراد خانقاہ، دائرہ شاہ اجمل، الہ آباد سے ہے) وہ آج بھی مرجع ءخلائق ہے۔ادب، تہذیب اور تصوف جس کے ورثاء کی پہچان ہو، ظاہر ہے اس خاندان کی کسی خاتون تخلیق کار کا منظر عام پر آنا اردو ادب کے لئے نیک شگون ہے۔شائستہ فاخری ادھر چند برسوں میں جس تیزی کے ساتھ اردو افسانے کے منظر نامے پر رونما ہوئی ہیں۔ان کی اس تیز رفتاری کو دیکھتے ہوئے بلا جھجک کہا جا سکتا ہے کہ ادب وفن سے ان کا لگاؤ یقیناً گہرا اور پائیدار ہے۔ان کے جو افسانے میں نے پڑھے ہیں ان میں تہذیب کی شائستگی ان معنوں میں اپنے کمال عروج پر ہے کہ فن کا سرا ہاتھ سے ڈھیلا ہوتا نظر نہیں آتا۔ورثے میں ملا ہوا علمی و ادبی مذاق کے ساتھ فنی شعور ان کے مرتبے کو بلند کرتا ہے۔

شائستہ فاخری کے افسانوں کا پہلا مجموعہ 'ہرے زخم کی پہچان' کے نام سے شائع ہوا تھا۔اب ان کا دوسرا مجموعہ 'اداس لمحوں کی خودکلامی' زیر طبع ہے۔جس کا مسودہ میرے پیش نظر ہے۔

یہ دیکھ کر ایک مسرت زا حیرت ہوتی ہے کہ شائستہ فاخری فن افسانہ کی تمام جہات سے پوری طرح واقف ہیں۔ان کا ہر ایک افسانہ ایسی حیرتیں جگاتا ہے اور زندگی کے اسرار ورموز اور حالات وواقعات کا اتنا گہرا مشاہدہ لفظ لفظ اور سطر سطر سے منعکس کرتا ہے کہ قاری یہ سوچنے پر مجبور ہو جائے کہ جیسے افسانہ نگار خود ان وقوعات کی ناظر اور حصہ رہی ہیں۔

'سنو رقیہ باجی' ان کا ایک ایسا افسانہ ہے جو تحریک تانیثیت کی مسلم خاتون اول رقیہ سخاوت حسین کے نام منسوب ہے۔رقیہ سخاوت حسین نے اپنا افسانہ Sultana's dream ۱۹۰۵ء میں لکھا تھا، اب ایک سو پانچ برسوں کے بعد بھی کیا عورت کے مسائل، زندگی کی ناآسودگیاں وہی ہیں جو پہلے تھیں یا معاشرے میں اس کا مقام جوں کا توں ہے؟ کیا ترقی کی دوڑ میں شانہ بہ شانہ رہنے کے باوجود کیا پہلے کے مقابلے اب وہ زیادہ محفوظ ہے؟ شائستہ فاخری نے اس کرب ناک تناظر کو حقیقت کی آنکھ سے دیکھا اور اس کا تجزیہ نفسیاتی شعور سے کیا ہے۔اس افسانے میں کرداروں کی ذہنی کشمکش نے ایسی فضا تیار کی ہے کہ صورت واقعہ سے تحیر پیدا ہوتا ہے۔میڈم سارا کپجی کی زبانی کہے گئے جملے ایک عورت کا دوسری عورت کے ساتھ ناروا رویوں کی کھلی نشاندہی کرتے ہیں۔کیا یہ آج کا سچ نہیں ہے؟ ان جملوں کو آپ بھی ملاحظہ فرمائیں:

''اٹھ کمبخت۔کھانا کھا۔نخرے مت دکھا۔مر مرا گئی تو تیری لاش کو کہاں ٹھکانے لگائیں گے۔''

''کھانا کھاتی ہے یا پھر بلاؤں دو چار مردوں کو، منٹ بھر میں وہ سب کس بل نکال دیں گے۔''

''مر تو یہیں۔اس زمین پر گڈھا کھود کر دفن کر دوں گی تجھے۔کتیا کہیں کی، عورت کی ذات ہے یا شیطان کی اولاد۔دو دن سے مار کھا رہی ہے مگر ٹوٹی نہیں۔''

اس افسانہ میں اس مظلوم عورت کی زبانی کہے گئے یہ جملے دیکھیں جس پر بے جا طور پر سلطانہ کے خواب چرائے جانے کا الزام عاید کیا گیا ہے اور جو مجرم کی طرح لاک اپ میں بند کی گئی ہے۔

''کیا آپ کے یہاں کا انتظام یہی ہے کہ ایک عورت کو عورت کے ہی ہاتھوں بے رحمی کی شکار بنا دی جائے''۔

''دیکھئے میرا جسم دیکھئے، یہ سارے زخم یہ سارے نشانات ایک عورت نے ہی میرے جسم پر ابھارے ہیں۔کیا آپ انکار کر سکتے ہیں کہ یہ سب کچھ آپ کے اشارے پر نہیں ہوا۔جو ظلم اس عورت نے مجھ پر ڈھائے اس سے آپ کیا لاعلم ہیں۔آپ کے نظام کا یہ کون سا کھیل ہے جس میں کھلاڑی کوئی اور ہوتا ہے، مداری کوئی اور بنتا ہے اور شکار کس کے ہاتھوں مارا جاتا ہے۔یہ پتہ ہی نہیں چلتا۔''

اس افسانہ میں جو سب سے اہم سوال پیدا ہوتا ہے وہ یہ ہے کہ آخر سلطانہ کا خواب ہے کیا؟ اور یہی وہ سوال ہے جس کا جواب تو شائستہ فاخری نے جملوں سے تو نہیں دیا ہے لیکن افسانے کی پوری فضا میں پس منظر کے طور پر موجود ہے۔یہ افسانہ نگار کا کمال فن ہے۔اسی لئے میں کہتا ہوں کہ استعارے کے توسیعی تصرف اور علامت کے معنیاتی کردار کی سب سے بڑی پہچان یہی ہے کہ معنی محسوس تو کئے جا سکتے ہیں حرف آحرف بیان نہیں کئے جا سکتے۔

''کل جیل کی سلاخیں تھی آج گھر کی سلاخیں ہیں۔فرق اتنا ہے کہ جیل کی سلاخوں میں جسم تار تار ہوتا تھا اور گھر کی سلاخوں میں ذہن تار تار ہوتا ہے۔سلاخیں بدل جانے سے تقدیر نہیں بدلا کرتی۔''

اس افسانے کا آخری جملہ قاری کو جھنجھوڑ کر رکھ دیتا ہے۔

''رقیہ باجی! عورت کے وجود کی چیخ وکراہ، اس کی روح کے المیے، اس کے باطن کی ویرانی کو محسوس کرنے والا کون ہے؟ سو برس کے بعد بھی ہے کوئی؟''

جو پڑھنے والے علامتوں، ان کے استعاراتی رشتوں اور مرئی لفظوں کے غیر مرئی معنوی انسلاکات کے رمز سے واقف ہیں وہ شائستہ فاخری کے 'گنبد خوف میں روشن آنکھیں' 'حرف حرف حساب کا دن' اور 'صوفی آپا' جیسے

افسانوں کی داد دیئے بغیر نہیں رہ سکتے۔ان افسانوں کا زمینی حقائق اور روحانی اقدار سے اتنا گہرا رشتہ نظر آتا ہے کہ واقعات ارتقائی عمل سے گزرتے جاتے ہیں اور وحدت تاثر تشکیل پذیر ہوتی جاتی ہے۔زمان و مکان کی ساری پرتیں کردار، مکالمات اور واقعات کے تناظر میں کھلتی جاتی ہیں۔دراصل شائستہ فاخری کو صوفیانہ مزاج ان کے خانقاہی ماحول سے وابستگی کی دین ہے، یہی سبب ہے کہ ان افسانوں میں تصوف کا رنگ اپنے روایتی طرز احساس سے قدرے مختلف ہوتے ہوئے بھی اس لئے گہرا ہے کہ ان میں کئی معنوی جہتیں ایک نقطہ پر مرتکز ہوگئی ہیں جس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ افسانہ نگار نے اپنے روشن اظہاریئے کے ساتھ کہانی کو مرکزیت دینے کی شعوری کوشش بھی کی ہے۔ان افسانوں میں بیک وقت دو راستوں کا سفر صاف دکھائی پڑتا ہے۔ایک راستہ اس دنیا کا جہاں ہم زندگی جیتے ہیں اور دوسرا راستہ اس دنیا کا جو ہمیں زندگی کے رموز و نکات سے واقف تو کراتا ہے اور اعلیٰ انسانی اقدار کی حقیقتوں کا عرفان تو عطا کرتا ہے لیکن اس کا ماحصل روحانیت کے دروازے سے ہی جسم و روح میں واشگاف ہوتا ہے۔ جسم و روح کی زندگی کے نشیب و فراز سے نبرد آزمائی ایسی کشمکش کو جنم دیتی ہے جہاں روحانیت ہی پناہ گاہ بنتی ہے۔ یہ افسانے اس کی روشن مثالیں ہیں۔چند اقتباسات ملاحظہ فرمائیں:

’’جب بشر سوالات کے گھیرے میں ہو تو اسے نروان کا راستہ پکڑنا چاہیئے۔یہی سوچ کر وہ پہاڑی پر چڑھنے لگا۔نروان سے مہانروان کا سفر شروع ہو چکا تھا۔ پہاڑی پر پہنچ کر وہ مراقبے میں چلا گیا۔مہا گیان کی جھپکتی ہوئی آنکھیں پوری کھل گئیں۔انتر دھیان میں سچا گیان پرگٹ ہوا۔جو دکھائی دے رہا ہے وہ سچ نہیں ہے۔ جو سچ ہے وہ پوشیدہ ہے اور جو پوشیدہ ہے وہی دائمی ہے۔ بارہ مہینے جگ ظاہر ہے۔۔۔انسان کے جوڑے ہوئے، انگلیوں پر گنے ہوئے یہ بارہ مہینے۔۔انھیں بارہ مہینوں کی دھری پر وقت کا نظام چلتا ہے۔‘‘ (افسانہ: حرف حرف حساب کا دن)

’’تم کون ہو؟‘‘

’’میں تمھارے اندر کا خوف ہوں۔‘‘

’’خوف! مگر میں تو خوف زدہ نہیں ہوں۔۔‘‘ اس عورت نے جھوٹ کا سہارا لیا۔

’’تم نے مجھے اپنے جسم میں پال رکھا ہے۔تم اپنے اندر نئے نئے خوف پالتی جاتی ہو اور میں اس کے بوجھ سے اتنا دب جاتا ہوں کہ رات ہوتے ہی جب تم سو جاتی ہو تو میں پھڑ پھڑا کر باہر نکل آتا ہوں۔‘‘

’’تو تم ہو جو رات میں بولتے ہو؟‘‘

’’ہاں تم نے مجھے مجبور کیا کہ میں تمھارے جسم سے باہر آؤں اور بے معنی اور وہمی خوف کو تار تار کر دوں۔‘‘

’’تم میرے خوف کو کیسے تار تار کر سکتے ہو؟‘‘ عورت نے سوال کیا۔

’’خواہش اور بندگی تمھارے خوف کو تار تار کر سکتی ہے۔‘‘

’’خواہش اور بندگی! میں تمھاری بات سمجھی نہیں۔۔۔‘‘

اس مخلوق نے بات آگے بڑھائی:

’’میں نے تجھ سے محبتیں کیں، ایک کو خواہش کہا اور دوسری کو محبت ،محبت میں نے تیری بندگی کے لئے کی کہ تجھ سے بڑھ کر محبت کا اور کون اہل ہے تیری خواہش میرے جینے کا، میرے زندہ رہنے کا آسرا ہے جیسے لوگ جینے کے لئے شغل ڈھونڈتے ہیں اور میں نے تیرے آسرے میں جینے کا شغل اور زندہ رہنے کی خواہش بھلا دی اور اب مجھے کچھ بھی نظر نہیں آتا تیرے بغیر، جیسے روشنی کے بغیر بینائی اندھاپن ہے اب میں کیسے کہوں کہ میں تجھے دیکھتا ہوں اور کیسے کہوں کہ میں جس شے کو پکارتا ہوں وہ پکار میری ہے یا وہ شے میری آنکھوں کا اثر ہے۔‘‘(افسانہ: خوف گنبد میں روشن آنکھیں)

’’صوفی آپا کی بے پردگی نہ ہو، اس کا بھی پورا خیال رکھا جاتا۔ظہر کی نماز پڑھ کر جب وہ حجرے سے باہر آتیں تو احاطے کے ایک کنارے پر شامیانے کے نیچے لگے ہوئے اپنے تخت پر بیٹھ کر وہ ہر ایک فریادی کے دکھڑے سنتیں۔چند مشورے دیتیں اور پھر چہرے پر پھونک مار کر اسے رخصت کر دیتیں۔احاطے سے باہر جانے سے پہلے عزیزن بوا ان سے نذرانہ لینا نہ بھولتیں۔مردوں کے سامنے صوفی آپا نہیں آتی تھیں۔ایسے میں چادر تان کر ایک طرف وہ بیٹھتیں اور بچولیا کا کام عظمت میاں کرتے۔مردوں کو وہ صرف پھونکے ہوئے پانی کی بوتل دیتیں۔ بوتل اور پانی کی قیمت وصول کرتے عظمت میاں۔ صوفی آپا سب دیکھتیں، سمجھتیں اور خاموش رہتیں۔انہوں نے برسوں پہلے ہی خاموش رہنا ہی اپنی زندگی کا اصول بنا لیا تھا اور اس اصول پر کاربند رہتے ہوئے وہ آج تک کے پچاس سال تک کے سفر کو طے کر سکی تھیں۔‘‘(افسانہ: صوفی آپا)

شائستہ فاخری نے زندگی کے سچ کو اتنے مختلف النوع جہتوں سے پیش کیا ہے کہ یقین نہیں ہوتا ہمارے معاشرے کا سچ کتنی ملاوٹوں کے ساتھ برسر پیکار ہے۔اس سچ کا تعلق ہر طبقے سے وابستہ افراد کے انفرادی ، اجتماعی اور معاشرتی رویوں اور مسئلوں سے ہے۔ یہ افراد مرد بھی ہیں اور عورت بھی۔لیکن عورت ان کے یہاں حاوی کردار یا موضوع بن کر سامنے آئی ہے۔عورتوں کو اندروں خانہ اور بیرون خانہ کس طرح کی صورت حالات ، کن کن داخلی اور خارجی مسئلوں، پدری نظام میں کن کن پر خطر راستوں اور کیسے کیسے پیش پا افتادہ رویوں سے گزرنا پڑتا ہے، یہ ان کے افسانوں کے خصوصی موضوعات ہیں۔ان کے افسانوں میں عورت کی بیچارگی اور مجبوری کے ساتھ ساتھ بیداری اور آزادی ءنسواں کی بھی آوازیں ملتی ہیں۔

موضوعات کے انتخاب میں شائستہ فاخری نے بڑی فراخ دلی کا ثبوت دیا ہے اور کسی ایک چوکھٹے میں خود کو محدود نہیں رکھا۔ان کے دیگر افسانوں میں ’ آفندی کا بیٹا‘ ’ سرخاب ابھی زندہ ہے‘ ’ ’کلر بلائنڈ‘ ’ آزاد قیدی‘ فساد اور

باقی صفحہ ۳۸ پر ملاحظہ کیجیے

''ترے آسماں اور بھی ہیں''

علی احمد فاطمی

(الہٰ آباد، بھارت)

شائستہ فاخری کی شخصیت پر لکھنا میرے لیے مشکل کام ہے جبکہ میں بیحد سکھاڑ ہوں۔ بدنامی کی حد تک لیکن جس شخصیت سے ذاتی طور اور خاندانی حوالوں سے تعلق ہو اور جس کا خاندان بھی ایسا جو الہٰ آباد میں اپنی تاریخ، تہذیب اور تقدیس کے لیے دور دور تک شہرت رکھتا ہو، اس شخصیت پر قلم اٹھانا ایک مشکل کام تو ہے ہی لیکن کبھی کبھی زندگی میں مشکل اور نازک کام کرنے ہی پڑتے ہیں، اس کا لطف الگ ہوا کرتا ہے بقول شاعر:

''اگر آسانیاں ہوں زندگی دشوار ہو جائے''

الہٰ آباد ویسے بھی اپنی سنگمی تہذیب کے لیے منفرد شناخت رکھتا ہے۔ معدنی صنعتوں کا شہر، گیان دھیان کا نگر۔ اسی کے متوازی یہاں کے دائرے تصوف اور تعمق کے لیے اپنی گراں بہا تاریخ پر ناز کرتے ہیں۔ ان دونوں کے معنی خیز امتزاج و انجذاب نے شہر الہٰ آباد کو نہ صرف شہرت نجات کا نام دیا بلکہ یہ شہر حیات بھی کہلایا کہ اکثر اقتدار و سرمایہ کے خلاف اسی شہر اور اسی دائرہ فقر و قناعت سے مزاحمت و احتجاج کی صدائیں بلند ہوئیں۔ دائرہ شاہ اجمل کے آنگن میں انگریزوں کے خلاف بغاوت ہوئی اور انگریزی ملبوسات کی ہوک جلائی گئی۔ اسی دائرے نے زندگی کے کئی محاذ پر عام انسانوں کی بھرپور حمایت کی، دعائے خیر کی۔ مولانا فاخر سے لے کر مولانا راشد اور مولانا شاہد فاخری تک ایک لمبی روایت جہاں مذہب، تہذیب، سماج، سیاست سب شیر و شکر ہو گئے ایک ہی صف میں کھڑے ہو گئے۔ انہیں دائروں میں صوفیانہ شاعری کا ایک سنہرا و یادگار باب رقم ہوا کہ ناسخ جیسا شاعر کہہ اٹھا:

ہر پھر کے دائرے میں ہی رکھتا ہوں میں قدم
آئی کہاں سے گردشِ پرکار پاؤں میں

مثالیں اور بھی ۔۔۔ لیکن قصہ مختصر یہ کہ آج زندگی کے بدلتے بلکہ اکثر بگڑتے ہوئے ماحول میں بھی دائرہ شاہ اجمل صرف ایک دائرہ یا محلہ نہیں بلکہ بلندی پر بسا ہو معلّیٰ ہے۔ اسی خاندان کی چشم و چراغ ہیں محترمہ شائستہ فاخری۔ حضرت مولانا شاہد فاخری کے دوسرے بیٹے جناب زاہد فاخری کی تیسری بیٹی بچپن سے ہی الگ الگ سی، منفرد اور خاموش طبع۔ زاہد فاخری مرحوم نے اپنی تمام بیٹیوں کو اعلیٰ تعلیم دلوائی۔ یہ اُس زمانے کے دائروی اور خانقاہی ماحول میں ایک مشکل کام تھا لیکن زاہد صاحب مرحوم بھی مشکل کام ہی کرتے تھے۔ میرے والد مرحوم علی شیر فاطمی سے مولانا شاہد فاخری کے دوستانہ، برادرانہ تعلقات تھے۔ والد مرحوم کا مدتوں دائرے میں قیام رہا بلکہ مولانا کے بیٹوں کے وہ اتالیق بھی رہے۔ عربی، فارسی، قرآن کی تعلیم دی۔ اسی لیے زاہد فاخری اور مولانا ناصر فاخری (موجودہ سجادہ نشین) مجھے ہمیشہ چھوٹے بھائی کی طرح عزیز رکھتے تھے اور رکھتے ہیں۔ اسی نسبت سے یہ لڑکیاں ہمیشہ مجھے ''فاطمی چچا'' کہتی تھیں اور آج بھی اسی رشتے سے یاد کرتی ہیں۔ اسی لیے ابتداً عرض کیا کہ شائستہ فاخری جواب اردو کے افسانوی ادب کی ایک پہچان بن گئی ہے وہ میرے لیے افسانہ نگار بعد میں ہے بھتیجی پہلے، اس کی شخصیت پر لکھنا قدرے مشکل ہے، لیکن ان رشتوں کو تھوڑی دیر کے لیے الگ کرتے ہوئے اس کی افسانہ نگاری والی شخصیت پر لکھنے کا جو اصرار ہے اس پر ضرور کچھ عرض کرنا چاہوں گا۔ جذباتیت سے الگ، معروضیت کے ساتھ ساتھ۔

جیسا کہ عرض کیا شائستہ بچپن سے ہی اپنے بھائی بہنوں میں قدرے مختلف و منفرد تھیں۔ ہم جب کبھی زاہد صاحب کے گھر جاتے دیگر بچوں سے ملاقات ہوتی لیکن شائستہ سے کم ہو پاتی۔ پوچھتے تو معلوم ہوتا اپنے کمرے میں ہے۔ اپنی میز پر کچھ پڑھ رہی ہے، کچھ لکھ رہی ہے۔ اس کی بڑی بہنیں غزالہ، شہلا، چھوٹی بہنیں زرین، آمنہ وغیرہ اکثر ملتیں اور اپنے تعلیمی منصوبوں پر باتیں کرتیں۔ دیگر مواقع اور تقریبات میں بھی یہ بچے بچیاں نظر آتے لیکن شائستہ کم سے کم۔ اور جب کبھی ملاقات ہوتی بھی تو اندازہ ہی نہیں ہوتا کہ آپ ایک کمسن بچی سے مل رہے ہیں۔ چہرے پر سنجیدگی، بُردباری جو فطری نوعیت کی ہوا کرتی۔ شائستہ کو ضرورت سے زیادہ شائستہ و مہذب بنائے رکھتی۔ کچھ عجیب سا ضرور لگتا لیکن اچھا بھی لگتا کہ شائستہ کے دل و دماغ میں الگ سا کچھ ہے جو ضرور کچھ کر دکھائے گا۔ بس ذرا مناسب تربیت اور راہ دکھانے کی ضرورت ہے۔ میں نے یہ بات کئی بار زاہد صاحب سے کہی بھی تھی۔ اور زاہد صاحب جنہیں ہم پیار سے ''بھیّا'' کہتے تھے اور جو اپنی بیٹیوں سے غیر معمولی محبت کرتے تھے اور ان کی تمام ضرورتوں اور منصوبوں پر نظر رکھتے تھے اور جن کے لیے خود بھاگتے دوڑتے تھے اس لیے کہ بیٹے اُس وقت بے حد چھوٹے تھے۔

زمانہ گزرتا گیا۔ میں بھی اعلیٰ تعلیم حاصل کر کے الہٰ آباد یونیورسٹی میں لکچرر ہو گیا (81-1980)۔ زاہد صاحب اُس وقت آل انڈیا ریڈیو الہٰ آباد پر اعلیٰ افسر تھے۔ اردو کا پروگرام بھی دیکھتے تھے۔ خاندانی روابط تو پہلے ہی سے تھے لیکن اب آنا جانا کچھ زیادہ ہو گیا۔ اس کی وجہ بھی اردو تھی۔ اردو کے پروگرام بڑی بیٹی غزالہ کا اردو سے ایم۔ اے کرنا لیکن سب سے بڑی وجہ جو مجھے لگی وہ شائستہ تھیں۔ شائستہ اس وقت سنسکرت سے ایم۔ اے کر رہی تھیں۔ میرے لیے یہ ایک جھٹکا تھا۔ دائرہ شاہ اجمل کے اسلامی و مذہبی ماحول کی پروردہ ایک لڑکی سنسکرت سے ایم۔ اے کر رہی ہے۔ مقام حیرت تھا۔۔۔ لیکن جیسا کہ عرض کیا گیا کہ شائستہ کے فکر و عمل میں تحیر زیادہ ہوا کرتا تھا۔ کل بھی اور آج بھی۔۔۔ اس معاملہ میں بھی بھیّا نے اپنی بیٹی کا بیحد ساتھ دیا۔ کبھی کبھی وہ اس کی قیمت بھی ادا کرتے تھے لیکن اس ضمن میں ان کی محبت، شجاعت، صبر و استقلال بے مثال تھا۔ ان

معاملات میں ان کی بیگم صالحہ بھابی ان کی غیر معمولی معاونت کرتی تھیں۔ بچیوں کو ہمت ور اور نڈر بنانے میں ان کا بھی اہم رول ہے۔

اسی زمانے میں یہ بھی معلوم ہوا کہ شائستہ کہانیاں بھی لکھتی ہیں۔ اس بار حیرت کم مسرّت زیادہ ہوئی کیونکہ مجھے اندازہ تھا کہ شائستہ تنہا نہیں ہے اس کی خاموشی، سنجیدگی صاف ظاہر کرتی تھیں کہ اس کے وجود میں، اس کے باطن میں کوئی اور ہے جو اسے بے چین اور پریشان کیا کرتا ہے جس نے اسے خاموشی اور تنہائی پسند بنا رکھا ہے اس لیے کہ میں نے دیکھا تھا کہ خاندانی معاملات ہوں یا بھائی بہن کے رگڑے جھگڑے شائستہ کو میں نے ان بے وقوفیوں میں کبھی ملوّث نہیں پایا۔ اس کے فکر وخیال کی دنیا کچھ اور ہی تھی۔ ہر چند کہ خانقاہی جمال دنیاوی جال وجلال میں تبدیل ہو رہا تھا لیکن اس تبدیلی سے شائستہ کو کچھ لینا دینا نہیں اور اگر تھا تو بس اتنا کہ ایک مخصوص تہذیبی، مذہبی زندگی میں وہ اور اُس جیسی لڑکی کے وجود کو دیکھے اور سمجھے۔ اس لیے کہ اس کی نظروں میں ماں، پھوپھیاں، دادیاں وغیرہ کا بکھرنا، سمٹنا یہ الفاظ دیگر شرع ودین کے نام پر کسا ہوا وجود تھا ان کے معاملات، ان کے ساتھ پیش آنے والے روّیے، ٹونے ٹنکے اور شوہر مجازی کے لٹکے جھٹکے۔۔۔ غرض یہ کہ عورت کی زندگی، لڑکیوں کی بے بسی، خاندان کی کسمپرسی، مقدمہ بازی وغیرہ کو شائستہ کی معصوم آنکھیں ظلم کے نئے نئے باب پڑھ رہی تھیں۔ اور وہ پڑھتی رہیں اندر اندر پکتی بھی رہیں۔ خاموشی سے کاغذ پر اترتی بھی رہیں۔۔۔ لیکن اُس وقت اور شاید آج بھی یہ سوال تھا کہ وہ سنسکرت کی طرف کیوں گئیں۔ یوں تو کوئی کہیں بھی جا سکتا ہے لیکن شائستہ جیسی حسّاس وسنجیدہ لڑکی کا کوئی فیصلہ شعوری یا لاشعوری طور پر ایک نظریہ تو رکھتا ہی ہے۔ ہو سکتا ہے کہ اس کا متحیّر و متجسس ذہن شعور کی اڑان اُسے اس عمل پر مجبور کر گیا ہو کہ چلو اردو کی غزالہ تو دیکھ لی چلو چل کر سنسکرت کی شکنتلا کو دیکھا جائے کہ عورت تو دونوں ہی ہیں۔ اُسی ہندوستان کی قدیم تاریخ کی۔۔۔ اُسی معاشرہ کی۔۔۔ زاویے اور راستے دو ہیں تو کیا ہوا عورت تو ایک ہی اور صدیوں کا مردانہ سماج بھی ایک جیسا۔ تلاش وتجسّس کے اس عمل میں اسے اس بات کا صاف اندازہ ہو گیا کہ خواہ غزالہ ہو یا شہلا اور شکنتلا ہو یا ارملا سب کی حیثیت ایک سی ہے، سب کی کیفیت، سب کی مظلومیت ایک۔ یہ سب دیکھ کر وہ خارجی سطح پر خوف زدہ ہوئی لیکن باطنی حیثیت سے مضبوط۔۔۔ اس مضبوطی کا اظہار یوں تو اس افق سے ظاہر ہونے لگا تھا جب وہ ساتویں درجہ میں تھی اور اس نے ہندی میں ایک کہانی آلنگن لکھی۔ والد کو پتہ چلا تو خاموشی سے دریافت کیا کہ یہ آلنگن کیا ہوتا ہے تو شائستہ نے جواب دیا لپٹانا۔ گلے سے لگانا۔ والد خاموش ہوئے اور کہا کہ اردو میں لکھنے کی کوشش کرو تا کہ ہم لوگ بھی تو سمجھ سکیں لیکن شائستہ نے ارادی اور شعوری طور پر ہندی میں لکھنا چاہا تا کہ اس کی بات دور تک پہنچے اور فرسودہ اردو والوں کو زیادہ خبر بھی نہ ہو اور وہ اسی بوسیدہ روایت وفرسودگی کی کائی کو توڑنا چاہتی تھی اس لیے سرکشی اور سمجھداری اسے ہندی کی طرف لے گئی۔ ہر چند کہ اس کی مادری زبان اردو تھی اور ہے تاہم انحراف کی کیفیت تو باغیانہ فیصلے کو ہی مدعو کرتی ہے۔

انٹرمیڈیٹ تک پہنچتے پہنچتے اُس نے کئی کہانیاں ہندی میں لکھیں جن میں سندھی بیلا کو شہرت ملی اور وہ ہندی والوں میں جانے پہچانے جانی لگی۔ اردو والے بے خبر۔۔۔ کہ ان کی بے خبری ان کے افتخار کا باعث ہوتی ہے وہ ہندی زبان وادب سے بھی بے خبر رہتے ہیں جو اردو کے قریب ترین زبان ہے۔ اردو مادری زبان ہونے کے باوجود شائستہ نے ایک مضمون کی حیثیت سے بی۔اے میں جا کر پڑھی۔ بی۔اے کرنے کے بعد اس نے سنسکرت سے ایم۔اے کرنے کا فیصلہ کیا۔ اس فیصلے میں بھی ایک طرح کی بغاوت اور سرکشی پوشیدہ تھی جو سب پڑھتے ہیں، جو سب کرتے ہیں وہ ہم نہیں کریں گے۔ ان سب سے الگ۔ روایت سے مختلف و منحرف۔۔۔ تو یہ تھا اس کا ہندی اور سنسکرت کی طرف رجوع کرنے کا معاملہ جو میں بعد میں سمجھ سکا۔ کیونکہ اس وقت تو میں محض لکچرر تھا بس یہ تھا کہ شائستہ افسانے لکھتی ہیں اور ہندی میں لکھتی ہیں تو کیا ہوا اس لیے کہ کئی دہائیوں سے مسلم نوجوان کا بڑا طبقہ اردو سے زیادہ ہندی کے قریب آ چکا تھا۔

مجھے یاد ہے کہ زاہد صاحب کے گھر یا میرے گھر پر شائستہ نے کئی افسانے سنائے۔ اُس کا سنانے کا انداز، اس کے بعد افسانے پر گفتگو اور شائستہ کے جوابات حیران کر دیتے، ہم بھی استاد ہو چکے تھے اور استادی دکھانے کا جذبہ بھی تھا خوب خوب بحثیں ہوتیں۔ شائستہ ان سب باتوں کو غور سے سنتی۔ بحث میں شریک ہوتی۔ اس کی گفتگو میں بلا کا اعتماد ہوتا وہ جو کچھ کہتی تھی، جو کردار گڑھتی تھی اس کے پیچھے باضابطہ ایک سوچ ہوتی۔ نظریہ ہوتا اور گفتگو میں اس کی وضاحت کرتے ہوئے منطقی انداز میں اس پر قائم بھی رہتی اِدھر اُدھر کی بحثوں کی وہ پروا بھی نہ کرتی۔ یہ ایک اچھی علامت تھی۔ اس وقت میں سوچتا تھا کہ یہ لڑکی اردو کی طرف آ جائے تو بڑے کام ہو سکتے ہیں اس لیے کہ اس وقت تک الہٰ آباد میں اردو میں کوئی قابلِ ذکر خاتون نہ تھی سچ تو یہ ہے کہ قابلِ ذکر مرد بھی نہیں۔ یہ شہر تو شاعری سے جانا جاتا ہے خصوصاً اکبر الہٰ آبادی کے حوالے سے۔ میں نے زاہد صاحب سے اصرار کیا کہ شائستہ کی کہانیاں اردو میں آنی چاہیے۔ شائستہ سے بھی کہتا تو وہ بس مسکرا کر رہ جاتی۔ لیکن مجھے پتہ تھا کہ اس تبسم میں بھی ایک تکلّم ہے۔ خاموش رہنا اور خاموشی کی زبان سے بول جانا یہ ایک بڑا ہنر ہوا کرتا ہے شائستہ نے اس ہنر کو ایک سلیقہ اور نظریہ بنا دیا تھا۔ کل بھی اور آج بھی۔۔۔ آج بھی وہ کم سخن ہے کم آمیز بھی جس کی وجہ سے اکثر لوگوں کو اُس کے بارے میں غلط فہمی بھی ہو جاتی ہے لیکن مجھے معلوم ہے کہ اس کی خاموشی میں بے چینی اور علیحدگی میں سنجیدگی پوشیدہ ہے اس لیے کہ وہ اندر ہی اندر فکر وخیال کے ایک طوفان میں مبتلا رہتی ہے جو تخلیق کا کرب بن کر اس کے رگ وریشہ میں دوڑتا رہتا ہے جسے وہ سنبھال کر رکھنا چاہتی ہے۔ باہر کی دنیا کے سرد وگرم، انسانوں کے پیچ وخم، بیجا قسم کے تبصرے الٹے سیدھے فقرے اس کرب کو متزلزل کر دیتے ہیں اس لیے وہ کم آمیز ہے۔ اب تو اس کی کم آمیزی کی کچھ اور وجہیں بھی ہیں۔

ہم دوستوں یا چچاؤں کے اصرار پر اُس نے اپنے افسانوں کا ایک مجموعہ ''ہرے زخم کی پہچان'' اردو میں چھپوایا ضرور لیکن صاف لگتا تھا کہ شائستہ ہندی

اور سنسکرت کی طرف زیادہ متوجہ ہیں۔ چنانچہ انہوں نے ہندی میں افسانے لکھے اور سنسکرت سے ایم۔اے کیا۔ یہ اپنے آپ میں کم از کم دائرہ شاہ اجمل کے تہذیبی و روایتی ماحول کو دیکھتے ہوئے عجیب سی بات تھی چونکہ ہم روایت سے منحرف نہیں ہوتے، بوسیدگی کو توڑنے کی ہمت نہیں کرتے اس لیے کمزور لوگوں کو ایسے فیصلے نہ صرف عجیب سے لگتے ہیں بلکہ وہ اس کی مخالفت میں لگ جاتے ہیں اور مخالفت کرنا، نکتہ چینی کرنا دنیا کے آسان ترین کاموں میں شمار کیے جاتے ہیں۔ زاہد فاخری کو اپنی بیٹیوں کے تعلق سے ایسے بے شمار اعتراضات کا سامنا کرنا پڑا لیکن وہ بھی بڑے جیوٹ کے انسان تھے۔ بچیوں کی خواہش پر جان چھڑکتے تھے۔ ان کی ہر خواہش پوری کرتے تھے تعلیم و تہذیب کے تعلق سے بطور خاص۔۔۔ یہی وجہ ہے کہ آج ان کی تقریباً سبھی لڑکیاں اعلیٰ تعلیم پا کر اچھے اچھے عہدوں پر فائز ہیں۔ سب کی شادیاں ہو گئیں اور سب اپنے اپنے شوہر اور بچوں کے ساتھ خوشحال۔۔۔ لیکن شائستہ کے ساتھ تقدیر نے یہاں بھی الٹ پھیر کر دی۔ ایسی حسّاس اور فنکار لڑکی کے ساتھ ایسا ہو بھی جاتا ہے کہ شوہر زمانے کے ساتھ ہوتا ہے اور شائستہ جیسی بیوی زمانے سے مختلف و منحرف۔ چنانچہ یہی ہوا کہ شائستہ کی شادی تو ہو گئی ایک نامناسب لڑکے کے ساتھ اور دو سال میں دو بچے کے بعد علیحدگی ہو گئی۔ غور کیجیے کہ قلم اور کتاب والی لڑکی کی زندگی دو بچوں کے لالن پالن اور پھر اس پر شوہر اور سسرال کا عذاب۔ پھر تو جو ہونا تھا وہ ہو کر رہا۔۔۔ شائستہ نے آگ کے اس دریا کو پار کیا اور اپنے آپ کو آزاد کیا۔ حسّاس اور فنکار کی دنیا میں خلفشار تو اٹھا ہی لیکن شائستہ کی شائستگی یہ بھی کہ اس نے ان کڑوے تجربات اور زندگی کے حادثات کو اپنے دامن میں سمیٹ لیا اور اپنے افسانوں اور ناولوں کے آنچل میں ٹانک دیا یہ ایک کمزور عورت نہیں کر سکتی تھی۔ ایک بہادر جرأت مند فنکار ہی کر سکتا تھا۔۔۔ اور بلاشبہ شائستہ ایک بہادر لڑکی ہے اُس نے اپنی بہادری کو فنکاری میں بدل دیا۔ ایک اچھی بات یہ ہوئی کہ اسے ریڈیو پر ملازمت مل گئی اور شوہر کے عذاب سے مکمل طور پر علیحدگی بھی۔ اب شائستہ کے دو بچے ہیں۔ دو ناول ہیں اور بے شمار عمدہ و بہترین کہانیاں ہیں۔ اور یہ سب کہ سب اردو میں ہیں۔ شائستہ نے ذاتی طور پر مجھے بتایا کہ چچا اگر میں اس آگ کے دریا سے نہ گزر پاتی تو ''صدائے عندلیب بر شاخ لب'' جیسا ناول نہ لکھ پاتی۔ اور درجنوں کہانیاں بھی۔ دوسرے کرداروں، مکالموں میں جو درد ہے، کرب ہے، تجربہ ہے وہ میرا اپنا ہے اسے میں نے دنیا کی تمام عورتوں میں تقسیم کر دیا۔ اگر یہ کرب نہ ہوتا تو میں رقیہ باجی جیسی کہانی نہ لکھ پاتی۔ اور اسی نوعیت کی دوسری کہانیاں۔۔۔ بظاہر زندگی کی شکست، ازدواجی زندگی کی ناکامی نے شائستہ کو ایک عمدہ، بامعنی افسانہ نگار و ناول نگار بنا دیا۔ تبھی تو رقیہ باجی افسانہ کے آخر میں وہ لکھتی ہیں۔۔۔ ''میں جدوجہد کی ایک جنگ تو ہار گئی لیکن اس ہار میں بھی میری جیت تھی۔ میری خوشی تھی'' اور پھر یہ ممتا بھرا احساس۔۔۔ ''یکا یک میری نظر سامنے کے بیڈ پر گئی جہاں میرے دونوں بچے جواب سنِ بلوغت کو پہنچ رہے ہیں، آرام سے سو رہے تھے۔۔۔ یہ بچے ہی اب میری زندگی کا حاصل ہیں، میرا مستقبل ہیں، میری منزل ہیں۔۔۔'' عورت کتنی بڑی فنکار، مفکر و دانشور ہو جائے اس کے اندر کی ممتا نہیں مرتی اس لیے کہ یہ ممتا ہی اسے عظیم بناتی ہے شاید اسی لیے ہر لڑکی یا بیوی اس وقت مکمل ہوتی ہے جب وہ ماں بنتی ہے۔ بیوی رہے یا نہ رہے لیکن ماں کی ممتا ہر سو ایک نگاہِ التفات ذاتی ہے اور وہ زندگی و معاشرہ کو بھی ممتا کی نگاہوں سے دیکھتی ہے۔ اس لیے شائستہ کی ہر وہ کہانی جو ممتا کی نگاہ سے جذبہ سے لکھی گئی ہے دل کو چھوتی ہے لیکن جہاں صرف عورت ہے، مظلوم بیوی ہے، غصہ ہے جھنجھلاہٹ ہے وہاں وہ اکثر جانب دار ہو گئی ہیں اس لیے ان کے افسانوں میں اکثر عورت کی مظلومیت، حمایت ہی دکھائی دیتی ہے۔ ہر چند کہ ان میں حقیقی عناصر بھی کام کرتے ہیں اور وہ عورت کو مرد کے بغیر نامکمل بھی سمجھتی ہیں۔ ان کے افسانوں اور ناولوں میں ایسے جملے بار بار پڑھنے کو ملتے ہیں:

''سچ مچ مرد کے بغیر عورت خالی برتن میں کھنکتے کھوٹے سکّے کی طرح ہوتی ہے''

اور پھر یہ جملہ بھی:

''مرحلہ شادی کا ہو یا طوائفیت کا دونوں مورچوں پر عورت ہی خریدی اور بیچی جاتی ہے''

مرد کے لیے ان کا یہ خیال ہے:

''مرد عورت کو پھول کی طرح توڑتا ہے اور گھاس کی طرح روند ڈالتا ہے۔''

اور اب دونوں کا موازنہ بھی ملاحظہ کرتے چلیے۔ کیا خوب موازنہ ہے:

''مرد کا عشق مرد کے لیے زندگی میں ایک الگ چیز ہوتی ہے جبکہ عورت کے لیے یہ پوری زندگی کا مسئلہ ہوتا ہے۔ عورت کے لیے عشق کا مطلب جسم اور روح کی مکمل سپردگی ہے بغیر کسی شرط سب کچھ عشق کی بارگاہ میں قربان کر دینا عورت کا ایمان بن جاتا ہے جبکہ مرد کے لیے عشق عورت کا عشق طلب کرنا ہے۔''

یہ مثالیں میں نے ان کے ناول ''صدائے عندلیب۔۔۔'' سے دی ہیں جو مجھے بے حد پسند ہے۔ ان کے افسانوں میں بھی ایسے بلیغ و بامعنی جملے پائے جاتے ہیں جن کے بدلے میں میری رائے ہے کہ ان میں کبھی کبھی بیجا موافقت اور مخالفت کی بو آنے لگتی ہے۔ میں نے کسی مضمون میں اس کا اظہار بھی کیا اور روبرو گفتگو کی تو شائستہ نے ہر بار اپنے غیر معمولی تجربات و خیالات کے ذریعہ قائل ہی کیا۔ پھر جب میں نے ان کے افسانوں اور ناولوں میں اس نوع کے جملے دیکھے:

''پیسے والوں کے ہاں ان کا موڈ قیمت رکھتا ہے، غریبوں کے لیے ان کا پیٹ''

''غربت زبان کی قوت چھین لیتی ہے''

''غریب جب خواب دیکھتے ہیں تو ان کی پرواز اتنی اونچی ہوتی ہے کہ سورج کی گرمی سے پنکھ جل اُٹھتے ہیں۔''

مکالمے اور بھی ہیں جن میں زندگی کے رگڑے جھگڑے، تجربے

بھرے پڑے ہیں۔لیکن ایسے مقام، مرحلیں پھر آتے ہیں جہاں مرد اور عورت کا فرق ختم ہو کر انسان میں تبدیل ہو جاتا ہے جہاں عورت بولتی ہے تو زندگی بولتی ہے لیکن کبھی کبھی نسوانی کردار ایسے بھی ہوتے ہیں جہاں صرف عورت ہی بولتی ہے۔۔۔

یہ ایک فطری عمل ہے۔شائستہ نے جو زندگی گزاری ہے اور جو عذاب اس پر مسلّط ہوئے ہیں وہ ایک عورت ہی محسوس کرتی ہے اسی لیے ان کا فطری انعکاس اور تخلیقی اظہار تو ہونا ہی تھا سو ہو کر رہا اور بہت اچھے ڈھنگ سے ہوا۔اس ڈھنگ اور اسلوب نے مجھے چونکایا حیران کیا اس لیے کہ میں اپنی اس باغی بھتیجی کو جانتا تھا جو اردو کے بجائے ہندی میں لکھنا پسند کرتی تھی اور اب وہ دھڑا دھڑ اردو میں نہ صرف لکھ رہی ہے بلکہ اپنی ایک عمدہ پہچان بنا رہی ہے کہ گوپی چند نارنگ اور مغنی تبسم جیسے سینئر نقاد متوجہ ہوئے اور مضامین لکھے۔ظاہر ہے کہ مجھے بھی متوجہ ہونا چاہیے تھا چنانچہ ہوا۔ اور اس کے افسانوں اور ناولوں کو پڑھا تو اس میں اردو و مسلم تہذیب کی ایک تڑپتی، مچلتی دنیا نظر آئی۔۔۔شائستہ کا بھرپور مشاہدہ اور اس سے زیادہ مجاہدہ و مجادلہ ایک خاص زاویے اور نظریے سے ان افسانوں میں بھرا پڑا ہے۔میرا سوال فطری تھا۔تم ہندی سے اردو کی طرف کب اور کیوں آئیں؟ تو جواب تھا ہندی میں لکھا ضرور جس کا ایک مقصد بھی تھا لیکن لکھتے لکھتے مجھے اندازہ ہو گیا کہ فنکار اپنے دلی جذبات و احساسات اور اپنا اضطراب اپنی مادری زبان میں ہی ظاہر کر سکتا ہے۔دوسرے یہ کہ ایک احتیاط و احترام کے تحت ہندی میں لکھنا شروع کیا تھا لیکن بڑھتی عمر اور تلخ تجربوں، خاص طور پر شادی کی ناکامی کے تجربے نے سارے خطرات کو یکلخت مٹا دیا۔اب میں آزاد ہوں۔اس کی آزادی یا احساسِ آزادی کو دیکھ کر مجھے تو خوش ہونا ہی تھا اور اردو میں اس کا استحصال کرنا ہی تھا۔

یہ مضمون تاثراتی نوعیت کا ہے اس لیے میں یہاں شائستہ کے فکر و فن پر گفتگو کم سے کم کروں گا۔شائستہ نے کئی جگہ کئی رسائل میں انٹرویو، مضمون کی شکل میں اپنے خیالات و تصورات کا اظہار بھی کیا ہے لیکن میرا خیال ہے کہ تاثر و تنقید اور تخلیق میں بہرحال فرق ہوا کرتا ہے اس لیے میں فنکار اور افسانہ نگار کی تخلیقات کو راست طور پر پڑھتا ہوں اور جو بھی بُری بھلی رائے بنتی ہے بناتا ہوں۔

کبھی کبھی میں سوچتا ہوں کہ عورت اور کہانی کا چولی دامن کا ساتھ رہا ہے۔کم از کم اردو فکشن میں مردوں کے شانہ بشانہ عورتوں نے خوب خوب لکھا اور بہت عمدہ لکھا۔رشید جہاں، عصمت چغتائی اور قرۃ العین حیدر نے جو جھنڈے گاڑے ہیں ان کی مثال نہیں ملتی۔پھر یہ بھی خیال آتا ہے کہ آج کے دور میں ذکیہ مشہدی، ترنم ریاض، نگار عظیم، ثروت خان اور اب شائستہ کے ہوتے ہوئے کیا وہ صورت بن پا رہی ہے کہ جب عصمت چغتائی سے منٹو جیسا فنکار شرما جایا کرتا تھا۔جب لحاف کہانی چھپی تو منٹو کئی دن تک سو نہیں پایا اور ایک گفتگو میں کہا کہ لحاف کے آگے اُنہیں اپنی کہانیاں ہیچ لگیں۔کیا ایسی صورت آج بن پا رہی ہے اور نہیں تو کیوں نہیں؟ یہ بات تمام خواتین افسانہ نگاروں کو سوچنا چاہیے۔یا یہ کہ عورت آج بھی عورت کے تصور سے باہر نہیں نکل پائی ہے یا یہ کہ مرد کی سفا کی کل کے مقابلے آج زیادہ پُر فریب اور پیچیدہ ہو گئی۔کہیں کچھ تو گڑبڑ ہے۔

شائستہ میں غیر معمولی سمجھداری اور فنکاری ہے۔وہ ایک گہرا تہذیبی و نفسیاتی زاویہ بھی رکھتی ہیں سنجیدہ اور بالیدہ۔اس لیے کبھی کبھی مجھے لگتا ہے کہ شائستہ اپنے میکہ و سسرال میں ہی نہیں اپنی کہانیوں میں بھی ٹھیک سے سمجھی نہیں گئیں۔نفسیاتی شعور، تاریخی، تہذیبی اور مذہبی شعور کا تال میل ایک نئی دنیا آباد کرتا ہے۔ تصوف، تعقل و تحمل کی دنیا جن میں خارجیت کم باطنیت زیادہ ہے۔جن میں سطح کم تعمق زیادہ ہے۔۔۔یہی وجہ ہے کہ اکثر کردار کوئی بھی ہو، ان کا تجربہ، ان کی پیش کش، ان کی تخلیقیت میں ایک انسانی و فکری تہذیب بولتی ہے۔

شائستہ سے ملئے، مختصر گفتگو ہی کیجیے، صاف اندازہ ہوگا کہ وہ گھمبیر ہے اور اس کی گمبھیرتا میں ہلکی سی اُداسی ہے لیکن اس نے اس اُداسی کو فکر و فلسفہ کی چادر اوڑھا دی ہے جس سے اس کی ذات محض اس کی ذات نہیں رہ گئی ہے وہ کائنات میں پھیل گئی اور سوالات میں اُتر گئی ہے اسی لیے اس کے کرداروں میں اکثر سوالات تڑپتے مچلتے نظر آتے ہیں۔ایک ہلکی سی پُر اسراریت بھی کہ اُس کے سارے کردار عورت بطور خاص آسانی سے نہیں سمجھے جاتے۔ناول ''صدائے عندلیب'' کا کردار ستارہ جو عورت ہے اور لکھنے والی بھی عورت یعنی شائستہ وہ خود بھی آسانی سے نہیں کھلتیں۔عامی لوگوں کے درمیان بطور خاص ناول کا ایک جملہ دیکھئے:

''میں جانتی ہوں کہ اپنی خاموشی کی بساط پر ستارہ مجھ سے کھیل رہی ہے مگر وہ یہ نہیں جانتی کہ میں اس کی بچھائی بساط پر اُسی کو مہرہ بنا کر اپنی چالیں چل رہی ہوں۔''

اس کی بلاغت میں اُتریے، زندگی اور جدوجہد زندگی سے جو چھننے والی ایسی عورت کو کون زیر کر سکتا ہے۔نہ نقاد، نہ پروفیسر نہ عام افسانہ نگار۔۔۔ شائستہ کی شائستگی اور سنجیدگی نے بڑے سے بڑے عالموں، نقادوں کو متاثر کر رکھا ہے خواہ وہ نارنگ ہوں یا مغنی تبسم۔صغیر ہوں یا کبیر۔

شائستہ ابتداً ہرے زخم کی پہچان بن گئی تھیں لیکن رقیہ باجی نے اُنہیں ایک وسیع تناظر دیا بظاہر سوا سو سال کا وقفہ لیکن عورت کا صدیوں کا سفر۔ اس کا وجود عدم وجود آج بھی مسئلہ ہے۔لیکن جیسا کہ عرض کیا گیا کہ عورت اگر زندگی کا حوالہ ہے تو کردار علامتی بھی ہو جاتا ہے اور زندگی متصادم ہوتی ہے اور نئی نئی حقیقتیں جنم لیتی ہیں۔حقیقت اور صداقت کے انیک روپ ہوتے ہیں۔ان کے تضادات و تصادمات سے کتنے سفا کی قسم کے جھوٹ اور کتنے خوفناک قسم کے سچ پیدا ہو رہے ہیں یہ الگ بات ہے کہ شائستہ ان مکروہ سچائیوں کو عورت کے حوالے سے پیش کر رہی ہیں۔یہ ایسی کوئی بُری بات بھی نہیں ہے کہ جو جہاں کا ہے اگر وہیں کا نہیں ہے تو پھر کہیں کا نہیں ہے۔لیکن پھر بھی ایک گفتگو میں میں نے از راہِ محبت کہا کہ اب تم زندگی کا براہِ راست سامنا کرو۔عورت و مرد سے بالاتر ہو کر کہ زندگی کی وحدت و عظمت کے خانوں میں نہیں بٹتی۔۔۔دیکھو عصمت کو۔

باقی صفحہ ۲۸ پر ملاحظہ کیجیے

جدید دور کی نمایاں افسانہ نگار

پروفیسر مغنی تبسم

(●)

جدید دور کے افسانہ نگاروں میں شائستہ فاخری ایک نمایاں نام ہے۔ چند ہی برسوں میں انھوں نے اپنی انفرادی شناخت بنالی ہے۔ ان کے افسانوں کا ایک مجموعہ 'ہرے زخم کی پہچان' کے نام سے شائع ہوا تھا۔ 'اداس لمحوں کی خود کلامی' ان کے افسانوں کا تازہ مجموعہ ہے۔ اس مجموعے کے افسانوں میں ان کا فن پختہ اور زیادہ اثر انگیز ہو گیا ہے۔ شائستہ فاخری نے بیشتر افسانوں میں ہندستانی سماج میں عورتوں کے مسائل اور پدرسری معاشرے میں ان کی زندگی پر مرتب ہونے والے اثرات کو موضوع بنایا ہے اس معاشرے میں عورتوں کو اتنی آزادی بھی حاصل نہیں کہ وہ اپنی مرضی سے زندگی بسر کرنے کا خواب دیکھ سکیں۔ اپنے افسانے 'سنور قیہ باجی' میں اس مضمون کو تمثیلی انداز میں پیش کیا ہے۔

رقیہ سخاوت حسین نے سو برس پہلے خواتین میں بیداری پیدا کرنے کی تحریک چلائی تھی۔ اس تحریک سے متاثر ہو کر کہانی کی واحد متکلم نے اپنی آنکھوں میں آزادی اور خوشگوار زندگی کے خواب سجائے۔ اب وہ خواب میں دیکھتی ہے کہ اسے یہ بتائے بغیر کہ اس کا جرم کیا ہے بندی خانہ میں ڈال دیا جاتا ہے، وہ بھوک ہڑتال کرتی ہے۔ اس پولیس اسٹیشن کی خادمہ اسے کھانے پر مجبور کرتی ہے، اسے مارتی پیٹتی ہے لیکن وہ ٹس سے مس نہیں ہوتی۔ جب وہاں کا اعلیٰ افسر اس کی ہڑتال ختم کروانے کے لئے آتا ہے تو وہ یہ شرط رکھتی ہے کہ اسے بتایا جائے کہ اس کا جرم کیا ہے اور اسے عدالت میں پیش کیا جائے تاکہ وہ انصاف پا سکے۔ اس پر یہ الزام ہے کہ اس نے سلطانہ کے خواب چرائے ہیں۔ اپنی مدافعت میں اس کا یہ استدلال تھا کہ خواب ایسی شے نہیں جو چرائی جا سکے۔ مقدمے کی کاروائی اگلے دن کے لئے ملتوی کی گئی۔ گھڑی الارم سے اس کا خواب ٹوٹ گیا۔ اب وہ اپنے گھر میں تھی۔ شادی کے بعد نو سال تک وہ اپنے شوہر کی زیادتیاں سہتی رہی۔ احتجاج کرنے پر شوہر نے اسے مار پیٹ کر گھر سے نکال دیا اب وہ اپنے دو بچوں کے ساتھ علاحدہ گھر میں گزارا کر رہی ہے۔ جاگنے کے بعد اپنے بچوں پر اس کی نظر پڑتی ہے، وہ سوچتی ہے کہ اب یہ بچے ہی اس کی زندگی کا حاصل اور اس کا مستقبل ہیں۔ وہ رقیہ باجی سے مخاطب ہو کر کہتی ہے: اب وہ خواب نہیں دیکھے گی، حقیقت کی دنیا میں زندگی بسر کرے گی۔

اس مجموعے کی چند اور کہانیاں 'حرف حرف حساب کا دن' 'خوف گنبد میں روشن آنکھیں' اس کہانی کی طرح خواب کی تکنک میں لکھی گئی ہیں۔ ان کی ہر کہانی کا آغاز یا تو کسی درمیانی واقعے سے یا اختتامی واقعے سے ہوتا ہے جس کی وجہ سے کہانی آغاز سے ہی قاری کے ذہن کو اپنی گرفت میں لے لیتی ہے اور اس کا تجسس آخر تک برقرار رہتا ہے۔ اس مجموعے کی کہانیوں میں موضوعات کا بڑا تنوع ہے اور کردار بھی منفرد خصوصیات رکھتے ہیں۔ یہاں چند کہانیوں پر بطور خاص توجہ دلانا چاہوں گا۔ 'خوف گنبد میں روشن آنکھیں' ایک ایسی عورت کی کہانی ہے جس سے انجانے میں گناہ سرزد ہوا تھا۔ ایسا گناہ جس پر مذہب کے حکم کے مطابق گناہگار کو سنگسار کیا جاتا ہے۔ سزا کا خوف اس کے لاشعور میں بس گیا تھا جس کے زیر اثر وہ خواب دیکھتی ہے کہ سردار کے حکم سے بھیڑ اس کو سنگسار کرنے کے لئے چھوٹے بڑے پتھر جمع کرتی ہے۔ صبح ہونے پر پتھر غائب ہو جاتے ہیں، زمین برابر ہو جاتی ہے۔ تین دن تک یہ سلسلہ چلتا ہے۔ بھیڑ کی چہ میگوئیوں سے اسے پتہ چلتا ہے کہ انھیں گھر سے کسی مرد کی آواز سنائی دیتی ہے جس کی بنا پر وہ اس عورت پر فحاشی کا الزام لگاتے ہیں جبکہ وہ جانتی ہے کہ گھر میں اس کے سوا کوئی بھی موجود نہیں ہے۔ لیکن اچانک اسے کچھ سرسراہٹ سنائی دی۔ ایک بچہ اسے کمرے کے کونے میں کھڑا دکھائی دیا۔ پوچھنے پر اس نے بتایا کہ وہ اس کا خوف ہے جو اس کے جسم میں پل رہا تھا۔ تھوڑی ہی دیر میں وہ بچہ ایک بزرگ آدمی کی شکل اختیار کر لیتا ہے۔ پوچھنے پر وہ بتاتا ہے کہ میں تمھارے اندر کا درویش ہوں۔ عورت پوچھتی ہے کہ کیا تم ہی وہ شخص ہو جس کی آواز سن کر بھیڑ اسے سنگسار کرنا چاہتی ہے۔ درویش کہتا ہے کہ عورت خود اس کی ذمہ دار ہے کہ اس نے الف سے دل کی صفائی نہیں کی اور ع غ کے خوف کو پال رکھا ہے۔۔ پھر درویش عورت کو اپنے ساتھ چلنے کے لئے کہتا ہے۔ درویش اور عورت پرند بن جاتے ہیں اور سلاخوں سے باہر نکل کر پرواز کرتے ہوئے وہ ایک جزیرے میں پہنچتے ہیں جہاں بہت سے مرد اور عورتیں رقص کرتے ہوئے محبت کے گیت گا رہے تھے۔ درویش عورت کے قریب ہو کر اس کے بھیتر داخل ہو جاتا ہے۔ ایک سرشاری کی کیفیت میں وہ رقص کرنے لگتی ہے۔ کچھ ہی دیر میں اچانک اس کے پیر زمین کو چھو لیتے ہیں اور وہ خواب سے نکل کر حقیقت کی دنیا میں آجاتی ہے۔ دیکھتی ہے کہ بغل میں اس کی بچی سو رہی ہے۔ اسے سنگسار کرنے کے لئے بھیڑ کا جمع ہونا اور پتھر اکٹھا کرنا بھی محض خواب تھا۔

'اداس لمحوں کی خود کلامی' میں اعلیٰ فنکاری کے ساتھ ہم جنسیت کے موضوع کو پیش کیا گیا ہے۔ کہانی کے واقعات اس قدر گتھے ہوئے ہیں کہ کسی واقعے کو کہانی سے خارج نہیں کیا جا سکتا۔ ہر واقعہ آنے والے واقعے کے لئے زمین ہموار کرتا ہے۔ زینی کی ماں اور باپ دونوں نوکری کرتے تھے، ٹھیک سے بچی کی دیکھ بھال نہیں کر سکتے تھے اس لئے اسے اس کی نانی کی نگرانی میں بھیج دیتے ہیں۔ ماں عیسائی تھی، شادی کے بعد مسلمان ہو گئی تھی۔ نانی کے گھر میں آزادی کا ماحول تھا جو زینی کے لئے ناگوار تھا۔ اسے اپنے گھر کی پابندیاں بھی ناپسند تھیں۔ کچھ دنوں بعد اسے ایک خانگی فرم میں نوکری مل گئی۔ اس کے والد نے اسے مومنہ ورکنگ ہاسٹل میں شریک کرا دیا۔ اسے جو کمرہ دیا گیا تھا اس کے نصف حصے میں روبینہ علی نام کی خاتون اسی ادارے کے

کالج میں پڑھاتی تھیں۔ زینی نے اپنا سامان ترتیب دینے کے لئے نکالا، اس میں پنک پینتھر بھی تھا۔ جسے نانی نے اس کے لئے خریدا تھا جب وہ بچی تھی۔ رات کو کبھی اسے ڈر ہوتا تو وہ اس سے لپٹ جاتی۔ بڑی ہو جانے کے بعد بھی وہ اس کا رفیق بنا رہا اور وہ ہمیشہ اس کو ساتھ لے کر سوتی۔ روبینہ علی بھی پینتھر سے دلچسپی لینے لگی۔ زینی نے اسے بھی اپنے ساتھ لیٹنے کی دعوت دی۔ دونوں اس پر پاؤں ڈال کر لیٹا لیتے جس سے انھیں خاص لذت اور تسکین حاصل ہوتی۔ روبینہ علی نے ہاسٹل کی ساتھی شازیہ کو پینتھر سے واقف کرایا۔ رفتہ رفتہ بات پھیلی اور مختلف کمروں میں پینتھر آ گیا۔ پھر ایک دن زینی کو ہاسٹل سے یہ کہہ کر نکال دیا گیا کہ اس کی ماں عیسائی تھی۔ زینی نے رہنے کے لئے مکان خریدا، اپنی سہیلی آمنہ کو گھر میں رکھ لیا۔ پینتھر کو اسٹور روم میں رکھ دیا کہ اب اس کی ضرورت نہ تھی۔ زینی روبینہ علی سے ملنے ہاسٹل پہنچی۔ وہ چاہتی تھی کہ روبینہ علی بھی اس کے گھر میں منتقل ہو جائے۔ ہاسٹل میں اس کو بتایا جاتا ہے کہ روبینہ علی کا انتقال ہو گیا۔ روبینہ علی نیند کے لئے گولیاں کھاتی تھی۔ ایک رات اس نے زیادہ گولیاں کھالیں۔ زینی کو ہاسٹل کے گارڈ نے بتایا کہ روبینہ علی کی موت سے ہاسٹل کی بڑی بدنامی ہوئی۔ ہاسٹل میں رہنے والیوں پر سختی بڑھا دی گئی۔ جن کے کمروں میں پینتھر پائے گئے انھیں ہاسٹل سے نکال دیا گیا۔ زینی فاتحہ پڑھنے کے لئے گارڈ کے ساتھ ملحقہ قبرستان گئی۔ قبر کے قریب پہنچی تو اس کی آنکھیں اشک بار ہو گئیں۔ بے ساختہ اس کے منھ سے نکلا۔ کیسی ہو روبینہ' قبر خاموش رہی مرے ہوئے لوگ بھی کہیں بولا کرتے ہیں۔'' زینی نے فاتحہ پڑھا اور دھیرے سے بولی۔ ''روبینہ اب میں کسی ہاسٹل میں نہیں رہتی۔ میں نے اپنا گھر خرید لیا ہے..... میں تو تمھیں لینے آئی تھی تا کہ ہم ایک ساتھ رہ سکیں، تم نے اتنی جلدی کیوں کی، بولو! روبینہ، جواب دو'' ''قبر کو خاموش رہنا تھا، خاموش رہی'' یہ جملہ بڑا معنی خیز ہے اور اپنے اندر ایک الم ناک داستان سمیٹے ہوئے ہے۔ شائستہ فاخری کے اسلوب کی یہ خصوصیت ہے کہ وہ حسب موقع براہ راست اظہار سے گریز کرتے ہوئے ایما و اشارہ، کنایہ، تشبیہ و استعارہ اور مجاز مرسل کے پیرایوں سے کام لیتی ہیں۔ مثال کے طور پر بلا ترتیب چند جملے اور فقرے ملاحظہ کریں۔

''آپ کے نظام کا یہ کون سا کھیل ہے جس میں کھلاڑی کوئی اور ہوتا ہے، مداری کوئی اور بنتا ہے اور شکار کس کے ہاتھوں مارا جاتا ہے۔ یہ پتہ ہی نہیں چلتا۔'' (افسانہ: سنور قیہ باجی)

میں نے سلطانہ کے خواب نہ صرف اپنی آنکھوں میں سجائے بلکہ ایک قدم آگے بڑھ کر کھلے آسمان میں اڑنے کے لئے حوصلوں کے پنکھ بھی ان خوابوں میں جوڑ دئے۔'' (افسانہ: سنور قیہ باجی)

''اگر مشک کی خوشبو کو مٹھی میں باندھا جا سکتا ہے تو خواب بھی چرائے جا سکتے ہیں۔ (افسانہ: سنور قیہ باجی)

گود میں ہمکتے بچے کی خالی آنکھوں میں مائیں کاجل لگاتی ہیں مگر باجی نے سلطانہ کی سونی آنکھوں میں خواب سجا دئے۔ (افسانہ: سنور قیہ باجی)

اپنے کمرے کی کھڑکی کی سلاخوں کو پکڑے ہوئے میں سوچ رہی تھی کہ کل جیل کی سلاخیں تھی آج گھر کی سلاخیں ہیں۔ فرق اتنا ہے کہ جیل کی سلاخوں میں جسم تار تار ہوتا تھا اور گھر کی سلاخوں میں ذہن تار تار ہوتا ہے۔ سلاخیں بدل جانے سے تقدیر نہیں بدلا کرتی۔ (افسانہ: سنور قیہ باجی)

میرا ہاتھ حسب معمول بستر کے بغل کے حصّے پر پڑا جو خالی تھا۔ یہ مقام گذشتہ نو برسوں سے خالی ہی رہتا ہے۔۔۔۔ پھر میں نے اپنے ہاتھوں کو دیکھا جن پر جلتے ہوئے سگریٹ سے داغنے کے نشان اب بھی نمایاں تھے۔ (افسانہ: سنور قیہ باجی)

آمنہ بی کے دروازے پر اتنے برس بیت جانے کے بعد خوشیوں نے دستک دی تھی۔ اس کا بیٹا شادی کے لئے رضامند ہو گیا تھا۔ (افسانہ: آفندی کا بیٹا) ٹوٹی شاخ کی طرح جھکی ہوئی وہ اکیلی رہ گئی۔ کبھی شوہر کے لئے، کبھی بیٹے کے لئے۔۔۔ (افسانہ: آفندی کا بیٹا)

''قید ہوتے ہوئے بھی وہ خود کو آزاد محسوس کر رہی تھی۔ کیونکہ زندگی کا لگاؤ اپنی زنجیریں توڑ چکا تھا۔'' (افسانہ: خوف گنبد میں روشن آنکھیں)

سوکھی مریل سی بے رونق چہرے والی روبینہ علی ایسے کھل اٹھی جیسے تپتی دھوپ میں مرجھایا پودا بارش کی نرم پھواروں میں کھل اٹھتا ہے۔ (افسانہ: اداس لمحوں کی خودکلامی)

''تیزی سے گھر میں پرانے کلنڈر کی جگہ نیا کلنڈر لے لیتا اور حاشیے پر آتی میری زندگی سے حساب کتاب لینے کے لئے وقت تیار ہوتا رہا۔'' (افسانہ: چل گوئیاں سنگ بیٹھیں)

''سچ سے بچنے کے لئے سچ مچ میں نے آنکھیں بند کر لیں۔ مجھے وہ کبوتری یاد آ گئی جو بلّے کی شکل میں اپنی موت کو دیکھ کر آنکھیں بند کر لیتی ہے۔'' (افسانہ: چل گوئیاں سنگ بیٹھیں)

میری آنکھوں میں بے شمار آنسوؤں کا درد تھا۔

''ایک لمبی تنہائی کی آہ و بکا تھی۔ ایک ایسی بے بسی تھی جو چاقو کی دھار کے نیچے آئے ہوئے پرندے کی ہوتی ہے۔'' (افسانہ: چل گوئیاں سنگ بیٹھیں)

''اسے لگا جیسے وقت کا وہ پنکھ ٹوٹ رہا ہو جس پر وہ بیٹھی تھی۔ اس نے گھبرا کر جمال پاشا کی طرف ہاتھ بڑھایا۔ اس سے قبل کہ وہ اسکے پھیلے ہاتھ کو پکڑ پاتے ان کا ہاتھ چھوٹ گیا اور وہ ہوا میں جیسے تحلیل ہوتی ہوئی آسمان سے زمین پر آ گری ہو۔

اس نے دیکھا کہ وہ کانچ کی پتلی بن گئی ہے اور زمین پر گرتے ہی کانچ کی کرچی کرچی ہو کر بکھر گئی ہو۔ اماں بی ماتم کرتے ہوئے کانچ کی ان خون آلودہ کرچیوں کو بٹور رہی ہوں۔'' (افسانہ: صوفی آپا)

''اس نے خانقاہی کتابیں بند کیں اور زیست کی کتابیں کھول لیں۔'' (افسانہ: دو خطوں کی دنیا)

شائستہ فاخری کے فن کی نمایاں خوبی یہ ہے کہ وہ کردار و واقعات کا اپنے آس پاس کے ماحول سے انتخاب کرتی ہیں اور خاصی فنکارانہ نزاکت اور چابک دستی کے ساتھ اپنے کرداروں کے نفسیاتی، جنسی اور سماجی مسائل کا تجزیہ کرتی ہیں۔ وہ شکست و محرومی کو ہی اہمیت نہیں دیتی ہیں بلکہ ایسے حالات بھی پیش کرتی ہیں جو مسرت آمیز اور نشاط انگیز ہیں۔ ان کے اظہار بیان کی یہ آمیزش کہیں بہت تیکھی تو کہیں نرم ہے۔ ایک افسانہ نگار حقیقی زندگی میں متضاد عناصر یا خیر و شر کی آمیزش و آویزش سے کام لے کر ہی سچ کا اظہار کر سکتا ہے اور شائستہ فاخری نے بلا شبہ یہ کام اپنی فنی مہارت اور فکری بلندی کے باعث بڑی کامیابی سے کیا ہے۔ فکری رویوں کے تضادات کا ایک رخ ان اقتباسات میں مل سکتا ہے۔

''محض دو مہینے میں ایک سڑک حادثے نے اس کے جسم سے رنگین لباس چھین لیا۔ وہ اپنے باپ کی دہلیز پر واپس آ گئی۔'' (افسانہ: انگلیوں پر گنتی کا زمانہ)

''معاملہ اسکے بستر پر چادر لگانے کا ہو یا استعمال شدہ چادر کو بدلنے کا، وہ ہر کام میں چاک و چوبند تھا۔ ہاں یہ الگ بات ہے کہ انگنت ایسی راتیں بھی گزاری ہیں جب چادر بچھاتے اور چادر اٹھاتے وقت اس کا سویا ہوا ضمیر اسے جھنجھوڑ دیتا، اس پر لعنت بھیجتا، اسے اکساتا کہ وہ غفور ملک کو چھوڑ کر دور بھاگ جائے۔'' (افسانہ: انگلیوں پر گنتی کا زمانہ)

''کل ابو کے کھونٹے میں تھی تو غربت نے خاموش رکھا، آج غفور ملک کے کھونٹے میں ہوں تو عزت کے بھرم نے خاموش رکھا۔ اللہ پاک نے عورت کے نصیب میں کوئی تیسرا کھونٹا گاڑا ہی نہیں۔'' (افسانہ: انگلیوں پر گنتی کا زمانہ)

''شوہر کی پھسپھساتی آواز اس کے کان سے ٹکرائی۔ ' میں یہاں زمین خریدنے آیا تھا اور خرید کر لے بھی جا رہا ہوں۔ اب اپنی مرضی سے جیسا چاہوں گا، جب چاہوں گا اور جس طرح چاہوں گا، جوتوں گا۔''

(افسانہ: گلی کا دوسرا کنارہ)

''Old Age Home ایسا ہاسٹل ہے جہاں ٹوٹے خوابوں اور حوصلوں کے ایسے ڈوبتے منظر ہوتے ہیں جن میں داخل ہونے کے بعد دوبارہ عام زندگی میں لوٹنا مشکل ہو جاتا ہے مگر میرے لئے مشکل قطعی نہیں ہے۔''

(افسانہ: آخری پہر کا ڈوبتا منظر)

''آزر تو میرے لئے وہ ہری شاخ ہے جس پر میں بھٹکتے پرندے کی طرح تھک کر کچھ دیر کے لئے بیٹھ جاتی ہوں۔ جانتی ہوں یہ شاخ میری نہیں، یہ بھی جانتی ہوں کہ ہریالی میرا مقدر نہیں بن سکتی۔ کیا کروں کہ اب میں سوکھی ٹہنی سے اوب چکی ہوں، ہریالی چاہتی ہوں، طفیل کے پاس ہریالی نہیں۔'' (افسانہ: ٹھکانہ)

''مجھے اس سے ملنا تھا، جس سے ملنے کا خیال ہی مجھے گیلے کپڑے کی طرح نچوڑ دیتا تھا۔'' (افسانہ: ٹھکانہ)

''میں آزر کے خیال سے جلتی رہی، سلگتی رہی۔ سچائی یہ نہیں تھی کہ میں آزر کی زندگی سے جل رہی تھی۔ سچ یہ تھا میں اپنے ہی خیالوں میں سلگ رہی تھی۔ دھیمی آنچ پر پک رہی تھی اور پکانے کا کام کر رہا تھا طفیل۔'' (افسانہ: ٹھکانہ)

''دیکھنے میں ہی نہیں، برتنے میں بھی بہت اچھی ہے۔''

(افسانہ: ٹھکانہ)

''آندھی کی زد میں آئے سوکھے پتے کی طرح میری سوچ بے قابو ہو رہی تھی۔'' (افسانہ: ٹھکانہ)

علامتی اظہار کا کمال کہانی 'آزاد قیدی' میں نظر آتا ہے۔ بوڑھے میاں بیوی گھر کی اوپری منزل میں تنہا رہتے ہیں۔ بیٹے، بہو اور بچے نیچے رہتے ہیں۔ سب اپنی زندگی کے کاروبار میں مگن ہیں، بوڑھے ماں باپ سے انھیں کوئی سروکار نہیں۔ تنہائی میں بوڑھے ماں باپ کے دن کاٹے نہیں کٹتے۔ کبھی وہ اڑتے ہوئے پرندوں کے غولوں کو گننے لگتے۔ ایک بار بوڑھا سرد طویل خاموشی سے بیزار بیٹھا تھا کہ اچانک ایک کوّا اڑتا ہوا آ کر دریچے کے کگار پر بیٹھ جاتا ہے اور کرخت آواز میں شور مچانے لگتا ہے۔ بوڑھے کو جان لیوا خاموشی میں کوّے کی کرخت آواز ہی بھلی لگتی ہے۔ وہ اپنے آپ سے کہتا ہے۔ ''کتنا خوبصورت پرندہ ہے یہ، آواز میں کتنی مٹھاس ہے جیسے کوئی بچہ روتے روتے ماں کو دیکھ کر کھل کھلا اٹھتا ہو۔'' ایک بار مرد دیر تک کچھ کہتا رہا اور بیوی خاموش پڑی رہتی ہے۔ مرد کے استفسار پر وہ جواب دیتی ہے۔''

''میں سوچ رہی تھی کہ کوّا کیوں اڑ گیا کچھ دیر اور بیٹھ کر وہ دریچے پر بولتا رہتا تو اس کا کیا بگڑ جاتا، کتنی میٹھی آواز تھی اس کی، کیوں تھی نا!''

مرد جواب دیتا ہے۔

''ہاں تھی... بہت میٹھی تھی... شاید اپنے بچوں سے بھی زیادہ...''

شائستہ فاخری کہانی کی صناعت اور پلاٹ سازی کا خاص سلیقہ رکھتی ہیں۔ یہ سلیقہ ان کی تحریر کردہ ہر کہانی میں نظر آئے گا۔ مثال کے طور پر ان کی کہانی ''آخری پہر کا ڈوبتا منظر'' کو لیجئے۔ کہانی کا آغاز کسی درمیانی واقعے سے ہوتا ہے۔ کہانی کی واحد متکلم کی زبانی معلوم ہوتا ہے کہ وہ بیس پچیس روز پہلے اس جگہ آئی تھی اور یہاں کے ماحول سے مطابقت پیدا کرنے کے لئے کوشاں تھی۔ یہ کیا جگہ ہے۔ وہ یہاں کیوں آئی ہے۔ یہ سوالات قاری کے ذہن میں ابھرتے ہیں۔ آگے اس کی خود کلامی سے پتہ چلتا ہے کہ وہ اپنے بیٹے ارشد کی بد سلوکی کی وجہ سے اپنا گھر چھوڑ کر یہاں آ گئی تھی۔ ارشد پہلے تو ایسا نہ تھا، عورت کا ذائقہ زبان پر لگتے ہی اس کا رویہ بدل گیا۔ جس کی وجہ سے وہ گھر چھوڑ کر اس old age home میں آ گئی تھی۔ مسز آہوجا ان کی نگراں تھیں۔ کبھی وہ حکم دینے کے انداز میں باتیں کرتیں تو اسے اپنے مرحوم شوہر کی یاد آتی۔ جیسے جیسے ہم آگے بڑھتے ہیں کہانی کی ایک ایک گرہ کھلتی جاتی ہے۔ اس کا نام شاداب تھا، وہ ایک غریب گھرانے کی معمولی شکل و صورت کی عورت تھی۔ تاج نے اس سے نکاح کر لیا۔ دونوں نے مل کر سول لائنز میں عالیشان مکان بنوا لیا۔ تاج کے انتقال کے بعد ارشد، ماں کے بہت قریب آ گیا۔ دونوں دوستوں کی طرح رہنے

لگے۔ارشد کو ایک عیسائی لڑکی عینی سے محبت ہوگئی۔ ماں کی رضا مندی سے دونوں کی شادی ہوگئی۔ایک دن ارشد کے پاس فون آیا تو بے خیالی میں دستک دیئے بغیر ارشد کے کمرے میں داخل ہوکران کی خلوت میں مخل ہوگئی۔ارشد نے اس کا برا مانا اور تلخ لہجے میں ماں سے کہا کہ اسے آواز دے کر اندر آنا چاہئے تھا۔بیٹے کی محبت میں بہو کی حصہ داری نا قابل برداشت ہوگئی تو وہ چپکے سے گھر چھوڑ کر نکل گئی اور old age home میں شریک ہوگئی۔ایک دن وہ لان سے زمین کو کچن گارڈن بنانے کے لئے کھرپی سے کھود رہی تھی کہ اس نے ارشد کی آواز سنی جو''اماں'' کہہ کر اس سے مخاطب ہوتا ہے۔فرطِ محبت سے دونوں گلے ملتے ہیں۔یہاں پہنچ کر کہانی ایک نازک موڑ اختیار کر لیتی ہے۔شاداب اور مسز آہوجا کو مغالطہ ہوتا ہے کہ وہ ماں کو گھر لے جانے کے لئے آیا ہے۔وہ شاداب کا لگیج باندھ دیتی ہیں۔ارشد ماں کو گھر لے جانے کے لئے نہیں آیا تھا۔وہ مسز آہوجا کو الگ لے جا کر بات کرتا ہے اور اپنی مجبوری ظاہر کرتا ہے کہ وہ شاداب کو اپنے گھر میں کیوں نہیں رکھ سکتا۔ارشد اور مسز آہوجا میں سخت تکرار ہوتی ہے۔دونوں کی آوازیں شاداب کے کان میں پڑتی ہیں۔کہانی ان جملوں پر ختم ہوتی ہے۔''ڈوبتے منظر کا آخری پہر تھم گیا۔مسز آہوجہ دونوں ہاتھوں سے اپنا چہرہ ڈھانپے ہوئے تھی۔اور میں آہستہ قدموں سے اپنے ہاتھ میں کھرپی لئے اس زمین کی طرف بڑھ رہی تھی جہاں کام ابھی ادھورا تھا۔''

شائستہ فاخری کی کہانیوں کے اس سرسری جائزے کے ذریعے ان کے فن کے چند اہم اور نمایاں خصوصیات کی نشان دہی کی گئی ہے۔یہ خصوصیت ان کی فنکارانہ عظمت اور انفرادیت کی غماز ہیں۔اگر ان کا ادبی سفر اسی تن دہی اور دل چسپی سے جاری وساری رہا تو بہت جلد وہ ادبی دنیا میں اپنا ایک اعلیٰ اور منفرد مقام پیدا کرلیں گی۔

- بقیہ -

تیرے آسماں اور بھی ہیں

پڑھو عینی کو جہاں تاریخ، تہذیب، وقت سب خود ایک کردار ہو گئے ہیں۔مرد اور عورت تو بس ذریعہ ہیں، میڈیم ہیں۔گردشِ وقت، گردشِ زمانہ، زنانہ مردانہ میں تقسیم نہیں ہوتیں۔اس نے میری ان باتوں کو سنجیدگی سے لیا اس لیے کہ نہیں کہ میں ایک ادیب ہوں، پروفیسر ہوں۔اس لیے کہ میں اس سے بڑا ہوں۔اس کا چچا ہوں۔ایک فیصلہ کن لہجہ میں بولی۔۔۔بس یہ مسئلہ یہیں پر ختم اب میرے بچے بڑے ہو رہے ہیں۔مجھے اب ان کے بارے میں سوچنا ہے۔ان کی زندگی، ان کے مسائل، یہ سُن کر مجھے اچھا لگا۔مجھے افسانہ رقیہ باجی کے وہ جملے یاد آ گئے:

''سنو رقیہ باجی! اب میں خوابوں سے اوب گئی ہوں۔اب میں حقیقت میں جینا چاہتی ہوں۔میں ماضی کو بھول جانا چاہتی ہوں۔میں حال میں زندہ رہنا چاہتی ہوں۔ماضی نے تو زخم دیے ہیں اب آنے والا وقت ان پر مرہم رکھے گا۔۔۔اس کا مجھے یقین ہے۔۔۔''

یہ فیصلہ درست لیکن خوابوں سے مت اوبو شائستہ کہ امید و یقین کا جنم انہیں کے بطن سے ہوتا ہے کہ خواب دیکھنا انسان کا فطری عمل ہے اور خوابوں کا ٹوٹنا سماجی عمل۔تراشیدم، شکستم کا یہ سفر ازل سے جاری ہے اور ابد تک جاری رہے گا۔ایک فنکار، ایک افسانہ نگار بس اس میں تراش خراش ہی کر سکتا ہے اس سے زیادہ کیا۔

شائستہ! تمہارے قارئین وشائقین کو (جن میں میں بھی شامل ہوں) تمہاری دوسری باری کا شدت سے انتظار ہے۔عصمت، عینی آسمان سے نہیں اُتری تھیں۔اپنی غیر معمولی ریاضت، عبادت اور مرد و عورت سے بالاتر ہو کر انسانوں سے محبت کے ذریعہ آسمانِ ادب پر پہنچتی تھیں۔آج وہ ہمارے درمیان نہ سہی لیکن ان کے افسانے، ان کی آنکھیں زندہ ہیں اور زمین کی طرف دیکھ رہی ہیں کہ ان کے آدھے ادھورے خواب کون مکمل کرے گا۔خواب پورے ہوں یا نہ ہوں لیکن پورے ہونے کا سفر جاری رہنا چاہیے۔ان کے مکمل پن کا اضطراب برقرار رکھنا چاہیے۔تم سے زیادہ اس اضطراب کو کون سمجھے گا اس لیے کہ تمہاری زندگی مکمل اضطراب ہے۔لیکن یہ اضطراب ہی، یہ خواب ہی زندگی کی بدولت ہیں، نعمت ہیں، فکر وفن کو بھی۔۔۔اسے سنبھال کر رکھنا۔اسے سجانا، سنوارنا اور پورے خلوص و محبت سے تخلیق کے پیکر میں ڈھال دینا کہ تانیثی سے زیادہ ضرورت ہے انسانیت کی جو چہار طرف غیر انسانی ماحول میں گھری ہوئی ہے۔

☆

صندلی کہانی کشتی پر سوار

خورشید حیات

(بلاسپور، بھارت)

سوچ سمندر لہروں سے جو آوازیں ابھرتی ہیں، اُن کی کوئی سرحد نہیں ہوتی۔ ہر عہد کے اپنے تقاضے ہوتے ہیں اور ہر کہانی رنگ مٹی بدن کردار کی الگ الگ دھڑکن۔

دھڑکن جب عالمگیر ہوتی ہے تو آفاقی لفظی نظام کا حصہ بن جاتی ہے اور یہی دھڑکن جب شخصی اور خارجی زندگی کے حالات وکوائف، ریت گھروندے کو اہمیت دے کر تھرکتی ہے، تب اس کی جبلت متاثر ہوتی ہے۔ تخلیقی فنکار بیک وقت مختار بھی ہے اور مجبور بھی۔ مختار ہے کیوں کہ وہ جب چاہے ''رقیہ باجی'' کو داستانِ دل سنا سکتا ہے۔ مجبور کیونکہ آج بھی ''سواسیر گیہوں'' کا شنکر زندہ ہے، صوفی آپا!

Chaos سے، یا پھر یوں کہا جائے کہ عدم توازن سے کہانی شاہ راہ بنتی ہے، جس پر چل کر کہانی پسند قاری کو نیم کی ٹھنڈی چھاؤں کا احساس ہوتا ہے۔

تحریریں نیم کی پتّیاں

تحریریں شہد کی بہتی ہوئی نہریں۔

فطرت کی حریفانہ قوتوں سے کہانی کار کی جنگ جاری ہے کہ داخلی دنیا کی یہ جنگ خارجی دنیا کو ایک نیا حسن عطا کرتی ہے۔ پسماندگی جب نشتر چبھوتی ہے، انسانیت کے عروج کی گم ہوتی ہوئی داستان روشنی کی ضمانت بنتی ہے۔ تہذیب کے رستے ہوئے زخم، ٹوٹتی بکھرتی قدریں، سکڑتی ہوئی جڑیں، خوابیدہ نگاہیں، شبنمی آنچل، سوئے ہوئے شہر کی جاگتی ہوئی سڑک پر جب سہیلیوں کی طرح باتیں کرتی ہیں تب ہوتا یہ ہے کہ شائستہ کہانی، داستان کی دھانی رنگ چنیر یا اوڑھے، دائرہ شاہ اجمل کے مہمان خانہ/آئینہ خانہ سے جھانکتی نظر آتی ہے، اور کہانی ماٹی شائستہ فاخری ''حویلی'' کی سیڑھیوں سے اوپر چڑھتی دکھائی دیتی ہیں۔ اُف یہ داستان رنگ زندگی، کہانی فلک، اور کوہ رحمت!

صندلی بدن

خوشبو تھرکن

روحانی فضا

فاختہ من

گگن گگن

عَین عَین

اور ان نینوں میں تپتے ہوا صحرا میں، برف کی طرح پگھلتی زندگی میں، آنکھوں سے چشمے ابلتے ہیں کہ پاک دامن ماٹی کی شائستہ ہتھیلیوں نے ماءَ اَلورد کو سنبھالے رکھا ہے۔

اِس جہاں میں ایک ماں سے بہتر تمثال گر کون ہوسکتا ہے؟

بولو نا اربعہ عناصر!

کچھ تو بولو رزم و بزم............!!

خود کی تصریح میں کتنے موسموں سے روبہ رو ہوتی ہے یہ کہانی مائی!!!

زندگی بہت تیز رفتار سے آگے بڑھ رہی ہے کہ آج جو نیا دکھائی دیتا ہے، کل وہ پرانا ہوجاتا ہے، آدمی (؟) کا بصری، سمعی اور لمسی پیکر لامحدود ہوتا جارہا ہے۔ طبیعی توانائیوں کے ماخذ کے ٹکڑوں میں بٹنے کا عمل جاری ہے۔ ماورائے طبیعی دور کی آہٹ دور سے سنائی دے رہی ہے اور دوسری طرف وجود کی زنجیروں کو توڑ کر، حواس خمسہ پر عائد حد بندیوں سے باہر نکلنے کا عمل جاری ہے کہ تخلیقی لہریں کسی توازن کی محتاج نہیں ہوتیں۔ محسوسات کے دائرے سے جب یہ باہر نکلتی ہیں، سرمئی بادلوں کو بادلوں سے جدا کرتے ہوئے، برستی ہوئی بوندیاں بن، زمین کی پیاس بجھاتی ہیں اور شاید ایک نئی پیاس اُن کے نام لکھ بھی جاتی ہیں کہ یہی پیاس زندگی کی علامت ہے۔

داستان بدن کی پیاس بجھانے کے بعد بارش تھم سی گئی تھی، اور میں اُداس لمحوں کی خود کلامی سنتے ہوئے نکل پڑا تھا، دائرہ شاہ اجمل کی طرف اور پھر ہوا یہ کہ راستوں کے سارے سلسلے داستان سنانے لگے۔

صوفی رنگ

روحانی چہرے

سلسلۂ عالیہ، چشتیہ، نظامیہ اور......فاخریہ......!

خانقاہ اجمل کے مہمان خانہ میں جب پہنچا تو مجھے دکھائی دے رہے تھے، قمر جمیل، مشہور شاعر و نقاد ''دریافت'' کراچی کے مدیر اور ریڈیو پاکستان کے ریٹائرڈ ڈائریکٹر اقبال فریدی 'مصروف تھے، دادیہال اور نانیہال کے تمام داستانوں کی ریکارڈنگ میں، حجرے سے آوازیں آرہی تھیں۔ آوازیں صالحہ فریدی اور سید محمد زاہد میاں فاخری کی۔ میری اولادیں سات دروازے، سات کھڑکیاں اور ہم دونوں تھے اُن کے لئے سیڑھیاں! شاید اسی لئے شائستہ فاخری کی کہانیاں سیڑھیاں بن گئیں چوپال کا چبوترہ نہیں!!

ایسا کیوں ہوتا ہے کہ بعض چہرے جو بہت دور چلے جاتے ہیں، وہ ہمیشہ پرچھائیں کی طرح راہ حیات پر ساتھ ساتھ چلتے ہیں۔ خوابیدہ نگاہوں کو تھپکیاں دے کر سلانے کی کوششیں کرتے ہیں مگر بیدار ذہن نگاہیں جاگتی رہتی ہیں، آنکھوں میں نئے نئے خواب لئے کہ ہر خواب ہمیں تجربے کی جانب مائل کرتے ہیں۔

شائستہ فاخری کی کہانیوں کے فعال عناصر میں وہ سارے مشاہدات اور تجربات شامل ہیں جو انہیں پاک دامن بی بی کی لوریوں سے ملا۔ مسخ

شدہ کہانی چہروں کوسنوارنے اورتراشنے کا ہنر، کسی بھی کردار کوایک نئی قوت گویائی عطا کرنے کی ادا، انسانی وجود کواعلیٰ وارفع مرتبہ دینے کا ہنرایک ماں سے بہتر کسے آسکتا ہے؟

معلوم نہیں وہ کون ہے جو میرے اندر بولتا ہے، تنقید کی تخلیقی ساعتوں میں......

افسانہ مرد......کہانی عورت

تخلیقی تنقید کا یہ کونسا حیاتیاتی پہلو ہے جو مجھ سے ہولے سے بولے ہے۔ ابتداء میں افسانہ مرد اور کہانی عورت ایک تھے، پھر دو ہوئے اور شروع ہوا شناخت کا مسئلہ، اکائی کا دہائیوں میں بٹنے کا لامتناہی سلسلہ آج بھی جاری ہے کہ کاتب تقدیر نے دائیں اور بائیں پسلی کے نام دوریاں لکھ دی ہیں۔ تب سے لے کر آج تک یہ پسلیاں ریل کی پٹری کی طرح دوریاں مٹانے میں لگی ہیں۔ یہی دیوانگی اور جدا ہونے کی بے چینی ''کہانی عورت'' کو کائنات کی دھڑکنوں کا حصہ بنا دیتی ہے۔

اکائی۔ جدائی

جدائی۔ اکائی

آسمانوں اور زمین کی حدود سے نفوذ کر کے، چہچہاتی ہوئی روح جب جسم کے حصار سے باہر نکل کر نیلی فضاؤں میں پرواز کرنے لگی۔ ''اکائی'' سے باتیں ہونے لگی۔ انگنائی نے انگڑائی لی اور یکتارا بول اٹھا۔

''کسی کے حصے کا درد بانٹوں
کسی کے چہرے کا کرب لکھوں
کسی کے ماضی کا حال سوچوں
کسی کی آنکھوں کے خواب دیکھوں
کسی کے اندر نئے نئے سے جہان ڈھونڈوں
نئی سی دنیا، نئے نئے آسمان دیکھوں
سفر ہے لمبا، کہاں پہ ٹھہروں
کون بتائے، کدھر کو جاؤں؟''

(اُداس لمحوں کی خود کلامی)

زندگی ایک سفر ہے اور سفر زندگی کی علامت، نقطے اور دائرے کے اردگرد زعفرانی لباس میں بشری سفر اور اس سفر میں کبھی ''بصیر'' کی بصارت بن جاتا تو کبھی عصمت رہ کر سیاسی نروان حاصل کرنا۔ کبھی آنکھوں پر رنگین عینک لگا کر دنیا کو رنگین سمجھ لینا۔ کبھی خود کو ''یہ'' سمجھ لینا کبھی خود کو ''وہ'' سمجھ لینا۔ یہی سب کرتب دکھا رہا ہے آج کا آدمی (؟) اب ایسے ماحول میں کسی کے اندر نئے نئے جہاں کیسے دیکھوں، عظمت میاں! تم تو پھونکے ہوئے پانی کی بوتلوں کی قیمتیں ''احاطے'' کے باہر وصولتے رہے۔ صوفی آپا سب دیکھتیں، سمجھتیں مگر خاموش رہتیں۔ وہ حویلی کی خلوت سے تو کبھی حجرے کی کھڑکی کے لوہے کی سلاخوں کو مٹھیوں میں پکڑے اُن راستوں کو تاکتی جس کی منزل کھو گئی ہے۔

نقطے اور دائرے کے درمیان آنے والے ذی روح، نگاہوں میں اُگ آئے کیکٹس، معاشرے کی کڑوی سچائیاں، سبز استبرق لباس میں انسانی چہرے، شائستہ کہانیوں میں، کہانی عورت کی داستان سناتے ہیں۔

''سنور رقیہ باجی! اب میں خوابوں سے اوب گئی ہوں۔ اب میں حقیقت کی دنیا میں جینا چاہتی ہوں۔ میں ماضی کو بھول جانا چاہتی ہوں، میں حال میں زندہ رہنا چاہتی ہوں۔ ماضی نے تو زخم دیئے ہیں، اب آنے والا وقت ان پر مرہم رکھے گا، اس کا مجھے یقین ہے۔

رقیہ باجی! عورت کے وجود کی چیخ و کراہ اس کی روح کے الیے اس کے باطن کی ویرانی کو محسوس کرنے والا کون ہے؟'' (سنور رقیہ باجی)

شائستہ فاخری! تمہاری کہانیوں کو میں افسانہ پکار نہیں سکتا کہ تم فسوں سازی میں مہارت نہیں رکھتی۔ تم تو سیاہ قبا میں لپٹی ہوئی خاموش سی دکھائی دینے والی چٹان کی ہر پرت کو بولنا سکھاتی ہو کہانی مائی! لفظوں کو نئی زبان عطا کرنے کا ہنر تمہیں خوب آتا ہے شائستہ فاخری!

دورِ جدید میں افسانہ مرد کی نگاہوں میں اُگ آئے ببول کا ترجمان ہے۔ گواہ ہے ترقی کرتے ہوئے شہر کی جاگتی ہوئی سڑک......آوارہ کتّوں کو پکڑنے والی گاڑی جب آئی، بابا مائی! ہم سب کے بابا لوگ/ بابا مائی غیاث احمد گدّی......کلمہ گو نورالحسنین!

جانتے ہو کیا ہوا کتوں کو پکڑنے والی یہ گاڑی خالی لوٹ گئی۔ شہر کے سارے کتّے اپنے پریوار کے ساتھ جنگل کی طرف، پہاڑوں کی اوٹ میں چھپ گئے تھے۔ ڈر ستانے لگا تھا انہیں ترقی کرتے ہوئے شہر کی ہر بھوکی ننگی نگاہوں سے۔

جانتی ہو زرینہ بیگ! تم تو سب جانو ہو''آزاد قیدی'' کی بوڑھی عورت!

شہر میں اب کتے نہیں آوارہ آدمی بھونکتے ہیں۔ اپنی لمبی زبان باہر نکالے، رال ٹپکاتے، کاٹنے کو دوڑتے ہیں۔

''خوف گنبد میں روشن آنکھیں'' درویش کی بولتی ہیں۔
'تو' کو ڈھونڈوں، میں کو ڈھونڈوں، پاؤں تو، ہی تو
'تو' اور یہ اور میں سب دیکھوں لا میں تھے موجود۔

اور پھر عورت نے دیکھا کہ اس کا جسم ہوا میں تحلیل ہوتا ہوا ایک پرندہ بنا گیا۔''

لا سے الہٰ تک کا سفر، خوف و دہشت کی مٹی سے نکل کر کہانی پرندوں کے نئے احتجاج کا سفر، حکایتوں، قصّوں، داستانوں کی لمبی لمبی راتوں کے طلسماتی طویلہ سے کہانی عورت تک کا سفر کہ اس سفر کے ہر پڑاؤ میں کہانی نے فسوں سازی کی ساری لکیروں کے نقوش کو مٹا ڈالا ہے۔

روایتیں اور صورتیں یکساں نہیں رہتیں، ہر عہد میں ان میں نمایاں

تبدیلیاں رونما ہوتی رہتی ہیں۔

افسانہ اور کہانی جب ایک ہی وجود کا حصہ بنتے ہیں، تب میں انہیں بابا مائی پکارتا ہوں، آمنہ بی! تم تو جانو ہو، کہانی فلک کے بادشاہ کی نگاہوں میں کہانی حویلی کا اعتبار کس کے دم سے ہے۔

زندگی ایک شوخ سی، معصوم سی چنچل سہیلی کی طرح یہ کہنا چاہتی ہے کہ یہ صدی کہانی کی صدی ہے، اور یہ ناول کی بھی صدی ہے۔ آج نئی صدی میں کہانی بدن پر ایک ایسا Biochip لگا ہے جو زمین کی تنکنائیوں سے نکل کر روشنی کا پتا دیتی ہے۔ کہانیاں تخلیقی نثر کی پوشاک پہنے لفظوں کے اشارے پر جب شاہراہ پر چلتی ہیں تو شاعری کے قریب ہو جاتی ہیں اور میرا یہ ماننا ہے کہ ہر اعلیٰ تخلیقی نثر شاعری کے قریب ہوتی ہے۔

مجھے یہ کہنے دیجئے کہ شائستہ فاخری کے اشاروں پر کہانی حویلی کے کردار بارہ دری میں نہیں ٹہلتے، کہانی کردار کے اشاروں پر شائستہ فاخری نروان سے مہا نروان تک کا سفر بڑی خاموشی سے حروف کی زمین پر کرتی ہیں۔

''یہی سوچ کر وہ پہاڑی پر چڑھنے لگا۔ نروان سے مہا نروان کا سفر شروع ہو چکا تھا۔ پہاڑی پر پہنچ کر وہ مراقبے میں چلا گیا مہا گیان کی جھپکتی ہوئی آنکھیں پوری کھل گئیں۔ انتر دھیان میں سچا گیان پر گٹ ہوا۔ جو دکھائی دے رہا ہے وہ سچ نہیں ہے جو سچ ہے وہ پوشیدہ ہے اور جو پوشیدہ ہے وہی دائمی ہے۔''

(حرف حرف حساب کا دن)

شائستہ فاخری اپنی کہانی ''حرف حرف حساب کا دن'' میں صفات خلق لئے جب سامنے آتی ہیں تو وہ سدھارتھ سے گوتم اور گوتم بدھ سے گوتم نیلا مبر بننے کے عمل میں جو حدود نمایاں ہوئے تھے۔ حد نظر لکیروں، دائروں اور عارضی نظریوں کا جو دور دور تک سلسلہ قائم ہوتا چلا گیا تھا ان دائروں کو توڑتے ہوئے، لکیروں کو مٹاتے ہوئے کھلی اور آزاد فضا میں سانس لیتے ہوئے، سارے ارض کو ختم کرتے ہوئے، بورے میں بھری ہوئی بستی والوں کی نیکیوں کے نام ''منکے کے برابر بیری'' لکھ جاتی ہیں۔ اور تب ہوتا یہ ہے کہ خوف کے بے انتہا اندیشوں میں گھری آبادی بیدار ہونے لگتی ہے۔ جاگرتی اتنی آسان ہے تو جاگ کیوں نہیں جاتے اے سونے والو؟

شائستہ فاخری نے سندھی بیلا میں ۱۹۸۰ء کے آس پاس جب کہانی زمین پر قدم بڑھائے اور آسمان کی طرف ہاتھ پھیلایا تو وہ جاگتی چلی گئیں۔ شائستہ فاخری کی کہانیاں جاگتی ہوئی زندگی کا قصہ بیان کرتی ہیں۔

تریوینی کی موجوں سے کھیلنے والی شائستہ فاخری کو یہ معلوم ہے کہ لفظوں کے نظام پر کس کی حکومت ہے۔ نروان سے مہا نروان تک کے سفر میں وہ کیا چاہتا ہے۔

یشودھرا تم کہاں ہو، کیسی ہو۔ اور وہ تمہارا سدھارتھ؟؟

شائستہ فاخری کی کہانیوں کے کردار کی انگلیاں تھامے جب میں سفر کر رہا تھا تو زمین جاگ رہی تھی اور مچھلیاں سمندر کی ابھرتی ڈوبتی لہروں کی داستان سنا رہی تھیں۔

لفظوں کی گہرائی میں اتر کر نئی اور دائمی معنویت کی تلاش میں جٹی منگلا اور کہانی حویلی کی کھڑکی سے جھانکتی کُسم شاید مجھ سے یہ کہنا چاہ رہی تھی۔

پاک ہے وہ ذات\
جس نے قلم کو\
شائستہ کی انگلیوں میں\
پھنسا دیا\
اُس نے کہا......\
صندلی کہانی کشتی پر سوار ہو جاؤ\
اور وہ سوار ہو گئی\
ابھرتی ڈوبتی لہروں سے کھیلو\
اور وہ لہروں سے کھیلنے لگی\
تڑپتی اچھلتی مچھلیوں کی صدائیں سنو\
اور پھر ''کہانی عورت''!\
آزادئ فکر پر برستے ہوئے کوڑے کی آواز بن گئی۔

شائستہ فاخری کی کہانیاں ابھرتی ہوئی نئی تہذیب، اقدار و نظریات اور شکست و ریخت کی نئی نئی صورتوں کا استعارہ ہیں۔

شائستہ فاخری کی کہانی کائنات میں جو چہرے ہیں وہ خارجی دنیا کے 'کل' کا محض ایک جزو ہیں۔ مگر میں نے جب ان جزوی کہانی کرداروں سے، زندگانی کے رستہ ما چلت چلت، بات کرے، تب پتا چلس، ہر جزو میں کل دکھائی دے ہے۔ شائستہ فاخری کی کہانیاں حقانیت کے داخلی ارواح سے ہمارا مصافحہ کراتی ہیں۔

''مجھے تنہائی کا نا قابل برداشت عذاب اپنے قریب آتا محسوس ہوا۔''

''سنو'' میری تیز آواز نے اس کے بڑھتے قدموں کو روک دیا، تم جانتی ہو میں نے لوکی کھانے کی خواہش کیوں کی؟ (چل گوٹیاں سنگ بیٹھیں)

اچانک بیٹے نے کروٹ بدلی، تسبیح پر تیزی سے چلنے والی انگلیاں لمحے بھر کے لئے ٹھہر سی گئیں، کہیں آفندی کا بیٹا پیاسا نہ ہو مگر اگلے ہی لمحے وہ گہری نیند سو چکا تھا۔ آمنہ بی مطمئن ہو گئی۔ (آفندی کا بیٹا)

''اماں میں امن کا طلبگار تھا......امن اپنی شرطوں پر......کوئی بھی قربانی دے کر......''

دعاؤں کے بیچ جھولتی عورت کے مجروح مقدر کے ساتھ آمنہ بی ایک بار پھر نماز کی چوکی پر کھڑی ہو گئی۔'' (آفندی کا بیٹا)

''ہاں، ہاں! مجھے خوف ہے تو صرف اسی بات کا کہ آنے والی نسلیں کہیں رنگوں کی پہچان کھو کر کلر بلائنڈ نہ ہو جائیں۔'' (کلر بلائینڈ)

رات کی زلفیں جب دراز ہونے لگیں اور کہانی قاری کبھی نصرت جہاں کی انگلیاں تھامے تو کبھی سیاہ تارکول کی سڑک پر، روبینہ علی کے ململ کے دوپٹے

کومضبوطی سے پکڑ کرصوفی آپا کے مہمان خانہ میں پہنچا تو اُسے صرف اور صرف اک چادر دکھائی دی، بڑے بڑے معرکے جس چوکی پر ہوتے رہے، وہاں تہذیب کی اک چادر تھی۔ چہرہ کہاں کوئی دیکھ پایا؟ چہرہ کہاں کوئی پڑھ پاتا ہے، صنعتی دور کے مسائل کے درمیاں؟؟ اُف یہ داستاں رنگ زندگی اور کہانی رنگ چہرے......!

سیّدی

مرشدی

مرشدی

سیّدی......!!

صوفی آپا! تم دوسروں کو اطمینان اور سکون پہنچانے کی خاطر خود فکر و اضطراب کے بھنور میں کیوں جا گتی ہو؟

شاید تم ایک سڑک ہو یا پھر سڑک جیسی، جو ہر عہد کی تاریخ کی خاموش گواہ ہے اور جب یہ گونگی سڑک چیخنے اور چلاّنے لگے گی تو کیا ہوگا......؟ آج کی عورت بھی تو سڑک جیسی ہے، زندہ ہے روندے جانے کیلئے۔

شائستہ فاخری کو قدرت نے تخیّل کی بیش بہا دولت، بصیرت اور فراست سے نوازا ہے۔ حال کے پردے کو چاک کر کے مستقبل کا نظارہ دیکھنے کا ہنر انہیں خوب آتا ہے۔ جھبری کو نیم کے پیڑ پر جھولا جھولتے جب میں دیکھ رہا تھا تو میرے اندر کوئی بول رہا تھا۔

اے ری سکھی! شائستہ کہانی نیم کی پتّی جائسن

نہ ری سکھی! فاخری کہانی ٹھنڈی چھاؤں جائسن

کہانی جب ''اداس لمحوں کی خود کلامی'' بنتی ہے تو معتبر ہوئی جاتی ہے کہ اداس لمحوں میں، ٹوٹے بکھرے وجود میں اور پچھلے پہر کی دھوپ میں شب کی چاندنی بولتی ہے۔

چوپال کی قصہ گوئی سے داستان تک اور داستان سے کہانی سننے پڑھنے اور دیکھنے تک کے عمل میں کہانی زندگی رنگ تماشے کا کردار بنی تو کبھی تہذیب بدن پر اُگ آئے زخموں کے نشانات کی طرف اشارہ کرتی رہی۔ کہانی کبھی ایک ایسے آنگن کی تلاش میں بھٹکتی رہی جہاں دیواریں نہ ہوں، الگ الگ خیمے نہ ہوں، گھٹن اور تعفّن کے بغیر سانس لیا جاسکے اور لفظ پرندے کھلی اور آزاد فضا میں کہانی فلک پر نئی عبارتیں لکھ سکیں۔

شائستہ فاخری کی کہانیاں دو اور دو چار نہیں ہوتی، ان کے یہاں نئے عناصر کا انکشاف ہی تخلیقیت ہے۔

خواب خواب زندگی۔ قوسِ قزح تعبیر کہانیاں

''فریاد تو جج سنتا ہے، میرا کام تو یہاں کا انتظام دیکھنا ہے۔''

''آپ خواب واپس کر دیجئے میں آپ کو آزاد کردوں گا۔''

''آنکھوں میں سجے چند خوابوں کے ساتھ بے شمار آنسو ہوتے ہیں۔ آنسوؤں کی اپنی تاثیر ہوتی ہے۔ خوابوں کو نوچا نہیں جاسکتا۔'' (سنو رقیہ باجی)

سنو، کہانی بچّو! یہ تم نے کہانی دھاگوں کو مانجھ کر، زندگی کی پتنگ سے جوڑ کر، ڈور کو کہانی پسند قاری کے حوالے جب سے کیا ہے۔ صدائیں آرہی ہیں۔

اب ہمیں ثعلب مصری کی ضرورت نہیں۔ کہانی کی پھیلتی ہوئی جڑیں ہمارے وجود کا حصہ بنتی جارہی ہیں۔

کہانی کے آئینہ خانے میں الفاظ کے انفرادی پیکر جب اظہار کا ذریعہ بن گئے۔

''میں لکھتی ہوں، کیوں لکھتی ہوں؟ اس لئے کہ نہ لکھوں تو اسی طرح بوسیدہ ہو کر سیل جاؤں گی۔ جیسے گیلی مٹی کے اندر دبا زرد پتہ آہستہ آہستہ سیلتا ہوا مٹی میں ہی کھو جاتا ہے۔ لکھنا میری مجبوری ہے، نہ لکھوں تو ایک چیخ بن کر فضا میں تحلیل ہو جاؤں گی۔ بستر مرگ پر پڑے مریض کی آخری کراہ بن جاؤں گی۔ طوفانی ہواؤں کا شکار ہو کر اپنے ہی خمیر سے دور نکل جاؤں گی۔ لکھنا میرا شوق ہے، لکھنا میری ضرورت ہے اور لکھنا میرے لئے چیلنج ہے کہ دیکھو وقت گذر رہا ہے قرض اتارو......'' (میرا تخلیقی سفر)

اب میں کاسے تو سے کہوں صندلی کہانی کشتی پر سوار شائستہ فاخری!

تو سے اب میں کا بولوں؟

شاخ سے جدا ہو کر بھی یہ سوکھے زرد پتّے کسی غریب کے چولھے کا جلاون بن جاتے ہیں۔ اور جب یہ تیز بہتی ہوئی ہواؤں کے تھپیڑوں کو سہتے ہوئے زمین پر بکھرتے ہیں، نئے سنگیت کو جنم دینے کا سبب بنتے ہیں۔

ہر مٹی بدن کہانی زرد پتوں کی طرح ہوتی ہے۔ جس میں ایک نغمگی ہوتی ہے اور سوکھی ہوئی ٹہنیوں پر ساز ندے۔

اے لفظ پرندوں کی بے خوف اڑان!

دیکھو نا، اُگ آئی ہے نئی کونپلیں سوکھی ٹہنیوں پر، اور وہ پتّے جو سجدہ ریز تھے، پھر سے جی اٹھے ہیں۔

میں ابھی اتنا ہی لکھ پایا تھا کہ ''شائستہ کہانی درخت'' کی جڑوں سے آواز آئی۔

اے تخیّل کی دنیا میں اپنے قلم کے ساتھ نیلے آسمان پر اڑنے والی پری!

اُداس لمحوں کی خود کلامی میں

اداس لمحوں کے موسموں میں

جب نہ صبح اپنی ہوتی ہے اور نہ شام

رات کے تیسرے پہر کوئی جگا جاتا ہے؛

آنکھ سمندر لہروں سے آواز ابھرتی ہے......لکھ دو ان تحریروں کو خط لا متناہی کہ توازن ارتقاء کا دشمن ہے۔ عدم توازن سے ہی کہانی کامیاب ہوتی ہے۔

فرد اور رشتے میں اب توازن کہاں، کدھر؟

معاشرہ جب اندھے، بہرے قوانین کے شکنجے میں جکڑ جائے، قدریں ٹوٹنے بکھرنے لگیں، زندگی کے محاورے تیزی سے بدلنے لگیں، تمدن انتہائی تیز رفتاری

باقی صفحہ ۴۲ پر ملاحظہ کیجیے

''اُس کے اندر ایک سمندر''

ڈاکٹر رینو بہل
(چنڈی گڑھ، بھارت)

عورت وہ معمّا ہے جسے خود اُسے تخلیق کرنے والا خلاق خدا بھی مکمل طور سے جاننے کا دعویٰ نہیں کرسکتا۔ عورت کی تہہ در تہہ پوشیدہ نفس اور نبض کو صرف اور صرف عورت ہی جان اور سمجھ سکتی ہے۔ ''صدائے عندلیب بر شاخِ شب'' (ناول) کے ذریعے ڈاکٹر شائستہ فاخری نے یہ کام بڑی مہارت، ہمت، ایمانداری اور شائستگی سے کیا ہے۔ عورتوں کی نفسیات اور ذہنی کشمکش، اُس کی جسمانی ضروریات، پوشیدہ جسمانی کیفیات، مرد عورت کے باہمی رشتے، اُن رشتوں کی پیچیدگیاں، بند کمرے کی اَن سُنی کہانیاں، عورتوں پر ہونے والے ظلم و ستم، رسوائی یعنی کہ عورت کی زندگی سے جڑے ہر پہلو کو ڈاکٹر شائستہ فاخری نے بڑی چابکدستی سے اس ناول میں بیان کیا ہے۔ یہ کام ایک ماہر خاتون ادیبہ ہی کرسکتی تھی۔

''ہم عورتوں پر نیند اور غفلت کی ردا ڈالنے والے ہاتھ اگر ہٹ جائیں، ان کے جبر اور ہمارے صبر کا آہنگ اگر ٹوٹ جائے تو عورت وہ نہیں رہے گی جیسا سب اِسے دیکھنا چاہتے ہیں بلکہ وہ ہوگی جیسی وہ خود ہے اور جسے وہ پوشیدہ رکھنا چاہتی ہے۔''

''صدائے عندلیب بر شاخِ شب'' کے سرورق کے اندرونی فلیپ پر چھپی یہ وہ سطریں ہیں جنہیں پڑھ کر با ذوقِ قارئین اردو ادب کی معروف افسانہ نگار، ڈرامہ نگار، ناول نگار اور مترجم جو ہندی اور اردو زبان میں یکساں قدرت رکھنے والی اور دونوں زبانوں میں متواتر لکھنے والی ڈاکٹر شائستہ فاخری کے دوسرے ناول کو پڑھنے کو مچل اُٹھیں گے۔ اس ناول میں مختلف رنگ اور مختلف روپ میں عورت نظر آئے گی۔

شائستہ فاخری کا اصل نام شائستہ ناز ہے اور ۱۷ نومبر ۱۹۶۳ء کو سلطان پور (یوپی) میں محترم سید محمد زاہد فاخری کے گھر پیدا ہوئیں۔ اب تک اُن کے دو اردو کے اور تین ہندی کے افسانوی مجموعے منظرِ عام پر آچکے ہیں۔

اردو: (۱) ہرے زخم کی پہچان، (۲) اُداس لمحوں کی خود کلامی۔

ہندی: (۱) سندھی بیلا، (۲) دیہہ کا دُکھ، (۳) ہرے زخم کی پہچان۔

اردو کے ناول: (۱) نادیدہ بہاروں کے نشان، (۲) صدائے عندلیب بر شاخِ شب بھی طبع ہو چکے ہیں۔

اس کے علاوہ ریڈیو ڈرامہ ''حاشیے پر لکھی تحریر اور چوبیس زبانوں کی ہندوستان کہانیاں'' کے عنوان سے ترجمہ ''آج'' (پاکستان) کے ادبی کتابی سلسلہ شمارہ ۷۵ میں شائع ہو چکی ہیں۔ دو اردو ناول ''گوری سووے سیج پر'' اور ''سندر یلا کی واپسی'' زیرِ طبع ہیں۔ افسانوی مجموعہ ''لاحاصلی کے تعاقب میں'' اور ''شیشے کے آبلے'' (شعری مجموعہ) سے وہ شاعری کے میدان میں کُود پڑے گی۔ ان کی ادبی خدمات کے لیے اُنہیں بے شمار انعامات سے نوازا جا چکا ہے۔

''صدائے عندلیب بر شاخِ شب'' کا مرکزی کردار نازنین بانو ہے۔ جس کی زندگی کی کہانی اُس کی زبانی رواں دواں آگے بڑھتی ہے اور عورتوں کی نفسیات سے پردہ اُٹھتا جاتا ہے۔ دوسری اہم کردار ''ستارہ'' ہے جو پہلی بات سے ہی پہیلی بن کر اُبھرتی ہے اور نازنین بانو اُسے سمجھنے اور جاننے کے لیے شہر کی گندی بستیوں تک پہنچ جاتی ہے۔

ستارہ کا لُکا چھپا کردار قاری میں تجسس پیدا کرتا ہے اور ناول کے آخر میں جا کر یہ کردار کُھل کر سامنے آتا ہے۔ نازنین بانو اونچے طبقے سے اور ستارہ نیچے طبقے سے تعلق رکھتی ہیں اور دونوں طبقوں کی زندگیوں کا گہرا مشاہدہ کرنے کے بعد ہی سماج کے وہ حقیقی کردار ناول میں اُبھر کر سامنے آتے ہیں۔ گندی بستی کے لوگوں کی زندگیاں، اُن کے رسم و رواج، اُن عورتوں کے مسائل، اُن کی الجھنیں، اُن کی پریشانیاں، اُن کی خوشیاں، اُن کا کھان پان، اُن کا رہن سہن سب کو بڑی باریکی سے دیکھا اور پھر اُنہیں قلم بند کیا۔ شائستہ فاخری نے اس بات کا اعتراف کیا ہے کہ وہ ڈیڑھ سال اِن بستیوں میں گھومی اور کئی عورتوں سے اُن کی زندگی سے جڑے ہر پہلو کو جانا اور سمجھا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اس ناول کے سبھی کردار جیتے جاگتے ہمارے اردگرد گھومتے محسوس ہوتے ہیں۔

نازنین بانو کی زندگی میں آنے والا ہر مرد چاہے وہ اس کا باپ ہو یا شوہر اُسے خود غرض اور ظالم محسوس ہوتا ہے۔ بچپن میں ماں کے انتقال کے بعد والد نے سوتیلی ماں کو سر پر لا کر بٹھا دیا اور وہ دل میں اُن کے لیے غصہ اور نفرت پالتی رہی۔ جوان ہوتے ہی بنا اُس کی مرضی جانے کاشف اصغر سے اُسے منسوب کر دیا۔ دنیا کی ہر آسائش بنگلہ، گاڑی، نوکر چاکر اُس کے پاس تھی مگر دل میں نہ خوشی تھی، نہ چین و قرار، نہ محبت نہ سکون۔ پہلی ہی رات شوہر کی بے وفائی کا زخم تحفہ میں ملا تو اُس زخم کی تسکین کے لیے شہر کی گندی بستی میں بھٹکتی رہی۔ ستارہ جس کو جاننے اور ملنے کے لیے وہ ان بستیوں کی خاک چھانتی رہی، دراصل وہ عورت اُس سے پہلے اس کے شوہر کی زندگی میں آچکی تھی۔ نازنین بانو کا سفر گھر سے شروع ہو کر سماج سُدھارک اور پھر سیاسی دُنیا تک پہنچ جاتا ہے۔ غریب، لاچار، مجبور ستارہ کی زندگی بھی اُتنی ہی ادھوری اور دردناک ہے جتنی امیر خوش حال خاندان کی نازنین بانو کی۔ دونوں اپنے اپنے شوہر کی بے وفائی کا زخم کھا چکی ہیں۔ کاشف اصغر کا بھی بڑا ہاتھ ہے ستارہ کی بربادی میں اور وہ اپنا انتقام کاشف کو HIV کی نامُراد بیماری دے کر پورا کر لیتی ہے۔

ایک اور بہت اہم موضوع کو بھی اس ناول میں شامل کیا گیا ہے وہ ہے ''سری گیٹ مدر'' (Surrigate Mothe) کا۔ غریب، مجبور عورتیں

پیسے کی خاطر اپنی کوکھ کرائے پر دینے کو جسم فروش کرنے سے زیادہ بہتر سمجھتی ہیں اور وہ چاہتی ہیں کہ اُن کے اس عمل کو غیر قانونی نہ سمجھا جائے اور ایسے قانون کی اجازت ملنی چاہیے تا کہ وہ یہ کام چوری چھپے نہ کریں۔

''دیکھئے ہمارے اس عمل سے اگر لوگوں کے سُونے گھروں میں بچوں کی کلکاریاں گونج رہی ہیں تو اس کام میں کیا برائی ہے۔ اگر ہم اپنے کام سے لوگوں کے گھروں میں خوشیاں لاسکتے ہیں تو کہاں سے ہم دوسروں کی لعنت کا شکار ہوئے'' (ص۲۹۶)

عورتوں کی نفسیات سے پردہ اُٹھانے کا کام بھی بڑی خوبی سے کیا ہے۔عورتوں کے مطابق لکھتی ہیں:

''قدرت نے عورت کی تخلیق میں کتنے قسم کے رنگ بھر دیئے۔۔۔ کتنی خاموشی سے سب کچھ سہتی رہتی ہے اور جب سہتے سہتے آتش فشاں کی طرح پھٹنے کے قریب ہوتی ہے تو مرد کے چھینکے ہوئے چلو بھر ترحم کے پانی سے اپنی پوری آگ بجھا لیتی ہے۔ ایسی آگ جس میں پوری کائنات کو جھلسا دینے کی قوت ہوتی ہے وہ لمحے بھر میں ایسی ٹھنڈی ہو جاتی ہے جہاں چنگاری بھی نہیں سلگ سکتی'' (ص۳۴)

عورت کے بارے میں کتنا سچ لکھا ہے کہ:

''عورت کے اندر اتنی تہہ داری ہوتی ہے کہ اسے ایک بار میں نہیں کھولا جا سکتا۔'' (ص۳۵)

طلاق ایک ایسی صلیب ہے جو عورت کے سر پر ہمیشہ لٹکتی رہتی ہے۔ یاس اور اُمید کی تنگ پگڈنڈی پر تا عمر چلتی رہتی ہے۔ مصنفہ نے کس انداز میں اسے بیان کیا وہ قابل اقتباس ہے:

''طلاق دے کر مجھے بے گھر مت کرو۔ میری زندگی کو چورا ہے پر لا کر مت کھڑا کرو، میرے بدن کو سڑک کے کنارے سوکھا ناٹا ٹھوٹھ مت بناؤ کہ وہ ہر ایک کے لیے سلمھ شو چالے بن جائے'' (ص۱۶۸)

صرف عورتوں کی نفسیات ہی نہیں مردوں کی نفسیات پر بھی مصنفہ کی گہری نظر ہے۔ ذرا غور فرمائیے:

''مرد عورت کو پھول کی طرح توڑتا ہے اور گھاس کی طرح روند ڈالتا ہے مگر نہیں جانتا کہ عورت کی مٹی میں ناگ پھنی کی لمبی قطار بھی ہوتی ہے۔۔۔ یہی پیاس اُسے ایک کے بعد دوسری، دوسری کے بعد تیسری جگہ منہ مارنے پر مجبور کرتی ہے۔۔۔ تفریح کا سب سے آسان اور سستا ذریعہ ان کے لیے عورت کا بدن ہی ہوتا ہے۔'' (ص۱۵۰)

مرد چاہے کسی بھی کلاس کا ہو اُس کی فطرت ایک ہی ہوتی ہے۔ مرد خود چاہے کتنی ہی عورتوں سے تعلق رکھے مگر اُس کی بیوی پارسا، پاکیزہ ہونی چاہیے۔ اُس کا ماضی بھی صاف اور شفاف ہونا چاہیے۔ یہ ایک اور پہلو ہے اُن کی نفسیات کا۔ جس عورت کی پاکیزگی پہلے ہی ختم ہو چکی ہو اُسے شوہر کے ساتھ ہم بستری کرنے کا کوئی حق نہیں۔ وہ عورت اُس کے بچے کی ماں کیسے بن سکتی ہے جس کا رحم پہلے سے ہی داغ داغ ہو وہ کسی مرد کے قابل کیسے ہو سکتی ہے۔ عورت کا بے عصمت ہونا مرد کے لیے بڑا قابل شرم امر ہوتا ہے۔ عورت کو بے عصمت کرنے والے خود کو پارسا ثابت کرنے کے لیے تمام حدوں سے گزرنے کو تیار رہتے ہیں۔'' (ص۱۶۱)

''بیوی ملے تو فرسٹ ہینڈ مگر خود وہ کیا ہیں اور کتنے بستروں سے گزرے ہیں اس کا کوئی عذاب وہ اپنے اوپر نہیں اوڑھنا چاہتے۔'' (ص۱۷۷)

مرد کو کیا پسند ہے اور کیا چاہیے اس کے مطابق لکھتی ہیں کہ:

''بدن کی سوکھی ہڈیوں کو خریدنے کے لیے کوئی خریدار نہیں ملے گا لوگ ہڈی نہیں گوشت خریدتے ہیں۔۔'' (ص۱۹۴)

عورت اور مرد کے باہمی رشتے پر بھی مصنفہ نے کھل کر لکھا ہے:

''مرد کا عشق مرد کے لیے زندگی میں ایک الگ چیز ہوتی ہے جبکہ عورت کے لیے یہ پوری زندگی کا مسئلہ ہوتا ہے۔ عورت کے لیے عشق کا مطلب جسم اور روح کی مکمل سپردگی ہے۔۔۔ جبکہ مرد کے لیے عشق عورت کا عشق طلب کرنا ہے۔۔'' (ص۲۳-۲۲)

ایک جگہ لکھتی ہیں کہ:

''وہ ایک سڑک چھاپ چھچھورے لڑکے کی طرح مجھ سے باتیں کر رہا تھا اور میں بھی وہی کلمات ادا کر رہی تھی جو ایک فاحشہ بستر پر جانے سے پہلے بولتی ہے۔ سچ مچ عورت کے لیے شادی نہ صرف ایک باعزت بلکہ کم خطرے اور کم محنت آمیز پیشہ زندگی ہے۔'' (ص۱۷۴-۱۷۳)

مرد یہ کیوں نہیں سمجھتے کہ عورتیں اگر فاحشہ نہیں ہیں تو تحفے سے نہیں بلکہ مرد کی دلجوئی سے خوش ہوتی ہیں، پیار محبت کی باتوں سے خوش ہوتی ہیں، ناز نخرے اٹھوا کر خود کو عظمت کی بلندیوں پر بیٹھی محسوس کرتی ہیں۔ صدیوں سے مرد عورت کو برتتا چلا آ رہا ہے اور عورت کی اتنی سی نفسیات نہیں سمجھ پایا۔۔۔ عورت مرد کے رشتے کے داؤ پیچ کی کتنی قلابازیاں ہیں کتنے پیچیدگیاں ہیں اس کا اندازہ لگانا بھی مشکل ہے۔'' (ص۲۴۵)

ناول میں مصنفہ نے جذبات کی ترجمانی بھی خوب کی ہے۔

''ان پندرہ دنوں میں زندگی کا سارا عرق پی جانا چاہتی تھی۔ ریگستان سے اپنے جسم کو اس کے پیار کے آبشار سے شرابور کر دینا چاہتی تھی۔'' (ص۳۸)

عورتوں کی جنسی نفسیات جسے شاید عورت ہی سمجھ سکتی ہے اس پر بڑی جرأت سے کھل کر قلم اُٹھایا ہے۔

''پہلی رات لڑکی کن کن مرحلوں سے مرد کے ساتھ ہم بستر ہوتی ہے یہ ایک بیاہتا عورت ہی سمجھ سکتی ہے۔'' (ص۱۲۱)

مصنفہ نے اپنی بات کہنے کے لیے تشبیہات کا بھی کثرت سے بخوبی استعمال کیا ہے۔

''ایک طوائف کا قول کتنا سچ ہے کہ جو دروازہ ایک بار توڑ کر کھولا

جاتا ہےاس کو پھر بند نہیں کیا جاسکتا۔'' (ص۲۰۲)

''میں نے سنا تھا کہ عورت پیاز کے چھلکے کی طرح ہوتی ہے'' (ص۱۸۹)

''وہ ان عورتوں میں سے ہے جو مردوں کو ڈور سے باندھ کر پتنگ کی طرح اڑاتی ہیں۔'' (ص۲۳۸)

''میری چمکتی ہوئی جلد لوگوں کو ویسے ہی لبھاتی جیسے قصائی کو بھرے گوشت والی بکریاں۔'' (ص۱۶۸)

مصنفہ نے غریب جھونپڑی والوں کی زندگی کو بہت قریب سے دیکھا ہےاوراپنے مشاہدے کی ترجمانی بہترین طریقے سے کی ہے۔

''غریب جب خواب دیکھتے ہیں تو ان کی پرواز اتنی اونچی ہوتی ہے کہ سورج کی گرمی سے پنکھ جل اُٹھتے ہیں۔'' (ص۱۶)

''غربت زبان کی قوت کو بھی چھین لیتی ہے۔'' (ص۲۳)

نچلے اور متوسط طبقے کے فرق کو بھی واضح کرتی ہے:

''عصمت اور دوشیزگی ہمارے مڈل کلاس کا مسئلہ ہوتا ہے ورنہ عام طور پر نچلے طبقوں میں لڑکی کا جنس سے آشنا ہونا ایک سے دوسرا، دوسرے سے تیسرا یعنی کسی خاص مقصد یا نقطۂ نظر سے صرف بیکار وقت اور موجودہ موقع کا بہترین استعمال ہے۔'' (ص۲۰۲)

ناول پورا پڑھنے کے بعد بات صاف ہو جاتی ہے کہ شائستہ فاخری کو بلاشبہ Feminist قرار دے دیا جائے گا۔ ہوسکتا ہے کچھ حساس مردوں کی اَنا کو چوٹ پہنچے، کچھ اُن کی ہمت اور جرأت کی داد دے تو کچھ اُن کے خلاف مورچہ کھڑا کر دے۔ بہر حال اپنی زندگی کے تجربات اور گہرے مشاہدے کو بڑے فلسفیانہ اور دلچسپ انداز میں بیان کیا ہے۔

''جب تک کوئی چیز حاصل نہیں ہوتی، دسترس سے دور ہوتی ہے تبھی تک اُس کی کشش، اُس کی چاہت کھینچتی ہے۔ اسے حاصل کرنے کے لیے تلاش وجستجو پر اُکساتی رہتی ہے، مگر جیسے ہی وہ چیز حاصل ہو جاتی ہے اپنی قیمت، اپنا حُسن، اپنی چمک اور کشش کھو دیتی ہے۔'' (ص۱۹)

''لوگ سچ ہی کہتے ہیں طوائف بننے میں دماغی تربیت اور تہذیب کم سماجی ماحول اور برتاؤ زیادہ اثر انداز ہوتا ہے۔'' (ص۲۰۱)

کتنی خوبصورت بات کہی ہے:

''غم انسان سے انسان کا فرق مٹا دیتا ہے۔'' (ص۲۵۹)

''محبت اگر عورت کو کمزور بناتی ہے تو نفرت اسے فولادی بنا دیتی ہے۔'' (ص۱۷۱)

''جب پردے اُٹھ جاتے ہیں تو ہر منظر ننگا ہو جاتا ہے۔'' (ص۲۸۰)

مصنفہ نے اس ناول کے ذریعے عورتوں کے خلاف ہو رہے ظلم و ستم کے خلاف آواز اُٹھائی ہے۔ اُنہیں اُن کا جائز حق، عزت، وقار دلانے کی بھر پور کوشش کی ہے۔ عورت مختلف روپ اور رنگ میں اس ناول میں اُبھر کر سامنے آئی ہے۔ ناول کی زبان عام فہم، سلیس، سادہ اور دلچسپ ہے۔ زندگی کے تلخ حقائق پر مبنی ہے اور اس کا پلاٹ وسیع ہے۔ مختلف کردار کہانی کو آگے بڑھاتے ہیں اور ہر کردار اس معاشرے میں گھومتے پھرتے نظر آتے ہیں۔ تجسس کا عنصر آخر تک برقرار رہتا ہے۔

ناول کا کینوس تین سو دس صفحات تک پھیلا ہوا ہے۔ ضخیم ہونے کے باوجود قاری کو جکڑے رکھتا ہے۔ پورا ناول انیس ابواب میں تقسیم کیا گیا ہے اور ہر باب کو خوبصورت عنوان دیا گیا ہے۔ عنوان کے بعد باب کا آغاز بڑے خوبصورت انداز سے نظم یا نثر تحریر کر کے کیا ہے جسے پڑھتے ہی قاری کا دل پورا باب پڑھنے کو مچل اُٹھتا ہے۔

بطور قاری میں یہ بلاشبہ کہوں گی کہ شائستہ فاخری نے بڑی محنت اور دل سے اس ناول کو لکھا ہے۔ دل سے لکھی ہوئی بات یقینی طور پر قاری کے دل کو ضرور چھو جاتی ہے۔ البتہ کہیں کہیں وہ لکھتے لکھتے جذبات کی رَو میں بہہ جاتی ہیں۔ ایک دو جگہ بڑی بے باکی سے جنسی نفسیات کا ذکر کیا ہے جس کی تفصیل شاید کچھ لوگوں کو ناگوار بھی گزرے۔ مغربی ادب میں جس جذبے اور تفصیل کو کھلے دل اور دماغ سے قبول کیا جاتا ہے وہی اگر اردو کی خواتین افسانہ نگار یا ناول نگار بیان کرے تو اُنہیں دانشوروں کی پیشانی پر بل پڑ جاتے ہیں۔ یہ ہمارے معاشرے کا دوغلا پن ہے۔ یہ ایک Bold & Beautiful ناول ہے جسے ادب کی دنیا میں خوب پڑھا بھی جائے گا، پذیرائی بھی ہوگی اور تنقید نگاروں کا قلم بھی بول پڑے گا۔ ہندی اور اُردو زبان میں ڈاکٹر شائستہ فاخری کو یکساں قدرت حاصل ہے اور دونوں زبانوں میں وہ متواتر لکھ رہی ہیں۔ اللہ کرے اُن کا آئندہ ناول ''گوری سوئے سیج پر'' بھی اسی طرح پوری آب وتاب کے ساتھ ادب کی دنیا میں چھا جائے۔ (آمین)

خطرناک فٹ پاتھ

راستے بالعموم سفر میں آسانی کے لیے بنائے جاتے ہیں مگر کچھ راستے مسافروں کے چھکّے بھی چھڑا دیا کرتے ہیں۔ اسپین کے صوبے ملاگا میں واقع کمینیٹو ڈیل رے فٹ پاتھ کا شمار دنیا کے خطرناک راستوں میں کیا جاتا ہے۔ کمینیٹو ڈیل رے فٹ پاتھ چار ملین ڈالر کی تزئین و آرائش کے بعد عوام کے لیے کھول دیا گیا ہے۔ ایک سو دس سال پرانے اس فٹ پاتھ کی اونچائی ایک ہزار فٹ جبکہ چوڑائی تین فٹ دو انچ ہے۔ چار کلو میٹر طویل یہ فٹ پاتھ دریا کے اوپر سے گزر کر دو پاور پلانٹس کو آپس میں ملاتا ہے۔ پندرہ برس بعد کھلنے والے اس فٹ پاتھ پر جانے کے لیے روزانہ چھ سو سیاحوں کو ٹکٹ جاری کیے جاتے ہیں۔

نئے فکری افق کی تخلیقی سفر

چودھری ابن النصیر

(بھارت)

۱۹۸۰ء کے بعد اردو نظم میں جو نئی تبدیلی سامنے آئی ہے وہ اس سے قدرے مختلف ہے جو پچھلی صدی کی چھٹی دہائی کے آس پاس جدیدیت کے نام پر دیکھی گئی۔ اِس نسل کے نظم نگاروں نے اپنے منفرد موضوعاتی، لسانی اور اسلوبیاتی تجربات کے ذریعے شعری ادب میں فکری تموج اور فنی تنوع پیدا کرنے کی کامیاب کوشش کی۔ اور اس کے اثرات نئی صدی پر بھی واضح نظر آتے ہیں۔

شائستہ فاخری اِس صدی میں نظم نگار کے طور پر ابھر کر سامنے آنے والی ایک ایسی خاتون شاعرہ ہیں جن کے یہاں متنوع موضوعات نظر آتے ہیں۔ ان کی نظمیں سادگی میں پرکاری کا حسن لئے ہوئے ہیں۔ ان کی نگاہ ایسے ایسے معمولی معمولی سماجی واقعات میں بھی گہرائی تک اتر جاتی ہے جو عام انسانی آنکھ سے اکثر اوجھل رہتے ہیں اور یہ تجربہ جب نظم ہوتا ہے تو ان کے یہاں ایک ایسا شعری تجربہ جنم لیتا ہے جو ہمہ جہت بھی ہوتا ہے اور پر تاثیر بھی۔ اِس شعری حساسیت کے نمونے اپنے الگ الگ رنگ و آہنگ کے ساتھ ان کی نظموں میں دکھائی دیتے ہیں۔

شاعری کا آج تک کوئی ایسا ہمہ گیر نظریہ وجود میں نہیں آیا جو ہر طرح کی شاعری کا احاطہ کر سکے۔ بہر حال ایک متوازن و معتدل، مہذب و مقدس اور مضبوط و مربوط آہنگ والی شاعری اپنا آپ منوا لیتی ہے۔ نئی سوچ، نئی فکر اور مشاہدہ کی شاعری، نئے فکری حوالوں اور نئے طرزِ احساس کی شاعری اس وقت ہی پیدا ہوتی ہے جب تخلیقی وژن میں پختگی اور الفاظ کی ماہیت سے پوری باخبری ہو۔ شائستہ فاخری ایک ایسا نام ہے جو ان رویوں کی صحیح ترجمانی تو کرتی ہی ہیں ساتھ ہی ساتھ ان کا تخلیقی وژن اور فکری دائرہ اس قدر پھیلا ہوا ہے کہ ہم اسے کسی مخصوص نظریاتی چوکھٹے میں نہیں رکھ سکتے لیکن اتنا ضرور کہہ سکتا ہوں کہ ان کی نظمیں فکر کی بلندی، خیالات کی وسعت اور جذبات کی گہرائی کی امین ہیں۔

ان کی نظموں میں 'آنکھیں بند کرو' 'سجدوں سے بے زاری کیسی' 'نہ ختم ہونے والا انتظار' 'وجود کی بے سکونی' ایسی نظمیں ہیں جن کا لب ولہجہ آج کی شاعرانہ تہذیب سے پورے طور پر ہم آہنگ ہے۔ ان کی نظم 'بادل، بارش اور ہوا' ملاحظہ فرمائیں:

چاندنی راتوں کی سرد ہواہوں میں
تیری یادوں کی چنگاری سے دہک اٹھتی ہوں میں
سارے موسم یکجا ہو کر مجھ میں مہک اٹھتے ہیں
جز دانوں میں کرب و درد کی لہریں پھر سمٹ آتی ہیں
بے قرار جسموں میں روحیں تڑپ اٹھتی ہیں
ماضی کی بھولی بسری یادیں
وقت کی زلفوں میں الجھ جاتی ہیں
آنکھوں کی حیا، لبوں کی سرخی
جسم کے مساموں میں داخل ہو کر
لہو کی سیاہی میں پگھل اٹھتی ہے
چاندنی راتوں کی سرد ہواؤں میں
تیری یادوں کی چنگاری دہک اٹھتی ہے
سرد جھونکا ہواؤں کا میں
کاش! تیرا موسم، میرے موسم سے مل جائے
تو بادل بن جائے
اور میں بارش اور ہوا

میرے خیال سے شائستہ فاخری کی شاعری سادگی اور معصومیت کی شاعری ہے۔ ان کے یہاں خواب اور خاک کا رشتہ ان معنوں میں ابھر کر آتا ہے کہ زمین سے اس کا رشتہ کتنا ٹھوس اور اہم ہے۔ وہ اپنے زمانے کی فکری بلوغت کا ساتھ دے رہی ہیں۔ ان کی نظمیں کیفیتوں سے مملو ہیں۔ ہر نظم کوئی نہ کوئی ایسی کیفیت کو پیش کرتی ہے جو ہمارے ذہن کو لمحۂ فکریہ عطا کرتی ہے۔ ان کے یہاں رنگارنگ کیفیتوں کا ایک ایسا جہاں آباد ہے جو ہمیں بہت دور تک سوچنے پر مجبور کرتا ہے۔ 'غیر مشروط محبت' 'وہ کھوئے ہوئے لمحے' 'مجھے انتظار تھا جس کا' 'تمام راستے بند ہیں' ایسی مختلف النوع کیفیتوں کی نظمیں ہیں کہ ہم ان کا ایک دوسرے سے موضوعی مماثلت کر ہی نہیں سکتے۔ الگ الگ موضوع، الگ الگ خیال اور الگ الگ اپنا اظہاری رویہ۔ ان کی ایک نظم 'کوئی موسم رہے جاناں' ملاحظہ فرمائیں:

کوئی موسم رہے جاناں
مجھے اچھا نہیں لگتا
بنا تیرے کہیں جانا
کسی سے بات کرنا
ہر اک جانب
ہوائیں زہر اڑاتی ہیں
فضائیں درد دہراتی ہیں
یہ کیسا پیار ہے تیرا
کہ میرے ہونٹ اب تک نا آشنا ہیں
تیرے ہونٹوں کی محبت خیز گرمی سے
ترے جذبات پر پہرے
یہ کیسے ہیں

تری آنکھوں میں یخ بستہ
گھنیری بادلوں کی چھاؤں کیسی ہے
ترے چہرے کی رنگت میں
اداسی بولتی کیوں ہے
تری آنکھیں بھی زیادہ سوچتی کیوں ہیں
ترا لہجہ بہت دھیما یہ کیوں کر ہے
تری ہر گفتگو میں اک خنک آمیز تیور
ہے تو کیوں آخر
ترے رستوں پہ جتنی کرچیاں ہیں
ان کو پلکوں سے اٹھاؤں گی
تری دنیا بدل دوں گی
تری دنیا کو ایک اچھا نیا عنوان دینے کو
ترے رستے پہ کب سے میں کھڑی ہوں
اور کتنی دیر سے آنکھیں بچھائے ہوں
کہاں کھویا ہوا ہے تو
یہ پورا جسم تیرا ہے فقط تیرا
ترا مسکن، ترا منظر
دھڑکتے بولتے رنگوں کی دینا میں
چلے آؤ، چلے آؤ
کہ رستہ تکتے تکتے تھک چکی ہوں
تھک چکی ہوں میں

شائستہ فاخری کے یہاں موضوعات کی کمی نہیں۔انھوں نے تنہائی، زمانہ، خدا، بے بسی، شکست، محرومی، موت، پرندہ، خواب، دھوپ، ہوا، شام، رات مکان، سورج، رقص جیسی لفظیات کو استعاراتی اور علامتی معنویتیں دی ہیں جن سے موضوع میں وسعت اور فکر میں بالیدگی پیدا ہوئی ہے۔اس کے علاوہ انھوں نے کسی بھی علامت یا استعارہ کا استعمال صرف اپنی رسمی معنویت کو ظاہر کرنے کے لئے نہیں کیا ہے بلکہ ان کیفیتوں اور حساسیت کو نمایاں کرنے کے لئے کیا ہے جو صداقت کا اظہار یہ بن سکے۔صداقت کا اظہار برائے خود ایک صداقت ہے۔ان کے یہاں ایسی بھی علامتیں ہیں جو ایک پورے منظر کو جنم دیتی ہیں۔ یہ منظر پوری کائنات کو عورت کے وجود کا طلسم عطا کرتا ہے۔کبھی کبھی یہ منظر ایسے اسرار و رموز کو وا کرتا ہے جن کو دیکھ کر آنکھیں حیرت زدہ رہ جاتی ہیں۔ جہاں تک میں سمجھتا ہوں شائستہ فاخری اپنی نظموں میں جو جہان معنی تخلیق کرتی ہیں وہ ان کے وجود کے اثبات کی ایک صورت ہے اور جو انھیں زندگی کی بے معنویت اور جبریت کے کرب سے نجات بخشتا ہے۔ان کی شاعری کا لسانی پیکر اور اس کا تاثراتی منظر اور اس کی فضا کا ذائقہ نئے عہد کے تخلیقی وژن اور فکریات سے پوری طرح ہم آہنگ ہے۔انھوں نے اپنی شاعری میں جن لفظیات کا اظہار کیا ہے اور جس طرح نئی معنوی پیکر اور کیفیت سے مملو کیا ہے اس سے شائستہ فاخری کی شاعری کا اپنا تشخص قائم ہوتا ہے۔ان کی نظموں میں 'ہم کن آرزوؤں میں زندہ ہیں' 'مجھے وہ کہانی مل گئی' 'سب کچھ تیری مرضی سے ہے' 'سفر جاری رکھو' 'اپنا قصور کچھ بھی نہیں' 'وہ دنیا مجھے مل گئی' 'سارے رشتے جھوٹے ہے' 'رشتوں کے ساتھ جینا' 'سورج، رات اور درد' ایسی نظمیں ہیں جن میں شائستہ فاخری کا انفرادی لب و لہجہ نمایاں ہے۔ یہ وہ نظمیں ہیں جن سے شائستہ فاخری کا تجربہ تخیل اور فلسفے کی امتزاجی صورت میں سامنے آیا ہے۔ان کی ایک نظم 'اداس لمحوں کی خود کلامی' ملاحظہ فرمائیں:

اداس لمحوں کی رت میں جینا
ہے کوئی جینا؟
مگر جیے جا رہی ہوں برسوں سے ایسے عالم میں تن تنہا
کسے سناؤں
اداس لمحوں کا اپنا قصہ
اداس لمحوں کا اپنا نوحہ
نہ کوئی پرسان حال اپنا
نہ صبح اپنی، نہ شام اپنی
مگر ہے رات اپنی
بستروں پر اداس خوابوں کو جنم دیتی
جو آخر شب مجھے جگاتی
بہت رلاتی ہوئی اچانک
پروں سے اڑ کر چلی ہے جاتی
یہ سلسلہ ہے طویل تر اب
اداس لمحوں میں جی رہی ہوں
اسی لئے تو
کسی کے حصے کا درد بانٹوں
کسی کے چہرے کا کرب لکھوں
کسی کے ماضی کا حال سوچوں
کسی کی آنکھوں کے خواب دیکھوں
کسی کے اندر نئے نئے سے جہان ڈھونڈوں
نئی سی دنیا، نئے نئے آسمان دیکھوں
سفر ہے لمبا، کہاں پہ ٹھہروں
کوئی بتائے، کدھر کو جاؤں
میں قطرہ قطرہ ہر ایک پل زہر پی رہی ہوں
اداس لمحوں کی خود کلامی میں جی رہی ہوں

نئی صدی کی ایک دین یہ بھی ہے کہ نئے نظم نگاروں میں تخیل کی

لطافت اور اظہار کی تہ داری بھی پہلے کی بہ نسبت کئی درجے زیادہ ہے۔ آج کا نظم نگار اپنے خارجی حالات سے بے خبر نہیں وہ خارجی تجربات اور مشاہدات کو باطن کی آگ میں صیقل کر کے پیش کرتا ہے۔ شائستہ فاخری اس معاملے میں کچھ زیادہ ہی آگے نکلتی ہوئی نظر آتی ہیں۔ ان کے یہاں ہر نظم ایک باطنی تجربہ بن کر سامنے آتی ہے خواہ اس کا تعلق خارجی حالات سے ہو یا نفس انسانی کی اتھاہ گہرائیوں سے۔ انھوں نے جن تلخ تجربات کا ذائقہ چکھا ان کی تلخی بھی بیشتر نظموں میں صاف نظر آتی ہے لیکن اس کے اظہار کے لئے انھوں نے موزوں لفظیات اور اسلوب کا استعمال کیا ہے۔ اسلوب کے اس بدلے ہوئے انداز سے ان کی نظموں میں ابھرنے والے امیجز بالکل منفرد نوعیت کے نظر آتے ہیں۔ ان کی نظموں میں 'جیون بھٹکن' 'رقص مستانہ' 'زندگی کا سچ' 'خواب تماشا' 'میں اور میرا وجود' 'بے سمت سفر کا حاصل' 'پیالہ زہر کا' ''نئے عنوان کے ساتھ' ایسی نظمیں ہیں جو ان کے شعور وادراک کی موج ہیں اور اسلوب پر گرفت کی مظہر۔ ان کی ایک نظم 'لاحاصلی' ملاحظہ فرمائیں:

ترے وجود کی دنیا میں اتر کر
اپنی پہچان کرانے
کی تمنا میں
خود اذیتی میں مبتلا ہوں
اپنے ہونے نہ ہونے کی کشمکش میں زندہ
وقت کی دھارا کو اپنی گرفت میں لینے کا
مجھ میں یارا نہیں
قربت اور دوری کے تلخ پانیوں میں
میں بے جزیرے تعلق کی طرح
لاحاصل کشف میں گم
اپنے ہی اجنبی چہرے پر
سجائے ہوئے
کھوکھلی یادوں کے مکھوٹے
دنیا سے بھاگ رہی ہوں
میں کس طرف کو
کہاں جا رہی ہوں

ایک دوسری نظم 'میں اور میرا سایہ' دیکھیں۔

مجھے کرب ملا
تمھیں آزردگی
مجھے درد ملا
تمھیں افسردگی
مجھے صبر چاہئے
تمھیں بے چینی
مجھے لفظ کی تھی ضرورت
تمھیں معنی کی
دو سمتوں کے اس سفر میں
ہم ایک دوسرے کے ساتھ
چلتے رہے
ہاتھوں میں ہاتھ ڈالے
خود سے بے گانے
تمھارا ہاتھ میرے ہاتھ میں کب تھا
یہ تو مجھے بھی پتہ نہ چلا
میں جو پیچھے مڑ کر دیکھتی ہوں
وہاں کوئی نہ تھا
میں خود تھی
اور میرا سایہ تھا

مجھے یہ کہنے میں ذرا بھی عار نہیں کہ ادھر بیس برسوں میں اردو کی جو خواتین شاعرات ادب کے منظر نامے پر نمایاں ہوئی ہیں ان میں شائستہ فاخری کا نام ان معنوں میں اہم ہے کہ ان کی شاعری منفرد لب و لہجے، سنجیدہ فکری، پختہ اسلوب، نئی لفظی کیفیات اور تجربے کی حساسیت کی آئینہ دار ہے۔ نظموں میں خود انکشافی اور خود کلامی کا یہ تیور نیا تو ہے ساتھ ہی ساتھ ان کا نئے فکری افق کا تخلیقی سفر روز افزوں ترقی پذیر ہے۔

بقیہ: شائستہ فاخری کے افسانے

دہشت گردی کے موضوع پر لکھے گئے ایسے عمدہ افسانے ہیں جن میں کئی معنویتوں کا ایک نظام پوشیدہ ہے جو ہمارے لئے لمحہ فکریہ پیدا کرتا ہے۔ 'منگلا کی واپسی' ہماری آج کی سیاسی داؤ پیچ اور فریب کاریوں پر بھرپور طنز ہے۔ 'چل گوئیاں سنگ بیٹھیں' 'آخری پہر کا ڈوبتا منظر' بوڑھی ہوتی ہوئی نسل کا المیہ پیش کرتے ہیں۔ اس طرح ان کے دوسرے افسانوں میں 'اداس لمحوں کی خود کلامی' 'کنور فتح علی' اور 'ریچھ' ہمارے معاشرے کی ان تلخ حقائق کو سامنے لاتے ہیں جن کی سچائی سے ہم رو گردانی نہیں کر سکتے کیونکہ یہ معاشرے کے وہ سچ ہیں جن کو شائستہ فاخری آئینہ دکھا رہی ہیں۔

شائستہ فاخری کے فکری و فنی رویوں کو دیکھتے ہوئے میں بلا تکلف کہہ سکتا ہوں کہ اگر اسی رفتار، توجہ اور سنجیدگی سے افسانے لکھتی رہیں تو وہ ایک دن بلاشبہ بڑی افسانہ نگار بن سکتی ہیں کیونکہ ان کے اسلوب میں ایسی پختگی اور اظہار بیان میں ایسی خوبیاں ہیں جو دوسری معاصر لکھنے والیوں (چند ایک کو چھوڑ کر) سے ان کو اہم بناتی ہیں۔

صدائے عندلیب برشاخِ شب

(ناول کا ایک باب)

شائستہ فاخری

نئے ڈھانچے میں خود کو ڈھالنے کی ایک طرف میری کوشش جاری تھی دوسری طرف میں خود کو کسی بھی وقت ملنے والے ذہنی جھٹکے کے لئے تیار کر رہی تھی۔ مجھے ابی یا نیفو سے بات کئے ہوئے تقریباً مہینہ ہو چکا تھا۔ کشو نے ایک طرح سے مجھ سے ناطہ توڑ رکھا تھا، ہاں اتنا ضرور تھا کہ اس کی طرف سے بھیجے جا رہے پیسے میں کمی نہیں آئی تھی ورنہ مجھے معاشی تنگ دستی سے بھی گزرنا پڑسکتا تھا۔

صبح سے میں نکلی ہوئی تھی۔ ایک پرائیویٹ اسکول میں انٹرویو تھا۔ بہت بھیڑ تھی۔ یوں تو میں دس بجے وہاں پہنچ گئی تھی مگر میرا نمبر ڈھائی بجے آیا۔ انٹرویو دینے کے لئے اندر گئی۔ نہ اچھی تعلیم، نہ ٹریننگ، نہ کوئی ڈپلومہ۔ میرا انٹرویو لینے والی خاتون حیران ہوئیں کہ انٹر پاس لڑکی آٹھویں درجے کے بچوں کو کیسے پڑھا سکتی ہے۔ چند رسمی بات چیت کے بعد انہوں نے مجھے واپس بھیج دیا۔ ان کے چہرے کا رنگ دیکھ کر مجھے اندازہ ہو گیا کہ یہاں کوئی امید قائم کرنا بیکار ہے۔ یہ میرا پہلا اور آخری انٹرویو ثابت ہوا کیوں کہ اب میں نے اپنی توجہ نرس ٹریننگ حاصل کرنے پر مرکوز کر دی تھی۔

دن بھر کی بھاگ دوڑ سے تھکی ہاری میں چار بجے گھر لوٹ سکی۔ نہا دھو کر دن کا کھانا کھایا اور بے سدھ ہو کر بستر پر گر پڑی۔ اتنی گہری نیند آئی کہ نہ وقت عصر کا پتہ چلا نہ مغرب کی نماز ہوئی۔ رات کے آٹھ بج گئے۔ ملازمہ رات کا کھانا بنانے کے لئے آ چکی تھی۔ میرے کمرے میں اندھیرا تھا اور میں گہری نیند سوئی ہوئی تھی۔ اچانک ملازمہ نے میرے کندھے پکڑ کر زور زور سے ہلائے۔'' اٹھئے بی بی جی، اٹھیے---آپ کا فون آیا ہے۔'' میں نے نیند میں ہی جواب دیا---'' کہہ دو میں سو رہی ہوں۔''

مجھے معلوم تھا ایسا کوئی فون نہ ہوگا جس کا مجھے انتظار ہے اور فالتو فون کے لئے میں اپنی نیند نہیں خراب کرنا چاہتی۔ ''بی بی جی اٹھیے! صاحب لائن پر ہیں۔''

''صاحب----کون صاحب-----۔'' اب میں چونکی تھی اور میں نے پوری آنکھیں کھول کر ملازمہ کی طرف دیکھا۔

کچھ حد تک اسے میرے حالات کا پتہ تھا۔ اس کی آنکھوں میں خوف اترا ہوا تھا وہ انگلی سے موبائل کی طرف اشارہ کر رہی تھی اور سمجھانا چاہتی تھی کہ اس کے ریسیو کئے ہوئے فون کے دوسری طرف جو ہے وہ میری بات سن رہا ہے اس نے ہونٹ دباتے ہوئے موبائل میری طرف بڑھایا۔''لیجئے بات کیجئے! مالک لائن پر ہیں۔''

''ہیلو!'' میں نے جھٹ سے فون ریسیو کیا۔

''ہیلو جان! طبیعت تو ٹھیک ہے۔ بے وقت کیوں سو رہی ہو؟''

مجھے اپنے کان پر یقین نہیں آیا میں تیزی سے اٹھ کر بیٹھ گئی ملازمہ کمرے کی لائٹ جلا کر جا چکی تھی۔

تم کشو تم.....ارے.....آپ.....آپ ہیں......السلام علیکم۔''

''وعلیکم السلام...کیا حال چال ہیں۔''

''آپ کیسے ہیں؟'' میری آواز رندھ چکی تھی اور گلا پھنس رہا تھا۔

''ارے...ارے..... یہ تمھاری آواز کو کیا ہو رہا ہے۔ گلا کیوں پھنس رہا ہے۔''

میں برداشت نہیں کر سکی اور پھپھک کر رو اٹھی۔ اتنے دنوں میں میں نے اپنے کو سمیٹ کر جینے کی جو کوشش شروع کی تھی وہ بھر بھری مٹی کی طرح ڈھے گئی۔ اگر کشو پاس ہوتا تو میں اس کے قدموں میں گڑگڑا کر اس سے معافی مانگتی۔ اس سے کہتی مجھے اپنے گھر کی داسی بنی رہنے دو۔ طلاق دیکر مجھے بے گھر مت کرو۔ میری زندگی کو چوراہے پر لا کر مت کھڑا کرو، میرے بدن کو سڑک کے کنارے کا سوکھا ناٹا ٹھوٹھ مت بناؤ کہ وہ ہر ایک کے لئے سُلبھ شوچالے بن جائے۔ بیتے دنو ں میں جو ذہنی تکلیفیں اٹھائیں تھیں، اس نے مجھے توڑ کر رکھ دیا تھا۔

لوگوں کی نگاہوں، لوگوں کی پھبتیوں، آڑے ترچھے اشارے.... اُف...ایک عورت کو مردوں کی دنیا میں قطرہ قطرہ کتنا زہر پینا پڑتا ہے۔ شو کی طرح وہ سارا زہر پیتی ہے مگر پی کر اپنے وجود کا حصہ نہیں بننے دیتی۔ زہر کے مادے کو اپنے اندر نہیں اتارتی۔ زہر پیتے پیتے نیل کنٹھ کی طرح آدھا حصہ نیلا پڑ جاتا ہے باقی آدھا حصہ وہ عورت اپنے مرد کے لئے بچا کر رکھتی ہے۔

ان دنوں میں نے گاڑی سے باہر نکلنا بند کر دیا تھا۔ دو چار سوتی سادے کپڑے سلوا لئے تھے، ان کو ہی پہن کر باہر نکلتی۔ کان کے ٹاپس، ہار، سونے کی انگوٹھیاں سب میں نے اتار کر رکھ دئے تھے۔ ناخن پر نیل پالش نہیں لگاتی، نہ آنکھوں میں کاجل، نہ ہونٹوں پر لپسٹک تا کہ لوگ مجھے ایک معمولی عورت ہی سمجھیں۔ ان سب کے باوجود میری چمکتی ہوئی جلد مردوں کو ویسے ہی لبھاتی جیسے قصائی کو بھرے گوشت والی بکریاں۔

میں سسک سسک کر رو رہی تھی اور دوسری طرف کشو بالکل خاموش رہ کر مری رلائی کو سن رہا تھا۔ میں بیتے دنوں میں اٹھائی ذلتوں کو یاد کر کے روتی جا رہی تھی اور بھول گئی کہ لائن پر کشو ہے۔

مجھے لگا، کہیں لائن کٹ تو نہیں گئی ہے کیوں کہ کشو نے اس درمیان مکمل خاموشی اختیار کر رکھی تھی۔

''ہیلو؟''میں نے اپنے آپ کو سنبھالا۔

''رو چکیں میری جان۔ خوب رو لو۔ پاس ہوتا تو اپنے شانے تمہاری طرف بڑھا دیتا کہ جتنا رونا ہے آج رو لو پھر کبھی میں تمہاری آنکھوں میں آنسو نہیں دیکھنا چاہتا۔''

اچانک مجھے محسوس ہوا کمرے میں تیز روشنی پھیل گئی ہے۔ آسمان سے چاند تارے اتر کر میرے کمرے میں آگئے ہیں کمرے کی اداسی دور ہو چکی ہے۔ لگتا تھا جیسے درو دیوار گن گنا رہے ہوں۔ پورا کمرہ مجھے خوشیوں میں جھومتا سا لگا۔

کشو مجھے طلاق نہیں دے گا۔ وہ مجھ سے اپنی بیوی ہونے کا حق نہیں چھینے گا۔ مجھے چھوٹی موٹی نوکری کے لئے در در بھٹکنا نہیں پڑے گا۔ اسپتالوں کے چکر کاٹنے نہیں ہوں گے۔ الزبیتھ جیسی عورت کی چاپلوسی نہیں کرنی ہوگی۔ میری زبان سے بے ساختہ نکلا۔

''کشو تم ہمارے ہی رہو گے نا!''

مجھے فون لائن پر کشو کا ایک زوردار قہقہہ سنائی دیا۔۔۔''پگلی! تُو تو میری نکاحی بیوی ہے۔''

''تم مجھے نہیں چھوڑو گے نا!''

''نادان!'' کشو کی آواز آئی۔

''تم نے مجھے معاف کر دیا نا۔''

''جانو معافی تم کیوں مانگتی ہو۔ معافی تو انہیں مانگنی چاہئے جنہوں نے گناہ کیا ہے، تم کیوں اپنے کو ہلکان کر رہی ہو۔''

''سچی!'' میں بچوں کی طرح خوشی سے چہک اٹھی۔

''یار دوسروں کی خاطر ہم لوگ کیوں اپنی گھریلو زندگی برباد کریں۔''

''ٹھیک، بالکل ٹھیک'' میں اس وقت ایک ننھی بچی کی طرح باتیں کر رہی تھی۔

اس کی آواز پھر سنائی دی۔۔۔''غلطی نیفو کی ہے تو نیفو بھگتے، ہم لوگ کیوں؟ پہلے مجھے لگا تھا کہ ہمارے اور راشد کے بھائی شاہد مرزا کے بیچ جس تجارت کی ڈیل ہوئی تھی وہ خطرہ میں پڑ گئی ہے۔ کروڑوں روپوں کا نقصان ہو جاتا۔ مگر میرا دوست سمجھدار تھا۔ ہم دونوں نے مل کر باتیں کیں، بہت باتیں ہوئیں تجارت کی بھی اور گھریلو رشتوں پر بھی۔ میں تمہیں سب بتاؤں گا تم سنو گی تو حیران ہو جاؤ گی۔''

''تو بتایئے!'' میں مچل گئی۔

اس کی آواز پھر آئی۔''تم ابھی سو کر اٹھی ہو۔ پہلے نہا لو۔ کھانا کھا کر تازی ہوا میں تھوڑی چہل قدمی کر لو پھر میں ہندوستانی وقت کے مطابق دس بجے فون کروں گا۔ تب تک تم اپنے سارے کاموں سے فارغ ہو جانا۔''

''ٹھیک ہے، ٹھیک ہے۔'' میں نے چہکتے ہوئے کہا۔

اس نے فون لائن کاٹ دی اور میں جھٹ شکرانے کی نماز پڑھنے کے لئے نماز کی چوکی پر کھڑی ہو گئی۔

ملازمہ نے میرے بدلے ہوئے موڈ کو دیکھا تو وہ بھی خوش ہو گئی۔ اس نے جھٹ پٹ میری پسند کے کھانے بنانے شروع کر دئے۔ آٹھ بجے تک عشا کی نماز پڑھ کر میں نے کھانا کھا لیا۔ میری نگاہیں ہر تھوڑی دیر کے بعد گھڑی کی سوئیوں کی طرف اٹھتیں اور بار بار مجھے شک ہوتا کہ گھڑی بند ہو چکی ہے۔ ٹی وی چلاتی اور ٹائم چیک کرتی اور مطمئن ہو جاتی۔ ابھی دس بجنے میں ایک گھنٹہ باقی تھا۔ میں لان میں آکر چہل قدمی کرنے لگی۔ ملازمہ جا چکی تھی اور گڈو بھی رات کا کھانا کھا کر اپنے کواٹر میں چلا گیا تھا۔

کشو کی محبت کی دیوانگی یا اپنی زندگی پھر سے سنور جانے کی خوشی تھی کہ میرا دل چہل قدمی کرنے میں نہیں لگا اور میں واپس اپنے کمرے میں آگئی۔ میں کچھ کچھ سوچتی جا رہی تھی اور وقت گزارنے کیلئے کچھ کچھ کرتی جا رہی تھی۔ میں نے بیڈ کی چادر بدلی، تکیہ کا کور بدلا، ڈریسنگ ٹیبل کو پھر سے جھاڑ پونچھ کر اس پر ترتیب سے اپنی سنگار کی چیزیں رکھیں۔ جن میں کاجل، لپ سٹک، ٹیلکم پاؤڈر، آئی شیڈ، مختلف رنگوں کے نیل پالش، فیس پاؤڈر، مساج کریم، اسکرب، فیس واش اور باڈی کریم کے علاوہ نہ جانے کتنی اشیا تھیں جنہیں میں نے ڈریسنگ ٹیبل سے ہٹا کر کنارے رکھ دیا تھا۔ ڈریسنگ ٹیبل کے ایک کونے میں پرفیوم، ڈیوڈورینٹ کی بوتل بھی رکھی۔ روم فریشنر لے کر سارے کمرے میں اسپرے کیا۔ گلدان سے دو تین دن کے باسی پھول نکال کر ڈسٹ بن میں ڈالا اب رات میں تازے پھول تو توڑ نہیں سکتی تھی۔ خالی گلدان اچھا نہیں لگ رہا تھا میں نے اسے بیڈ کے نیچے ڈال دیا۔ پورے کمرے پر ایک گہری نظر ڈالی۔ بکھرے ہوئے اخبار کے ڈھیر کو میں نے کمرے سے باہر نکال دیا اب میرا کمرہ پوری طرح سنورا ہوا لگ رہا تھا۔ کچھ گھنٹے پہلی کی بے ترتیبی کا کوئی نام و نشان نہیں تھا۔ مہکتا ہوا صاف ستھرا کمرا۔ میں نے گھڑی پر نگاہ ڈالی رات کے نو بج کر پینتالیس منٹ۔ پندرہ منٹ ابھی باقی ہیں۔ میں نے ڈریسنگ ٹیبل کے قریب جا کر اپنے اوپر نگاہ ڈالی۔ سوکھے پپڑی پڑے ہونٹ، کاجل سے خالی مگر چمکتی آنکھیں، بکھرے بال، بڑھی ہوئی بھوئیں، کریم کے بغیر بے رونق خشک چہرہ، سادہ سا شلوار کرتا۔ نہ کانوں میں ٹاپس، نہ گلے میں ڈھائی تولے کی چمکتی ہوئی سونے کی زنجیر، ہاتھ کی انگلیاں خالی تھیں جن میں ہمیشہ فیروزے کی ایک بڑی سی انگوٹھی بجی رہتی تھی۔ پکھراج اور نیلم میرے اسٹار کے حساب سے سوٹ کرنے والے نگ تھے، اس لئے میں ان دونوں کو بھی ہمیشہ پہنے رہتی تھی وہ بھی اب انگلیوں میں نہیں تھے۔ کشو کی انگیج مینٹ میں دی ہوئی ہیرے کی انگوٹھی بھی انگلیوں سے اتری ہوئی تھی۔ مجھے انگوٹھیوں کا شوق تھا۔ چھ سات انگوٹھی میں ہمیشہ پہنے رہتی تھی اگر کہیں جلسے وغیرہ میں جاتی تو انگشت پہننا نہیں بھولتی تھی۔ نورتنوں سے جڑا ہوا بڑا سا انگشت۔ اس وقت میں کتنی سونی سونی سی لگ رہی تھی۔ میں نے جھٹ جویلری باکس اٹھایا اور ایک ایک

کر کے وہ سارے زیور پہن لئے جو میری شخصیت کی پہچان بنے ہوئے تھے۔ ڈھائی تولے کے ہار میں لٹکتا ہوا بڑا سا لاکیٹ جن پر ڈائمنڈ کی چھوٹی چھوٹی کنیاں سے کاشف لکھا ہوا تھا۔ یہ سارے وہ تحفے تھے جو کشو وقتاً فوقتاً مجھے دیتا رہتا تھا۔

میں نے گھڑی پر پھر نگاہ ڈالی۔ دس بجنے میں صرف دو منٹ بچے تھے۔ میں پھر سے آئینے کے سامنے آ کر کھڑی ہوگئی۔ ہلکی لپ سٹک، گہرا کاجل اور فیس پاؤڈر کے ہلکے سے پف کو میں نے اپنے چہرے پر گھمایا۔ بغیر کسی میچ کے ڈھیروں کانچ کی چوڑیاں اور بیچ بیچ میں گولڈ کے کڑے کلائی میں ڈالے جنہیں کچھ وقت پہلے میں نے بے رحمی سے نوچ کر اپنے سے الگ کر دیا تھا۔

اب میں پوری طرح مسز کاشف بن چکی تھی۔ یہی تو وہ چیزیں تھیں جنہیں دیکھ کر رشتے دار مجھ سے رشک کیا کرتے تھے اور میں اپنے لباس، اپنے میک اپ اور اپنے زیور سے کشو کے دیئے زخموں کو بخوبی چھپانے میں کامیاب ہو جاتی تھی۔

مگر آج میں کشو کی عطا کی ہوئی بے پناہ خوشیوں کو حاصل کر کے اس کی ہی پہچانوں سے اپنا سنگار کر رہی تھی۔ مسز کاشف کا رتبہ حاصل کر رہی تھی۔ نازنین بانو جو کچھ دیر پہلے تک برقرار تھی، اب گہری نیند سو چکی تھی۔ مسز کاشف جاگ اٹھی تھی۔ میرے ہونٹوں پر فاتحانہ مسکراہٹ تھی۔ میں نے پھر گھڑی دیکھی، ٹھیک دس بج رہے تھے۔ موبائل ہاتھ میں پکڑ کر میں بیڈ روم میں ہی چھت کے ایک کونے سے لٹکتی جھولے والی کرسی پر بیٹھ گئی۔ مجھ سے دور گئے میرے خواب ایک بار پھر سے میرے سنگ سنگ ہلکی پینگیں لینے لگے۔

دس بج کر ایک منٹ، دو منٹ، تین منٹ اور پھر پورے کے پورے تیس منٹ گزر گئے۔ میری ذہنی کیفیت بگڑتی جا رہی تھی اور میں اپنی جھولے والی کرسی کو تیزی سے ہلاتی جا رہی تھی۔ دس بج کر چالیس منٹ، پچاس منٹ وقت گزرتا رہا۔ میری انگلیاں نہ جانے کتنی بار کشو کے نمبر کو کلک کرتے کرتے رہ گئیں۔ کہیں کشو کا میرے ساتھ کھیلا ہوا یہ کوئی ڈرامہ تو نہیں۔

گھڑی کی ٹک ٹک اور میرے دل کی دھڑکنیں رفتار میں جیسے ہوڑ لگا کر بڑھ رہی تھی۔ مجھے لگا کہ جیسے میں کسی کھنڈر میں بھٹکتی پیاسی بد روح ہوں جو مرد کو اپنے سنگار سے رجھانے کے لئے طرح طرح کے سوانگ رچاتی ہے۔ کبھی کمرہ اجاڑتی ہے، کبھی سجا دیتی ہے۔ کبھی جسم بوسیدہ کر کے بدن کو مٹی کا ڈھیر بنا دیتی ہے اور کبھی نئی بیاہتا کی طرح سنگار کر کے ڈورے ڈالنے کے لئے تیار سیج پر بیٹھ جاتی ہے۔ میں شدید ذہنی انتشار میں تھی۔ اچانک مجھے چکر آنے لگا سر گھومنے لگا۔ زمین آسمان ناچنے لگے۔ ناچتی آنکھوں کے سامنے طرح طرح کے منظر جیسے رقص کرتے ہوئے باری باری سے آ جا رہے ہوں۔ میں گھبرا اٹھی۔ میں نے کس کر رسی کو مٹھیوں کی گرفت میں جکڑ لیا۔ یہ کیا ہو رہا ہے۔ سب کچھ چکر کیسے کاٹ رہا ہے۔ یہ پورا کمرہ اتنا طلسماتی کیسے ہو گیا۔ اچانک مجھے احساس ہوا کہ میں اپنی جھولے والی کرسی گول گول گھما رہی تھی اور گھماتے گھماتے میں نے اسے چکر دھنی والا جھولا بنا دیا تھا۔ کرسی کے اوپر کی موٹی بٹی ہوئی رسی ناچتے ناچتے آپس میں الجھ گئی تھی اور اب وہ رسی تیزی سے اینٹی کلاک وائز گھوم کر واپس ہونا چاہتی تھی۔ جیسے بچوں کے ہاتھوں نچایا لٹو تیزی سے گھومتا ہے ویسے ہی میری کرسی ناچ رہی تھی۔

پھر ایک محور پر آ کر گھومتی ہوئی کرسی آہستہ ہوتے ہوتے رک گئی۔

میں نے گھڑی کی طرف نگاہ اٹھائی۔ گیارہ بج کر پانچ منٹ، دس منٹ، بیس منٹ، سوئیاں بھاگتی جا رہی تھیں اور میرے ہاتھ سے امید کی ڈور چھوٹتی جا رہی تھی۔ میں نے خود کو تسلی دی کہ عمر بھر کا فیصلہ سننے کے لئے اگر ایک رات انتظار کرنا پڑے تو کوئی برا نہیں۔ کشو نے مجھے اپنے انتظار کی گھڑی کی سوئیوں پر لٹکایا ہوا تھا۔ گیارہ بج کر تیس منٹ پر، مٹھیوں میں جکڑا موبائل جھنجھنا کر چیخ اٹھا۔ میں اچھل کر کرسی سے نیچے کو دی اور بیڈ پر لمحے بھر میں ایسے جا کر بیٹھ گئی جیسے موبائل پر کشو کا فون نہیں، بلکہ خود وہ کمرے میں موجود ہو۔

''ہیلو!'' میں بیتابی سے چیخ اٹھی۔

''معاف کرنا جان! کچھ تاخیر ہوگئی۔ اس کی آواز میں لڑکھڑاہٹ تھی۔

''کہاں تھے تم؟'' میرا بے خیالی میں کیا ایک نازیبا سوال تھا جو کبھی کشو کو پسند نہیں آتا تھا۔ میں نے زور سے اپنے دانتوں سے اپنی زبان کاٹ لی تا کہ میں جذبات میں بہہ کر کوئی ایسی بات نہ کہہ جاؤں جو کشو کو پھر سے ناگوار گزرے اور میری دنیا سنورتے سنورتے پھر سے اجڑ جائے۔ میں نے بات سنبھالی۔

''میں جانتی ہوں کشو تم بہت مصروف رہتے ہو! مگر میں تم سے بے پناہ محبت کرتی ہوں۔ پل پل تمہاری یاد میں جیتی مرتی ہوں۔ میں تمہاری جدائی کس طرح کاٹتی ہوں اس کا شاید تمہیں اندازہ نہیں۔''

یہ باتیں نازنین بانو نہیں بلکہ وقت کی جلی اور حالات کی چھلی تجربہ کار وہ عورت بول رہی تھی جو مردوں کی نس پکڑے بغیر اس کا حال بیان کر سکتی ہے۔ میں نے ایسے ایسے جملے ادا کئے جو عورت مرد کے جذبات کو گدگدانے کے لئے بغیر سوچے سمجھے بولتی ہے۔ ایسے رسیلے جملے جو مرد کی پیاس کو بڑھا دیں اور وہ لٹک کر ٹوٹتے تارے کی طرح عورت کے دامن میں آ گرے۔ میری باتیں سن سن کر کشو جیسے پگھلتا جا رہا تھا، گھلتا جا رہا تھا۔ اگر وہ قریب ہوتا تو شاید وہ اب تک مجھے ڈھیر کر چکا ہوتا۔ وہ ایک سڑک چھاپ چھچھورے لڑکے کی طرح مجھ سے باتیں کر رہا تھا اور میں بھی وہی کلمات ادا کر رہی تھی جو ایک فاحشہ بستر پر جانے سے پہلے بولتی ہے۔ سچ مچ عورت کے لئے شادی نہ صرف ایک باعزت بلکہ کم خطرے اور کم محنت آمیز پیشۂ زندگی ہے۔

میں ایک ایک جملہ سوچ سوچ کر بول رہی تھی اور وہ جو کچھ بول رہا تھا محض بات کی روانی میں بول رہا تھا۔

جس عورت نے مرد کو سمجھ لیا، اس عورت کیلئے کتنا آسان ہو جاتا ہے اس مرد کو اپنی انگلی پر نچانا۔ میں بھی کتنی بیوقوف تھی۔ اپنی انا کی جھوٹی لڑائی لڑ رہی تھی۔ ارے وجود تو باہر ثابت ہوگا مگر اس سے پہلے گھر کی چہار دیواری کی جدو

جھد سے تو پار اتر لیں۔ بند کمرے میں کون دیکھ رہا ہے کہ باہر گرجنے برسنے والی باوقار عورت بستر پر کس فاحشہ کا کون سا سوانگ رچ رہی ہے۔ میں نے اب تک کوئی سوانگ نہیں کھیلا تھا اس لئے کشو جیسے مرد کے ہاتھ کا کھلونا بنی اپنی زندگی فٹ پاتھ پر لا رہی تھی مگر اب نہیں۔ اب میں سوانگ کی ایک ماہر کھلاڑی بنوں گی اور میں نے آج اپنا پہلا داؤ کھیلا تھا۔

اس درمیان میں نے خاص طور سے غور کیا کہ کشو کی زبان لڑکھڑا رہی تھی۔ یعنی اس نے شراب پی رکھی ہے۔ میرے علم میں پہلی بار یہ ہوا تھا۔ میں نے اسے کبھی شراب پیتے نہیں دیکھا تھا۔ مجھے کوئی دکھ نہیں ہوا۔ پیتا ہے تو پیے کمبخت، اگر کبھی میرے ہاتھ سے پینا چاہے گا تو میں اپنے ایک نئے سوانگ کے ساتھ اسے ضرور پلاؤں گی اور پلا پلا کر اس کے سر پر ناچوں گی۔ مجھے لگا کہ نازنین بانو ہمیشہ کے لئے گہری نیند سونے کی تیاری کر رہی ہے۔ کوئی افسوس نہیں، مرتی ہے تو مر جائے مگر مسز کشو زندہ رہے گی اس وقت تک اپنے سوانگ سے اپنا رتبہ اپنی شان بنائے رکھے گی جب تک اس کے جسم میں ایک بھی سانس باقی رہے گی۔ میں بہت ڈرامائی انداز میں پچکار رہی تھی، دلار رہی تھی، جنسی خواہش ابھار رہی تھی تاکہ اسے میری ضرورت کا بھی احساس ہو۔

''یار اب چپ بھی ہو جاؤ ورنہ میں پاگل ہو کر کسی عورت کے بیڈروم میں گھس جاؤں گا۔''

میں نے ایک زوردار قہقہہ لگایا'' گھسنے سے پہلے خدارا راشد مرزا کی تفصیل تو بتاتے جایئے جس نے ہم میاں بیوی کے رشتے میں زہر گھول دیا تھا۔

اس کے بعد کشو نے جو بتانا شروع کیا تو میرے ہوش اڑ گئے۔ کیا مردوں کی دنیا اتنی بری ہوتی ہے۔ مجھے یقین نہیں آ رہا تھا۔ کاش میں نیفو کو بھی کچھ سوانگ سکھا پاتی۔

- بقیہ -

صندلی کہانی کشتی پر سوار

سے اپنا پہلو بدلنے لگے۔ ہر طرف چیخ، کراہ، درد کی نہریں، پھوٹتی نظر آنے لگیں تو اس عدم توازن سے ہر دور میں کہانی قاری کو بیدار کرنے والی کہانی جنم لیتی ہے۔

کہانی آپا! تم تو جانو ہو، نراج، انتشار Non Uniform Velocity کہانی کی نئی حقیقتوں کا ظہور ہے۔

جب طالب علمی کا زمانہ تھا تو سنا کرتا تھا کہ زبان بازاروں میں، مئے خانوں میں، خانقاہوں میں، مدرسوں میں اور ادبی منڈی میں پلتی بڑھتی ہے۔ رات کے تیسرے پہر اداس لمحوں کی خود کلامی نے جب ذہن کے دریچوں کو کھولا اور تازہ ہوا کے جھونکے بدن کو چھونے لگے تو میری انگلیاں بولنے لگیں کہ آج نئی صدی میں کی بورڈ پر تھر کنے والی انگلیاں بولتی ہیں اور زبان خاموش رہتی ہے۔ کہانی کا اسلوب آج شائستہ فاخری جیسی مائی کے آنچل کی چھاؤں میں محفوظ ہے۔ کہانی کی وہ زبان جس کا ذکر جنوری ۱۹۸۸ء کی کسی سرمئی شام میں آل احمد سرور نے کیا تھا۔

'' نئے لکھنے والوں سے ہمیں یہ توقع تو ضروری کرنا چاہیئے کہ وہ زبان وادب کے اسرار رموز سے کماحقہ واقف ہوں۔ تحریر کی زبان کا ایک معیار ضروری ہے اور اس کی صحت پر اصرار کرنا چاہیئے۔''

کھانے پینے کی ملاوٹ نے اگر میری یادداشت کو کمزور نہ کیا ہو تو جملے شاید کچھ اسی طرح ادا ہوئے تھے۔

شائستہ فاخری کی کہانیوں کے کئی کردار پوسٹ ٹرامیٹک اسٹریس ڈس آرڈر، Post traumatic stress disorder کا شکار نظر آتے ہیں۔ خوفناک سانحے سے دوچار یہ کردار، بار بار واقعاتی تسلسل کے ساتھ تکلیف دہ احساسات لئے سمندر کی لہروں کی طرح ابھرتے ڈوبتے دکھائی دیتے ہیں۔ مگر ان کہانی کرداروں کی جو سب سے اہم خوبیاں ہیں وہ یہ کہ اسٹریس کے باوجود کہانی بُنّو کے ہر کردار بند ہو چکے دروازوں کو کھولتے ہیں۔ ٹوٹے بکھرے وجود نے ہمیشہ شاہکار کہانیاں لکھی ہیں اب آپ ان تمام کہانی کاروں کو پھر سے یاد کیجئے۔ جن کی کہانیاں آج بھی ہمارے ساتھ ساتھ چلتی ہیں بتیاتے ہوئے اور یہ احساس دلاتی ہیں کہ آگے کا راستہ ابھی کھلا ہے بند نہیں۔

شائستہ فاخری کی اپنی شخصیت، روح اور جسم کی داخلی اور خارجی سچائی جمالیاتی حس کی انفرادیت جب اجتماعیت تک کا سفر طے کرتی ہے تو آئینۂ تحریر سے آواز آتی ہے۔ نئے عناصر کا انکشاف ہی تخلیقیت ہے۔ زماں و مکاں کی بے جا اسیری سے نجات دے او میرے ربا کہ تنقید کی زمین پر سانپ سیڑھی کا کھیل آج بھی جاری ہے۔

☆

شب وروز کے پیرہن

عطیہ سکندر علی
(سکھر)

زمین پرواز نہیں کرتی

میں خواب میں دیکھتی ہوں
میری سانسیں ہزاروں کی صف میں
قطار در قطار/کھڑی مجھ سے
میرے ساتھ بتائے ایک ایک پل کا
حساب مانگ رہی ہیں
میں وقت کے دامن میں چھپائے
زندگی کے کشکول سے
چن چن کر ایک ایک لمحے کا
خود سے جواب مانگ رہی ہوں
سوال جواب کا سلسلہ
خواب اور حقیقت کے درمیاں
چلتا رہا، اور پھر چلتا رہا
زیست کی آخری شب میں
جب میں حساب کتاب کے لئے اٹھی
تو میری سانسیں مجھ سے دغا کر کے
دور نکل گئیں
اور میں اپنے خالی بدن کا ڈھیر لئے
زمیں دوز ہوگئی...

○

سوکھا دن اور گیلی راتیں

میں اپنے خوابوں کی کرچیاں چن رہی ہوں
اور تم اپنے بوٹوں سے
میری انگلیاں مسل رہے ہو
میں ہوا کی سبک رفتاری سے
اپنے تخیل کو پرواز دے رہی ہوں
اور تم اپنے جبر سے
پلکوں پر اٹکے موتیوں کو کچل رہے ہو
میں اپنے خالی دامن کو
پرندوں کی آوازوں سے بھر رہی ہوں
اور تم جمع کئے پرندوں کے پروں کو نوچتے پھر رہے ہو
جذبہ تمھارا بھی ہے
جذبہ ہمارا بھی ہے
فرق اتنا ہے کہ تم
محسوس کرنے کی قوت کھو چکے ہو
اور میں قوت گویائی......

○

بےسمت سفر کا حاصل

بے رنگ سے موسم کا
یہ کیسا پس منظر ہے
رشتوں کی دراڑوں میں
چڑھتی ہوئی دیمک ہے
بہکی ہوئی راگیں ہیں
سوئے ہوئے نغمے ہیں
میلی سی گھٹاؤں میں
روتے ہوئے جذبے ہیں
فطرت کی ہواؤں میں
کھوئے ہوئے نالے ہیں
آہوں کے جزیروں میں
الجھی ہوئی راہیں ہیں
کچلے ہوئے لمحوں میں
گھٹتی ہوئی سانسیں ہیں
پھیلی ہوئی راتوں میں
سہمی ہوئی چاہت ہے
سیلاب کے گھیرے میں
ٹوٹی ہوئی سانسیں ہیں
بہتی ہوئی کشتی میں
بکھرے ہوئے پیکر ہیں....

O

O

بہت مایوس ہوں اپنی زندگی سے
فریب اور مکر ملتا ہے سبھی سے

بہانے، جھوٹ اور بے جا تسلّی
بچوں کیسے تری بازی گری سے

ہر اک جا خاک وحشت اڑ رہی ہے
کہاں بھاگوں میں شہری زندگی سے

مرے حصے میں روشن دن نہیں تھے
ہمیشہ سامنا تھا تیرگی سے

یہاں اوراق دل بکھرے ہوئے ہیں
سنبھل کر تُو گزرنا اس گلی سے

یقیں جس پر کیا حد سے زیادہ
مجھے دھوکہ ہوا ہے بس اُسی سے

مرا تو نام شائستہ ہے صاحب
ذرا باتیں کریں شائستگی سے

☆

میری زندگی کی راہ میں

قمقمے نہیں
کہکشاں سجادو
تاروں کے جھرمٹ تلے
تعبیر نہیں
خوابوں کو سجادو
کہ تعبیر کا سچ
پاؤں کی جکڑن بن
روکتا ہے/ ڈراتا ہے
اور پھر
پیچھے مڑ کر
ماضی کی قبرگاہ میں
گہری نیند سلاتا ہے
مگر مجھے
سونے سے پہلے
جاگتی آنکھوں سے
جنگل کے پار اترنا ہے
یہ جنگل
خوبصورت ہے مگر
گہرے اندھیرے میں ڈوبا ہوا ہے
اور میں نے
وعدہ کیا ہے
میلوں چلتے رہنے کا
سونے سے پہلے
کمہار کے کچے گھڑے میں
خوابوں کا سچ بھر بھر کر
سنگ ساتھ لے جانے کا
جہاں ہم
اپنے خوابوں سے
اپنی تعبیر کا
حساب مانگ سکیں
پھر ایک بڑی قبرگاہ میں
ساتھ ساتھ گہری نیند سو سکیں
ایک نئے سفر کی شروعات کے لئے...

صدائے عندلیب

میں نے سوچا بارہا اس قبائے جسم کو اتاردوں
اتاردوں شب وروز کے پیرہن
سکھ دکھ کے لباس کو اتاردوں
اترائی پھروں آسماں کی وسعتوں میں
تتلی بنے خوابوں کو چن چن میں بھروں
یہ جہاں وہ جہاں سمیٹ لوں نگاہوں میں
خاموشی کے بے صدا نغمے سنوں اڑتی پھروں
چاند سورج کے حوالوں سے خیالوں کو بُنوں
زندگی کا عکس بن کر میں بھلا کیونکر جیوں
ہم ہیں یہاں، ہم ہیں وہاں پھر کہاں بکھرے ہوئے
جگنوں بنوں تارا چنوں
رعنائیوں سے کیونکر ڈروں
تحریر حاشیے کی بنوں اور میٹ دوں
نیا رنگ، نیا ساز، نیا انداز پھر رچوں
میں نے سوچا بارہا اس قبائے جسم کو اتاردوں
اتاردوں شب وروز کے پیرہن
سکھ دکھ کے لباس کو اتاردوں...

○

○

راہزن جب ہو راہنما میرا
کیسے اب طے ہو راستہ میرا

اپنی دنیائے غم میں جیتی ہوں
کس نے دیکھا ہے حوصلہ میرا

تیری آنکھوں میں زندگی دیکھوں
تیرا چہرہ ہے آئینہ میرا

اُس کے جتنے قریب میں پہنچی
پاس آتا گیا خدا میرا

چاند نکلا کبھی نہ آنگن میں
رائیگاں ٹھہرا جاگنا میرا

تیری منزل ہی میری منزل ہے
تیرا رستہ ہے راستہ میرا

مجھ کو شائستۂ غم بھلا کیوں ہو
ہر گھڑی ساتھ ہے خدا میرا

☆

جذبوں کی خلوت میں

میں ایک شجر کے نیچے
چپ بیٹھی تک رہی ہوں
اس تتلی کو
جس کے پروں کے بیچ
میرے خواب سجے ہیں
یہ تتلی کہیں دور نہیں
بند ہے
میری مٹھی میں
مٹھی کی گرمی میں
جھلستے میرے خواب
اور جھڑتے ہوئے پر
پروں اور خوابوں کے بیچ
سلسلہ کیسا طویل ہے
اور میں طویل سفر سے تھک کر
شجر کے نیچے بیٹھی
مٹھیاں کھول رہی ہوں
تا کہ میرے خوابوں کی تتلی
ایک نئے سفر پر
نئی اڑان بھر سکے......

○

ڈرامہ

حاشیہ پر لکھی تحریر

شائستہ فاخری

منظر: اول

وقت: رات
جگہ: نصرت خان کا مکان
کردار: خوشبو، ناصر شیخ

(پس منظر: غم گین ماحول' ابتدائیہ موسیقی' کتے کے بھونکنے کی آواز' دیوار گھڑی کے تین بجنے کے گھنٹے' دھیرے دھیرے خوشبو کے سسکنے کی آواز)
دروازے پر دستک ہوتی ہے:
"ٹھک.....ٹھک.....ٹھک۔"

خوشبو (غمگین آواز میں): کون ہے؟
ناصر شیخ: میں ناصر
خوشبو: آجاؤ' تمہیں دستک کی کیا ضرورت؟
ناصر: کب تک یہاں بند رہوگی؟ اُٹھو کمرے سے باہر نکلو۔
(خوشبو کی سسکیاں تیز ہو جاتی ہیں)
ناصر (سمجھاتے ہوئے): یادیں اور تمہارے آنسوؤں کے لئے عمر پڑی ہے۔ خوشبو! اگر یہ وقت نکل گیا تو کبھی لوٹے گا نہیں۔ چلو میرے ساتھ چل کر آخری بار سائرہ کو دیکھ لو۔
خوشبو: (روتے ہوئے): مجھ سے دیکھا نہیں جائے گا۔ ناصر! میں نہیں دیکھ سکتی... اتنا گہرا صدمہ مجھ سے برداشت نہیں ہو رہا ہے۔ (رونے لگتی ہے)
ناصر: بس خوشبو! بس!!
خوشبو: کچھ لوگوں کی زندگی ایسی ہوتی ہے جو حاشیے پر لکھی ہوئی تحریر کی طرح ہمیشہ بکھری رہتی ہے۔ میری بہن کا مقدر بھی ایسا ہی تھا۔
ناصر: قسمت کو بدلنا ہمارے یا تمہارے بس کی بات نہیں ہے۔
خوشبو: تم تو کہتے تھے کہ قسمت کچھ بھی نہیں ہے' کوشش اور عمل ہی سب کچھ ہے۔ تم ہی تو تھے جو ہمیشہ کتابوں کا سہارا لے کر مجھے سمجھاتے تھے۔
ناصر: خوشبو پلیز! یہ وقت ان باتوں کا نہیں ہے ۔ باہر سب انتظار کر رہے ہیں۔ صبح ہونے سے پہلے واپس بھی آنا ہے۔
خوشبو: تم جاؤ' میں یہیں اپنے کمرے کی کھڑکی سے اسے جاتے ہوئے دیکھ لوں گی۔
ناصر: سائرہ کی روح بے قرار ہوگی۔ اسے بھی تمہارا انتظار ہوگا۔۔۔ (ایک گہری سانس لیتے ہوئے) کم سے کم ان آخری لمحوں میں تو اُسے سکون دے دو۔
خوشبو: آج نہ اُسے کوئی بے قراری ہوگی' نہ بے سکونی۔ عمر بھر کی پیاس بجھا کر آج تو وہ ابدی نیند سو گئی ہے۔ بے شمار جاگی ہوئی راتوں کا حساب آج اس نے وقت سے لے لیا.....(روتے ہوئے) ناصر! یہ کیسی پیاس تھی اس کی۔
ناصر: (گلاس میں پانی انڈیلتے ہوئے) لو پانی پیو اور خود کو سنبھالو! ورنہ میرے لئے خود کو بھی سنبھالنا دشوار ہو جائے گا۔
فرمان علی: (دور سے) ناصر!......ناصر۔
ناصر: دیکھو۔ فرمان انکل بھی آ رہے ہیں۔

منظر: دوم

وقت: رات
جگہ: نصرت خان کا مکان
کردار: بتول فاطمہ۔ فرمان علی۔ رامو۔ بچی۔ ناہد علی۔ عاصم (بچی کے رونے کی آواز)

بتول فاطمہ: (بچی کو بہلاتے ہوئے) نا بٹی! چپ ہو جا۔ تیری ماں چندا ماما سے ملنے گئی ہے۔
بچی: (روتے ہوئے) میں بھی جاؤں گی ....مجھے بھی جانا ہے وہاں۔
بتول فاطمہ: (بے قراری سے) نہیں گڑیا ایسا نہیں کہتے۔ جسے اللہ میاں بلاتے ہیں وہی جاتا ہے وہاں۔
بچی: تو مجھے کیوں نہیں بلایا وہاں (بچی تیز آواز میں روتی ہے) میں بھی امی کے پاس جاؤں گی۔
بتول فاطمہ: (پریشان ہوتے ہوئے) اصل میں خوشبو سے گھلی ملی ہے اس لئے کسی دوسرے کے پاس بہلتی نہیں۔
فرمان علی: (آواز دیتے ہوئے) رامو کہاں ہو تم؟
رامو (آتے ہوئے): جی مالک!
فرمان علی: جاؤ بچی کو بہلا کر سلا دو۔
(رامو بچی کو بہلانے کی کوشش کرتے ہوئے دور لے جاتا ہے)
فرمان علی: (گہری سانس لیتے ہوئے) جنازہ تیار ہے اور خوشبو ابھی تک نہیں آئی۔
بتول فاطمہ: کئی بار لوگوں کو بھیج چکے ہیں' آئی ہی نہیں! اب ناصر کو بھیجا ہے۔
فرمان علی: (خود کلامی کے انداز میں) ذرا گھڑی تو دیکھوں' کیا وقت ہوا ہے؟......اُف! اب زیادہ وقت نہیں لگنا چاہئے۔
بتول فاطمہ: ناصر خوشبو کو لے کر آتا ہی ہوگا۔

فرمان علی: (ناہد سے) ذرا ٹارچ لیتی آنا' باہر اندھیرا بہت ہے اور موسم بھی ٹھیک نہیں ہے۔

(بادل گرجنے کی آواز)

عاصم: ڈیڈی! اگر بارش شروع ہوگئی تو بہت مشکل ہوگی۔

(بادل گرجنے کی آواز تیز ہوجاتی ہے)

عاصم: (پریشان ہوتے ہوئے) پلیز عثمان! وقت برباد مت کرو۔ جنازہ جلدی اٹھانے میں مدد کرو۔

(عثمان سسکتا ہے)

عاصم: (فرمان علی سے) ڈیڈی آپ خوشبو کو بلا کر لائیے' ورنہ سب یوں ہی کھڑے رہ جائیں گے اور بارش شروع ہوجائے گی۔

فرمان علی (اُٹھتے ہوئے) میں ہی جا کر بلاتا ہوں۔

(قدموں کے دور ہونے کی آواز)

منظر تبدیل ہوتا ہے۔

منظر: سوئم

وقت: رات

جگہ: خوشبو کا کمرہ

کردار: فرمان علی:۔عاصم۔خوشبو۔ناصر (ٹھوکر سے کسی سامان کے گرنے کی آواز)

فرمان علی: راموراستے سے ہٹا کر سامان بھی نہیں رکھتا۔ پتہ نہیں کس چیز کو ٹھوکر لگی ہے۔ موسم کی خرابی سے کم بخت لائٹ کو بھی ابھی گل ہونا تھا۔

ناصر (بلند آواز سے): انکل! ٹارچ کی روشنی کے سہارے آجایئے۔

فرمان علی: (آگے بڑھتے ہوئے) بیٹا! میں اس لئے ادھر آیا تھا کہ خوشبو سے کہو کہ جلدی آجائے۔ بارش شروع ہوگئی تو گھر سے نکلنا بھی مشکل ہوجائے گا۔

ناصر: انکل میں تو سمجھا سمجھا کر ہار گیا.....اب آپ بھی کوشش کر لیجئے۔

(فرمان علی او ناصر کے قدموں کے آگے بڑھنے کی آواز)

فرمان علی: ارے! اندھیرا کر کے کیوں بیٹھی ہو بیٹی۔

ناصر: ٹارچ تو میں اٹھالے گیا تھا آپ کو راستہ دکھانے کے لئے۔

خوشبو (سسکتے ہوئے): انکل......!

(خوشبو فرمان علی کے سینے سے لگ جاتی ہے)

فرمان علی: بیٹی اس وقت تمہارا چچا صرف تسلی دے سکتا ہے۔ صبر تو تجھے ہی کرنا پڑے گا.....چلو میرے ساتھ.....سائرہ کے آخری سفر میں شامل ہوجاؤ۔

خوشبو (روتے ہوئے) انکل مرتے تو سبھی ہیں مگر یہ کیسی موت؟......یہ کیسا جنازہ؟۔

فرمان علی: گہرا صدمہ دے کر گئی ہے وہ ۔ہمیں ہماری غلطیوں کا احساس کرا گئی۔

خوشبو (جذباتی ہوکر): جس لڑکی کو آپ سبھی نے بزدل کہہ کہہ کر نا کارہ قرار دے دیا تھا' جاتے جاتے ہم سبھی کو ہماری بزدلی کا احساس کرا گئی۔ بزدل وہ نہیں ہم سب تھے۔ روایت توڑنے کا حوصلہ ہم میں نہیں' اُس میں تھا۔

فرمان علی: بیٹی میں نے تیرے باپ کو زبان دی تھی کہ تمہاری دونوں بیٹیوں کو منزل تک پہنچاؤں گا مگر یہ مطلب نہیں تھا کہ اپنے بوڑھے کاندھوں پر جوان لاش کو ڈھوؤں گا۔

(بادل گرجتے ہیں اور ہلکی ہلکی بوندا باندی شروع ہوجاتی ہے)

عاصم (دور سے آتے ہوئے' پریشان ہوکر) جس بات کا خطرہ تھا آخر وہی ہوا۔ اب بارش رکنے کا انتظار کرنا پڑے گا۔

فرمان علی: کوئی بات نہیں بارش جلد ہی تھم جائے گی کیوں کہ گرجنے والے بادل برستے نہیں۔

(بادل کی گرج کے ساتھ بارش ہونے کی آواز)

عاصم (خود کلامی کے انداز میں): اُف! یہ بارش!!

خوشبو: انکل آپ ہی بتایئے کہ آپ میری بہن کے جنازے کو ڈولی کہیں گے یا گہوارہ۔؟

فرمان علی: بیٹی میں نہیں جانتا کہ مجھے کس گناہ کی سزا مل رہی ہے۔ میں تو بہت آس اور یقین سے نصرت خاں کے کنبہ کو یہاں لایا تھا مگر یہاں....!

عاصم: ڈیڈی پلیز!

فرمان علی: (خوشبو کو اٹھاتے ہوئے) چلو آخری بار بہن کا منہ دیکھ لو پھر نہ ملے گی قیامت تک۔

ناصر (جاتے ہوئے): دیکھتا ہوں۔

(گھڑی نے ایک گھنٹہ بجایا)

فرمان علی: اُف ساڑھے چار بج گئے۔ آج تو وقت کے پر لگ گئے ہیں۔

ناصر (واپس آتے ہوئے): پانی رُکا ہوا ہے' اب اور دیر مت کیجئے۔ صبح ہونے میں آدھا پون گھنٹہ اور رہ گیا ہے۔

فرمان علی: عثمان آؤ بیٹے! کندھا لگاؤ۔

(عثمان کے سسکنے کی آواز)

فرمان علی: راموا ور ناصر تم دونوں پیچھے جاؤ.....ہاں....ہاں..ذرا سنبھل کے ...ٹھیک.....اب ایسے ہی.....سنبھالنا...بتول! دروازے کے دونوں پٹ پورے کھول دو۔

(دروازہ کھلنے کی آواز۔ لوگوں کی سسکیاں ۔سسکیوں پر سپر امپوز ہوتا ہوا عورت کی زندگی پر ایک نغمہ)

منظر: چہارم

کردار: فرمان علی۔عثمان علی۔بتول فاطمہ

فرمان علی: بیٹا ناصر! خوشبو کو سائرہ کا چہرہ دکھادو۔ آخری بار یہ اپنی بہن کو دیکھ لے۔

(لوگوں کے سسکنے کی آواز)

عثمان علی (گہرے دکھ سے) سرخ نکاحی دوپٹہ اڑھا کر تو دلہنیں رخصت کی جاتی ہیں امّی۔

بتول فاطمہ: بیٹے خود کو سنبھالو۔

عثمان علی: ماں! سائرہ کا منھ ڈھانپ دو مجھ سے دیکھا نہیں جاتا۔

خوشبو: یہ کیسی دلہن ہے جو زندگی کا نوحہ پڑھ رہی ہے۔

ناصر: (بتول فاطمہ کو ہٹاتے ہوئے) آنٹی آپ ہٹیے! میں سائرہ پر سفید چادر ڈال دیتا ہوں۔

منظر: پنجم

کردار: خوشبو۔ناصر۔

(دروازے پر دستک ہوتی ہے)

ناصر: میں اندر آجاؤں؟

خوشبو: (چونکتے ہوئے، غم زدہ آواز میں): ارے! تم واپس کیسے لوٹ آئے!!

ناصر: انکل کے دوست رحیم چاچا راستے میں مل گئے۔وہ خود کندھا دینے لگے تو میں خالی ہو گیا.....اور پھر مجھے تمہارا خیال تھا اس لئے واپس لوٹ آیا۔

خوشبو: نہیں ناصر اب مجھے کسی سہارے کی آس مت دلاؤ۔

ناصر: ایک لڑکی کا تنہا رہنا بہت مشکل کام ہے خوشبو۔

خوشبو: مگر اتنا مشکل بھی نہیں جتنا ایک مرد سوچتا ہے۔

ناصر: اب دیکھو سائرہ......!

خوشبو (بیچ میں ہی بات کاٹتے ہوئے) سائرہ کی بات بالکل مت کرو...دوسرے اسے سمجھ نہیں سکے اور وہ خود دوسروں کو سمجھا نہیں سکی۔وہ ساری زندگی الجھ کر رہ گئی۔

ناصر: (سمجھاتے ہوئے) خوشبو! غم تازہ ہو تو دل کو سنبھالنا مشکل ہوتا ہے مگر پھر بھی میں تم سے کہوں گا کہ خود کو سنبھالو۔

خوشبو: (کٹے ہوئے لہجے میں) اب کس کے لئے خود کو سنبھالوں۔کون بچا ہے اپنا جس کو زندہ رکھنے کے لئے خود کو زندہ رکھوں!

ناصر: کیا تم مجھے فراموش کرسکو گی؟

(خوشبو طنزیہ ہنسی ہنستی ہے)

خوشبو: خود کو بہلانے کے لئے یہ خیال اچھا ہے۔

ناصر: خوشبو! آج تمہیں سمجھانے کے لئے الفاظ اپنا اثر کھو چکے ہیں۔

خوشبو: (بولنے سے روکتے ہوئے) بس.....اب اور نہیں۔

ناصر: میں جانتا ہوں خوشبو آج میری شخصیت تمہارے لئے بے معنی ہو رہی ہے پھر بھی میں تمہیں یوں تنہا نہیں چھوڑوں گا اور نہ ہی تمہیں ٹوٹنے دوں گا۔

خوشبو: (گہری سانس لیتے ہوئے) میری تو مجبوری تھی عورت ہونے کے ناطے میں سائرہ کے آخری سفر میں شامل نہیں ہو سکتی تھی۔مگر تم تو جاسکتے تھے۔

ناصر: میں تمہیں بس اس وقت اکیلا چھوڑنا نہیں چاہتا تھا۔

خوشبو: ناصر! بہت جلدی سب کچھ ختم ہو گیا۔

ناصر: نہیں خوشبو! خدا پاک کبھی بھی اپنے بندوں سے سب کچھ نہیں چھینتا، زندہ رکھنے کے لئے کوئی دروازہ، کھڑکی یا جھروکا کھلا چھوڑ دیتا ہے۔اس وقت سائرہ کی بیٹی آرزو تمہارے جینے کا مقصد ہے۔

(خوشبو ایک گہری سانس لیتی ہے)

ناصر: تم کبھی خود کو تنہا مت سمجھنا۔میں ہر قدم پر تمہارے ساتھ ہوں۔تم نے بہت بہادری سے اپنی ہر لڑائی جیتی ہے اور آگے بھی جیتو گی۔

خوشبو: ایسی جیت سے کیا حاصل جس میں ہار چھپی ہو۔میں جیت کر بھی ہار گئی۔میرے ابو چلے گئے۔۔۔سائرہ کا سہارا تھا وہ بڑی بہن ہی نہیں میری سہیلی بھی تھی۔سائرہ کو دیکھ کر ہی میں نے خود کو سنبھالا.....کھڑا کیا...مگر جن کے لئے میں نے اتنا کچھ کیا جب وہ نہیں تو اب جنگ کیسی.....جیت اور ہار کیسی؟

ناصر: جب تک زندگی کا ایک بھی مقصد باقی رہتا ہے تب تک جنگ بھی جاری رہتی ہے اور ابھی تمہارے سامنے اس ننھی سی بچی کی زندگی کا سوال ہے۔ تمہیں اپنے لئے بھی جینا ہے اور اس کے لئے بھی خود کو زندہ رکھنا ہے۔

خوشبو (سسکتے ہوئے) تمہیں کیا پتہ ناصر! جب آنکھوں کے خواب بکھرا جاتے ہیں تو جینا کتنا مشکل ہو جاتا ہے۔

ناصر: نہیں! یہ سب سوچ ہوتی ہے۔جب سوچ اور نظریہ سدھار لو گی تو زندگی خود سنور جائے گی۔تمہیں ایک بار پھر سے نو دس سال پہلے کی خوشبو کو جگانا ہوگا۔وہی خوشبو جو اپنی دھن کی پکی، اپنے فیصلے پر اڑی ہوئی اور ہر پیچیدگی میں راستہ نکالنے والی ہوا کرتی تھی۔

خوشبو: ناصر! اب مجھ میں ہمت نہیں۔

ناصر: وقت بڑے سے بڑا زخم بھر دیتا ہے۔تھوڑا وقت اپنے آپ کو دو، دیکھو پھر سب ٹھیک ہو جائے گا۔لو! وہ تنو جی بھی آگئیں۔

منظر: ششم

کردار: بتول فاطمہ، ناہد علی (کچن میں کام کرتی ہوئی بتول فاطمہ۔برتنوں کی کھٹ پٹ کی آواز)

بتول فاطمہ: تنو! چائے دم دے دو۔بس وہ لوگ واپس آتے ہی ہوں گے۔

ناہد علی: ممی بادل بھی خوب چڑھے ہیں۔اُن لوگوں کو جلدی واپس آجانا چاہئے۔

بتول فاطمہ: (کراہتے ہوئے) ایک تو ساری رات جاگنے سے جسم ٹوٹ رہا ہے، مجھے تو لگ رہا ہے بخار آجائے گا۔

ناہد علی: ممی! بیٹھے بٹھائے ہم لوگوں کے سر پر اتنی بڑی آفت ٹوٹ پڑی۔

بتول فاطمہ: یہ تو کہو قسمت اچھی تھی کہ عثمان کی بیوی اپنے مائیکے گئی ہوئی ہے اگر وہ یہاں موجود ہوتی تو ایسا کبھی نہیں ہونے دیتی اور عثمان اس وقت اس کی ایک

نہیں سنتا' میاں بیوی کے رشتے میں ہمیشہ کے لئے درار آجاتی۔

ناہدعلی: آپ نے سب کو منع کر دیا ہے نا! کہ بھابھی کے سامنے کوئی اس وصیت کا ذکر نہ کرے۔

بتول فاطمہ: ہاں میں نے الگ الگ سب کو منع کر دیا ہے۔تم عاصم کو سمجھا دینا۔ داماد سے کچھ کہتے ہوئے مجھے اچھا نہیں لگتا۔

ناہدعلی: وہ کچھ نہیں کہیں گے' میں انہیں منا لوں گی ......ممی! چائے کے ساتھ کچھ بسکٹ وغیرہ نہیں رکھا جائے گا۔

بتول فاطمہ: رکھا کیوں نہیں جائے گا.....میری تو عقل ہی کام نہیں کر رہی ہے۔ دیکھو! سامنے بسکٹ کا ڈبہ رکھا ہے نکال لو۔

ناہدعلی: ایسا کرتے ہیں خوشبو کے لئے چائے ڈال کر پہنچا دیتے ہیں اس کے کمرے میں۔باقی لوگوں کو بعد میں دے دیں گے جب وہ قبرستان سے لوٹ آئیں گے۔

بتول فاطمہ: ہاں! پہلے خوشبو کو دے آؤ۔کل سے اس نے ایک بوند پانی بھی حلق میں نہیں ڈالا ہے۔

(ٹرے میں چائے وغیرہ رکھنے کی آواز۔ پیالی میں چمچ چلانے کی آواز)

بتول فاطمہ: ناصر کے لئے بھی پیالی رکھ لینا وہ بھی خوشبو کے کمرے میں ہی ہے

ناہدعلی: ناصر تو قبرستان گیا ہے۔

بتول فاطمہ: نہیں وہ بیچ راستے سے ہی واپس آ گیا ہے۔

ناہدعلی: کیوں؟

بتول فاطمہ: پتہ نہیں!

ناہدعلی: ٹھیک ہے! میں چائے لے کر جاتی ہوں۔

(ناہد جاتی ہے)

منظر: ہفتم

کردار: ناہدعلی۔ناصر۔خوشبو۔

(دروازے پر دستک ہوتی ہے)

ٹھک.....ٹھک......ٹھک۔

ناصر: آیئے! آیئے ناہد صاحبہ! آپ نے کیوں تکلیف کی۔ مجھے آواز دی ہوتی۔

ناہدعلی: اس میں تکلیف کیسی....اپنوں کے لئے کئے گئے کام تکلیف نہیں کہلاتے۔

(خوشبو ناہدعلی سے لپٹ کر روتی ہے)

خوشبو: ناہد! اب آگے کیا ہوگا؟

ناہدعلی: جب برا وقت پڑے تو بہت دور تک کی نہیں سوچا کرتے۔جتنا دکھائی دے رہا ہے بس اتنا ہی دیکھو اور اتنا ہی سوچو۔

خوشبو: ناہد یہ سب کہنا ٹھیک لگتا ہے مگر سہنا بہت مشکل ہے۔

ناہد: سہنا تو پڑے گا ہی خوشبو! اٹھو! پہلے ایک پیالی چائے پی لو۔

خوشبو: میری سائرہ تو پیاسی چلی گئی۔میں کیسے گلا تر کر لوں!

ناہدعلی: خوشبو! اگر جانے والے کے ساتھ جانا ممکن ہوتا تو میں تم سے کچھ نہ کہتی۔تمہارے حال پر ہی چھوڑ دیتی مگر اپنے ہاتھوں سے اپنی روح جسم سے جدا نہیں کر سکتی۔

خوشبو: ناہد! میری بہن جب تک زندہ رہی اپنی بات نہ کہہ سکی۔بول نہ سکی۔عمر بھر بے زبان رہی مگر جب اس کی بے زبانی کو زبان ملی تو وہ سب خوف زدہ ہو گئے۔رات کے اندھیرے میں پوشیدگی سے دفنا دی گئی۔اس کا کیا گناہ تھا؟ دلہن بننے کی پیاس تو ہر لڑکی کی آس ہوتی ہے۔من چاہا دولہا تو ہر لڑکی پانا چاہتی ہے۔اسی ایک جرم کی اتنی بڑی سزا! جیتے جی بھی اور مرنے کے بعد بھی۔

ناہدعلی: (سمجھاتے ہوئے) اوپر والے کی یہی مرضی تھی۔

خوشبو: (غم اور غصے سے) غلط! ایک دم غلط۔سب مل کر کسی کو سوکھے اندھے کنویں میں دھکیل دیں اور پھر کہیں کہ خدا یہی چاہتا تھا۔تم بتاؤ! کیا یہی انصاف ہے! جو سائرہ کے ساتھ کیا گیا' کیا وہ صحیح ہے؟

ناہدعلی: ہم تم سے باتیں....سب باتیں کریں گے..مگر ابھی نہیں....ابھی چائے پیو....لو ناصر! تم بھی چائے پیو....خاموش بیٹھنے سے کام نہیں چلے گا۔

ناصر: (گہری سانس لے کر) آپ لوگ پئیں۔میں بعد میں پی لوں گا۔

ناہدعلی (حق سے زور دے کر) نہیں! تم دونوں پیو گے...اور ابھی پیو گے۔

ناصر: لگتا ہے سب لوگ لوٹ کر آ گئے۔

منظر: ہشتم

کردار: بتول فاطمہ۔فرمان علی۔عثمان علی۔نکہت

(صبح ہونے کا منظر۔چڑیوں کے چہچہانے کی آواز۔دفنا کر واپس ہوئے لوگوں کی بات چیت۔)

بتول فاطمہ: آ گئے آپ لوگ!

(کوئی کچھ بولتا نہیں۔فرمان علی ایک لمبی سی ہنکار بھرتے ہیں)

بتول فاطمہ: عثمان بیٹا! پہلے تم نہا کر کپڑے بدل لو۔

فرمان علی: بارش کی وجہ سے ایک تو مٹی گیلی تھی دوسرے عثمان نے ہی سائرہ کو اندر لٹایا بھی۔

بتول فاطمہ: (آواز دیتے ہوئے) ناہد! ذرا بھائی کے لئے پانی گرم کر دینا۔ موسم ٹھیک نہیں ہے ٹھنڈے پانی سے نہائے گا تو بیمار پڑ جائے گا۔

عثمان علی: (سنجیدہ لہجے میں) میں ذرا ٹھہر کر نہاؤں گا۔

(عثمان کے دور جاتے قدموں کی آواز)

بتول فاطمہ: اس کی ساری ناراضگی مجھ پر ہی ہے۔میں نے کیا کیا ہے؟ قسمت کے لکھے کو ٹالنا میرے بس کی بات نہیں تھی۔

(ٹیلیفون کی گھنٹی بجتی ہے)

بتول فاطمہ: ذرا دیکھئے گا کس کا فون ہے۔

فرمان علی: یہ صبح صبح کس کا فون آ گیا۔

''ہیلو!''

نکہت: آداب ڈیڈی! عثمان کیسے ہیں؟

فرمان علی: ہاں بیٹی! کہو کیسی ہو؟ عثمان بالکل ٹھیک ہے۔

نکہت: جی بہت گھبرا رہا ہے! سب خیریت ہے!!

فرمان علی: ارے نہیں! یہاں سب خیریت ہے۔ سب لوگ ٹھیک ٹھاک ہیں۔

نکہت: اب دل نہیں لگ رہا ہے۔ میں آنا چاہتی ہوں۔

فرمان علی: آنا چاہتی ہو تو آ جاؤ۔ میں منع نہیں کرتا مگر سب ٹھیک ٹھاک ہے۔ عثمان بھی بالکل ٹھیک ہے۔

نکہت: میں صبح نو بجے کی ٹرین پکڑ کر رات تک آ رہی ہوں۔

فرمان علی: ارے اتنی جلدی کیا ہے! آرام سے آنا۔

نکہت: میرا دل بہت گھبرایا ہوا ہے۔ میں فوراً آنا چاہتی ہوں۔

فرمان علی: ٹھیک ہے جیسی تمہاری مرضی۔ میں رات پونے آٹھ بجے تمہیں لینے اسٹیشن پہنچ جاؤں گا۔

نکہت: اچھا ڈیڈی! خداحافض!

فرمان علی: خداحافظ بیٹی۔

بتول فاطمہ: بہو کا فون تھا؟

فرمان علی: ہاں رات کو آ رہی ہے۔

بتول فاطمہ: اچھا ہے۔ آ جائے گی تو گھر کا ماحول کچھ بدلے گا۔

فرمان علی: (گہری سانس لے کر) نصرت کے خاندان کو شہر سے لا کر میں اپنی نظر میں خود مجرم بن گیا۔

بتول فاطمہ: اس میں ہم لوگوں کی کیا غلطی؟ ہم نے تو جہاں تک ہو سکا ان کی دونوں بیٹیوں کو سنبھالنے کی کوشش کی۔ مگر نصیب کے آگے کس کی چلی ہے۔ سگے ماں باپ بھی ہار جاتے ہیں' پھر ہماری کیا بساط!

فرمان علی: ہم بڑے بزرگ تھے۔ ہم لوگوں کو چاہیئے تھا کہ عثمان اور سائرہ کی شادی کر دیں مگر اپنی پست ذہنیت سے مجبور تھے۔ سب کچھ جانتے ہوئے بھی ہم سبھی آنکھ پر پٹی باندھے رہے اور ان ساری باتوں کا نتیجہ سامنے ہے۔

بتول فاطمہ: (فلسفیانہ انداز میں) اوپر والا جس کا جتنا دامن دیتا ہے سوغات بھی اتنی ہی ملتی ہے۔

فرمان علی: (جھنجھلا کر) تم بحث کر رہی ہو۔

بتول فاطمہ: (ڈرامائی انداز میں روہانسی ہو کر) لو بھلا! اس میں بحث کی کیا بات؟ دنیا سمجھاتی ہے ایسے موقعوں پر۔ میں بھی تو وہی کہہ رہی ہوں جو سب کہتے ہیں۔ میری تو بولی بھی آپ کو زہر لگتی ہے۔

فرمان علی: تم سے بھلا کوئی جیت سکا ہے؟

بتول فاطمہ: اب عثمان کو ہی دیکھ لیجئے۔ کیا میں اس کے تیور پہچان نہیں رہی ہوں! وہ مجھے ہی مجرم سمجھ رہا ہے۔

فرمان علی: کیا اس نے کچھ کہا ہے تم سے!

بتول فاطمہ: اب کیا زبان سے کچھ بولے گا تبھی میں بات سمجھوں گی۔ مجھے سیدھی نگاہ سے دیکھنا بھی گوارا نہیں کرتا۔ بس میرا اتنا ہی لحاظ کرتا ہے کہ زبان سے مجھ سے کچھ نہیں کہتا۔ میں نے جو بھی فیصلہ کیا اس کے بھلے کے لئے کیا۔

فرمان علی: (غصے سے) اب چھوڑو! اب تو سارے قصے ہی ختم ہو گئے اب ماتم کرنے سے کیا حاصل!

بتول فاطمہ: اور آپ بھی سن لیجئے! عثمان مجھ سے کچھ کہہ بھی نہیں سکتا کیوں کہ آخری فیصلہ اسی کا تھا۔ میں نے زبردستی نکہت کو اس کے سر نہیں تھوپا۔ جب تک اس نے اپنی زبان سے ہاں نہیں کہا' میں نے بات آگے نہیں بڑھائی۔

فرمان علی: (جھنجھلاتے ہوئے) یہ وقت ان باتوں کی بحث کا نہیں ہے بہو آ رہی ہے اس کے سامنے بات کو سنبھالنا ہے۔

منظر: نہم

کردار: فرمان علی۔ نکہت۔ قلی

(پس منظر میں اسٹیشن کی بھیڑ کا شور۔ ٹرین کا آنا۔ پھیری والوں کی آوازیں)

نکہت: (دور سے) آداب ڈیڈی!

فرمان علی (خوشی سے) جیتی رہو بیٹی!... آ گئیں تمہارے گھر میں سب ٹھیک ہیں نا۔

نکہت: جی بالکل ٹھیک ہے۔ میں تو یہاں کے لئے پریشان تھی۔ برے برے خواب آ رہے تھے۔ عثمان کے لئے بہت فکر ہو رہی تھی۔

فرمان علی: (ڈوبے لہجے میں) عثمان تو ٹھیک ہے... لیکن...

نکہت: (بے قراری سے) لیکن کیا ڈیڈی..... لیکن کیا۔ جلدی بتایئے!

فرمان علی: سائرہ اب نہیں رہی۔

نکہت: اُف... کافی دنوں سے بیمار بھی تو چل رہی تھی۔

فرمان علی: (بیچ میں بات کاٹ کر قلی کو آواز دیتے ہوئے)

قلی: جی بابو جی!

فرمان علی: یہ تینوں سامان باہر گاڑی تک پہنچانا ہیں۔

قلی: جی بابو جی!

فرمان علی: آؤ بیٹی! بات کرتے کرتے ہی باہر چلتے ہیں ورنہ گھر پہنچنے میں دیر ہو جائے گی۔

نکہت: (دکھ سے) کب ہوا یہ سب؟

فرمان علی: گذری رات میں

نکہت: اُف! تو میرے خواب سچ تھے۔ کل کی ساری رات سوتے جاگتے

کئی' جب بھی آنکھ لگتی برے سپنے دکھائی دیتے۔

فرمان علی: بیٹی! ہونی کو کون ٹال سکتا ہے۔

نکہت: اب خوشبو کہاں ہے؟

فرمان علی: اس وقت تو ہم لوگ خوشبو کو اپنے گھر لے آئے ہیں مگر اب واپس اس اکیلے گھر میں نہیں جانے دیں گے۔

نکہت: ڈیڈی! دونوں گھر تو اتنے برابر ہیں کہ لگتا ہی نہیں کہ الگ الگ ہیں ہر وقت آنا جانا' اٹھنا بیٹھنا' کھانا پینا ساتھ ساتھ' لگتا ہے ایک ہی گھر کے دو دروازے ہوں۔

فرمان علی: ہاں بیٹی! (گاڑی کا دروازہ کھولتے ہوئے) آؤ! ادھر بیٹھو۔

(گاڑی اسٹارٹ ہونے کی آواز اور پھر مسلسل دور ہوتی ہوئی آواز)

منظر: دہم

کردار: نکہت۔ بتول فاطمہ۔ عثمان علی۔

نکہت: آداب امّی جان!

بتول فاطمہ: جیتی رہو نکہت بیٹی! خوش رہو۔ اچانک بڑی جلدی آنا ہوا۔

نکہت: بس ممی وہاں من نہیں لگ رہا تھا اس لئے واپس آ گئی۔

بتول فاطمہ: اچھا کیا کہ آ گئیں۔

نکہت: یہ آپ چائے لے کر کہاں جا رہی ہیں؟

بتول فاطمہ: عثمان علی کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔ وہ اپنے کمرے میں لیٹا ہے اسی کے لئے لے کر جا رہی ہوں۔

نکہت: (پریشان ہوتے ہوئے) ارے کیا ہوا انہیں!

بتول فاطمہ: کچھ خاص نہیں ہلکا سا سر میں درد تھا۔ سوچا چائے دے دوں' ٹھیک ہو جائے' تھکان ہوگی۔

نکہت: لائیے میں دے دوں

(نکہت چائے لے کر جاتی ہے اس کے دور ہوتے قدموں کی آواز) عثمان علی کے کمرے کے دروازے پر کھنکھارتی ہے)

نکہت: (خود کلامی کے انداز میں) یہ کہاں کھوئے ہوئے ہیں۔ میرے قدموں کی آہٹ بھی نہیں جان پائے۔

(دروزاے پر دستک دیتی ہے)

ٹھک.... ٹھک... ٹھک۔

نکہت: (دھیرے سے) آج یہ کہاں کھوئے ہوئے ہیں اتنا تھکا ہوا میں نے انہیں دیکھا ہی نہیں۔ میرے آنے کی خبر تک نہیں لی۔ کہاں کھو گئے ہیں....(تیز آواز میں) چائے ٹھنڈی ہو رہی ہے۔

(چائے ٹھنڈی ہو رہی ہے..... یہ جملہ عثمان کو دس سال پہلے کی دنیا میں پہنچا دیتا ہے جب اسی طرح دروازے پر کھڑی ہو کر سائرہ نے تیز آواز میں کہا تھا)

سائرہ: (شوخی سے تیز آواز میں) چائے ٹھنڈی ہو رہی ہے۔

عثمان علی: (شوخی سے) تمہارے گلے میں لاؤڈ اسپیکر فٹ ہے کیا؟

سائرہ: (ناز سے) جب لوگ توجہ نہ دیں تو انہیں اسی طرح مخاطب کرنا چاہئے۔

عثمان علی: (رومانٹک ہو کر) کہیے کیسی توجہ چاہتی ہیں آپ۔ کون سی خدمت لینا چاہتی ہیں آپ۔ بندہ حاضر ہے۔

سائرہ: یہ میری صحبت کا اثر ہے کہ بندہ اتنی اچھی اردو بولنا سیکھ گیا۔

عثمان علی: بندہ کیا...... بندے کے گھر والے بھی سیکھ چکے ہیں۔

(سائرہ اور عثمان علی کھلکھلا کر ہنستے ہیں)

عثمان علی: (ہنستے ہوئے) ہاں بولو! کس کے لئے چائے لائی ہو۔

سائرہ: سرکار کے لئے... سرکار کے کالج جانے کا وقت ہو گیا ہے اسی لئے چائے ناشتہ نوش فرمالیں۔

عثمان علی: حکم کی تعمیل ہوگی۔

(سائرہ چائے کی ٹرے کو میز پر رکھ کر جانا چاہتی ہے۔ عثمان علی راستہ روکتا ہے)

عثمان علی: ارے جناب! اتنی جلدی کیا ہے رخصت ہونے کی۔ ذرا دل کو قرار آ جائے تو چلی جائیے گا۔

سائرہ: (ناز سے) اچھا جی! آپ کے دل کو قرار کیسے آتا ہے۔ ذرا ہمیں بھی تو پتہ چلے۔

عثمان علی: (رومانٹک ہو کر) ذرا آنکھوں سے آپ کا شربتِ حسن پی لوں تو چلی جائیے گا۔

سائرہ: ایسی باتیں کرنا کہاں سے سیکھیں آپ نے!

عثمان علی: آپ سے.... جب سے آپ سے دوستی ہوئی ہے۔

سائرہ: اور دوستی کب سے ہوئی ہے!

عثمان علی: ہماری اور آپ کی پیدائش سے بھی پہلے۔ کیا تم نے سنا نہیں جوڑے آسمان پر لکھے جاتے ہیں۔

سائرہ: (جذباتی ہو کر) عثمان علی!

عثمان علی: ہاں سائرہ ہماری اس دوستی میں سمندر کی گہرائی ہے' آسمان جیسی وسعت ہے۔ تم سے وابستہ ایک جہان آباد ہے میرے اندر۔ تم کہیں بھی رہو' ہر پل' ہر گھڑی میری سانسوں میں' میری دھڑکن میں سمائی رہتی ہو۔

سائرہ: (جذبات سے بھرپور لہجے میں) بس.... بس! عثمان علی اس کے آگے کچھ نہیں۔ مجھے اتنی خوشی ایک ساتھ نہ دو مجھے جی لینے دو ان لمحوں کو.... میں تمہارے قریب آنا چاہتی ہوں...... بہت قریب..... اتنے قریب جتنا تمہارا دل تمہارے قریب ہے..... بہت قریب!

(عثمان علی اور سائرہ ایک دوسرے کے قریب آتے ہیں)

(فلیش بیک ختم ہوتا ہے)

نکہت: چائے ٹھنڈی ہو رہی ہے! کہاں کھوئے ہوئے ہیں آپ؟

(نکہت کرسی کھینچتے ہوئے عثمان علی کے قریب بیٹھتے ہوئے)

نکہت: (سمجھاتے ہوئے) میں جانتی ہوں سائرہ کی موت آپ کے لئے بہت بڑا دکھ ہے.....ہم سب کے لئے بہت دکھ کی بات ہے مگر کبھی کبھی دوسروں کی خاطر بھی جینا پڑتا ہے...خود کو سنبھالنا پڑتا ہے۔

عثمان علی: (دکھ سے) میں اپنے لئے کہاں جی سکا۔ جیا تو ہمیشہ دوسروں کی خاطر۔خود کو سنبھالا بھی تو دوسروں کے لئے۔ اپنی زندگی تو ڈھلان پر پھسلتا پتھر ہی بنی رہی......خیر! چھوڑو یہ سب! خوشبو کہاں ہے؟

نکہت: اپنے کمرے میں۔

عثمان علی: اسے کمرے میں اکیلا مت چھوڑو جانے کیا کررہی ہوگی۔

منظر: یازدہم

کردار: خوشبو اور آرزو۔

خوشبو: (گہرے غم زدہ لہجے میں دھیرے دھیرے) آج دوسری رات بھی آگئی.....اوراس طرح بے شمار راتیں مجھے کاٹنی ہیں.....میرے خدا اس اندھیرے میں میری مدد کر.....مجھے حوصلہ اور ہمت دے کہ سائرہ کی نشانی کو پروان چڑھا سکوں (گہری سانس لے کر) میرے پیارے ابو میں تو آپ کی چھوٹی بیٹی تھی میرے کمزور شانے پر آپ نے اتنا بڑا بوجھ ڈال دیا.....میں کیسے سنبھال پاؤں گی اسے۔

(خوشبو سسکیاں بھرتی ہے)

کہاں ہو سائرہ......میری بہن مجھے آواز دو۔ میں بہت اکیلی ہوں یہاں

(خوشبو کے رونے سے آرزو بھی جاگ کر رونے لگتی ہے)

آرزو: (روتے ہوئے) امی.....امی۔

خوشبو: (آرزو کو گود میں لیتے ہوئے) گڑیا رانی اگر آپ روئیں گی تو آپ کی امی آپ سے بہت دور چلی جائیں گی۔

(بچی روتی ہے)

آرزو: میری امی کہاں چلی گئیں.....کہاں ہیں وہ؟

خوشبو: (روہانسی ہوکر) یا خدا! کب تک عورت کا مقدر حاشیے پر لکھی تحریر رہے گا۔

(بچی مسلسل رو رہی ہے)

خوشبو: دیکھو آرزو! میں تمہیں ایک بہت اچھا سا گانا سناتی ہوں پھر تمہیں نیندیا رانی آکر سلادے گی۔

(خوشبو لوری گاتی ہے)

(اور کہانی فلیش بیک میں جاتی ہے)

اوراقِ دل

فاری شا

(اسلام آباد)

شائستہ فاخری کی کہانیاں پڑھتے ہوئے اچانک مجھے چھ دن سال پہلے کے دن یاد آ گئے۔ جب شائستہ کی طرح میں بھی جوان تھا اور متواتر لکھتا تھا۔ نہ کسی سے کہانی پر ڈسکس کرتا نہ کسی کو دکھاتا بس لکھے جاتا۔ ہر ہفتے ایک کہانی۔ ان دنوں میری کہانیاں روزنامہ کے اتوار ایڈیشن میں چھپتی تھیں۔

شائستہ کی تخلیقی ہنرمندی کے سوتے اچانک زمین پھوڑ کر چاروں سمت میں بہہ رہے ہیں۔ وہ نہ ابھی بندھے ہیں نہ دشا پائی ہے اور جوان امنگوں کی رفتار کے ساتھ مسلسل بہہ رہے ہیں۔

''سندھی بیلا'' کی کہانیاں پڑھتے ہوئے ایک بہت ہی حساس اور جذبات سے لبریز فکری ذہنیت کا پتہ چلتا ہے۔ تخلیق کار پر چھوٹے چھوٹے حادثوں کا گہرا اثر ہوتا ہے۔ وہ اسے مضطرب کر جاتے ہیں اور وہ ان خیالوں کی صف بندی کر کے انہیں کہانیوں میں پرو دیتی ہیں۔

میں نے مجموعے کی کئی کہانیاں پڑھی ہیں جن میں ''سندھی بیلا''، ''مت کہاں''، ''مانو یہ شکتی کی وجے''، ''پانی دیوتا''، ''سب شانتی ہے''، ''پر بھات''، ''لہو کی لالی'' وغیرہ اہم ہیں۔ ان میں کچھ نے مجھے بے حد متاثر کیا۔ مجموعے کی کہانی ''سب شانتی ہے'' پڑھ کر تو لگتا ہی نہیں کہ وہ کسی نئی تخلیق کار کی تخلیق ہے۔ فسادوں کا خوف ناک اثر عام آدمی کے دل و دماغ پر جیسے ہوتا ہے اس سے ایک انسان کی ٹریجڈی کے ذریعہ سے کہانی کار نے بہت ہی فنکارانہ انداز سے پیش کیا ہے۔ اس نئی کونپل والی لڑکی کے چکنے پتے بتا رہے ہیں کہ وہ کتنی ہونہار ہے۔ یقیناً نئے نئے تجربوں اور احساسات کے ساتھ فن وادب کا مشاہدہ و مطالعہ، محنت، ریاضت کی خوراک پا کر یہ ہونہار لڑکی ایک دن ادب کو اپنے سایے میں لے لے گی۔

شائستہ کی صلاحیتوں کا خود بخود پھوٹنے والا ابھرنا امید ہے جلد ہی سمت کا تعین کر لے گا۔ تجربوں کی بے شمار دھارائیں اس میں آ ملیں گی۔ اور یہ دریا ادب کے میدان کو خوب سیراب کرے گا۔ میں اس ابھرتی ہوئی کہانی کار کے روشن مستقبل کی دعائیں کرتا ہوں۔

(اوبندر ناتھ اشک)

شائستہ فاخری نے ہمارے موجودہ عہد کی جس الم ناکی کو ایک فنکار کی ایمانداری، فکری عصبیت کے ساتھ اپنے افسانوں میں پیش کیا ہے۔ اس سے متاثر ہونا ایسے قاری کے لیے جو تخلیقی ادب میں عصری حسیت کو پوری گہرائی اور گیرائی کے ساتھ دیکھنے کا متمنی ہو عین فطری ہوگا۔

مجھے یقین ہے شائستہ فاخر کے یہ افسانے خود ان کے تعارف کے لیے تو راستہ ہموار کریں گے ہی اس کے ساتھ ساتھ نئے اردو افسانے میں علامت، ابلاغ، اظہار اور زبان و بیان کے وہ سارے مباحث کو ختم کر دینے میں بھی معاون ثابت ہوں گے جن کی پرچھائیوں نے گذشتہ پندرہ بیس برسوں میں اردو افسانے پر ایک دبیز پردہ ڈال رکھا ہے۔

(رام لعل)

شائستہ فاخری عصر حاضر کے چاک پر فنی ہنرمندی اور تکنیکی تنوع کے ساتھ کورے اور خوبصورت افسانے ڈھال رہی ہیں۔ تصوف اور روحانیت سے آگہی، اساطیر کے درک اور نفسیاتی بصیرت سے انہوں نے ایک نئے فکری نظام کی تشکیل کی ہے۔ خواب اور حقیقت کے امتزاج سے وہ ایک ایسی فضا تعمیر کرتی ہیں جہاں ہماری اپنی دنیا کے جیتے جاگتے کردار کبھی پرندے بن کر اڑنے لگتے ہیں کبھی مچھلی کا روپ اختیار کر لیتے ہیں تو کبھی ان کا نصف جسم پتھر کا ہو جاتا ہے اور سینے سے دودھ کی بوندیں ٹپکنے لگتی ہیں، کبھی اندر کا خوف انسانی شکل میں سامنے آ کھڑا ہوتا ہے، کبھی بے جان پینٹر تشنہ جذبات کی آسودگی کا سامان بن جاتا ہے کبھی وہ دو جسموں کے درمیان سے غائب ہو کر انہیں نئی لذتوں کے احساس سے ہم کنار کرتا ہے۔ شائستہ فاخری نے جنسی موضوعات کو اسی فن کارانہ رکھ رکھاؤ کے ساتھ برتا ہے جو ایلورا اور کھجورا کے بت تراشوں سے منسوب ہے۔ ان کے افسانوں کی عورت عزم و حوصلے کی علامت ہے اس میں زندگی سے لڑنے اور جینے کی شدید ترین خواہش موجود ہے۔ شائستہ فاخری کی زبان منجھی ہوئی ہے اور تخلیقیت کی نئی شقیں وا کرتی ہیں۔ ''خوف گنبد میں روشن آنکھیں'' ''اداس لمحوں کی خود کلامی'' ''چل گوئیاں سنگ بیٹھیں'' ''صوفی آپا'' اور ''دو خطوں کی دنیا'' اہم افسانے ہیں۔ شائستہ فاخری ہماری دانشورانہ روایت کی امین ہی نہیں بلکہ تسلسل بھی ہیں۔

(پروفیسر بیگ احساس)

شائستہ فاخری معاشرے کا بھرپور شعور رکھتی ہیں۔ اس کا بہتر استعمال اور کیا ہو سکتا ہے کہ اسے افسانے میں اپنے شعور کا استعمال کیا جائے۔ شائستہ فاخری نے وقت کے اتار چڑھاؤ کو شدت سے محسوس کیا اس کے کرب کو اپنے ذہن کے پردے پر محسوس کیا پھر اپنے قلم کو جنبش دی اور افسانوں کا تانہ بانہ بنتی رہیں۔ موضوع، مواد، طرزِ اظہار، زبان و بیان اور لب و لہجہ کے اعتبار سے موصوفہ کے افسانے منفرد ہیں۔ مظلوم اور پسماندہ طبقے کے لیے آواز اٹھانا ان کی خوبی ہے۔

شائستہ فاخری کی علمی، ادبی اور تخلیقی خدمات اور بصیرت افروز خیالات سے ادبی دنیا آشنا ہے۔ موصوفہ ادبی عصبیت اور سستی شہرت کے حصول کے لیے نہیں بلکہ سماج کو اک نئی دشا دینے کے لیے لکھتی ہیں۔ سماجی مسائل کے الجھاؤں سے چھٹکارہ دلانا چاہتی ہیں۔ وہ اپنی بات ایک شاعرہ بن کر بھی نئے

لب ولہجہ کے ساتھ اپنی نظموں میں پیش کرتی ہیں۔ان کے افسانے اتنے پائیدار ہوتے ہیں کہ قاری کے ذہن کو جھنجھوڑ کر رکھ دیتے ہیں۔

(احسن امام احسن)

''چل گوئیاں سنگ بیٹھیں'' بالائی متوسط طبقے کے خوش حال گھرانوں میں جوائنٹ فیملی کے انہدام نے بوڑھے بزرگ عمر دراز لوگوں کے لیے تنہائی کا بھیانک مسئلہ کھڑا کر دیا ہے۔افسانے کے عنوان سے ہی یہ کرب واضح ہو جاتا ہے ورنہ گاؤں کی بولی میں ''بیٹھیں'' کی جگہ کھیلیں ہوتا ہے۔کھیلنا تو دور کی بات اب تو سنگ بیٹھنے والوں کے بھی لالے پڑ گئے۔شائستہ فاخری کو بھی اس موضوع سے بڑی ہمدردی ہے۔اس مجموعے کا افسانہ ''آخری پہر کا ڈوبتا منظر'' بھی اس موضوع پر ہے مگر اس افسانے کی خاص بات یہ ہے کہ بیگم صاحب اپنی رفیق ایک نوکرانی کو بتاتی ہیں اور اس چڑی کے بچے کو بھی گود لینا چاہتی ہیں جس نے ان کے سنگاردان کے پیچھے گھونسلہ بنایا ہے۔بچے نکلے ہیں۔مسئلے کی سنگینی کا اندازہ لگائیے کہ وہ چڑی بھی رفاقت کی پیش کش کو قبول نہیں کرتی بچوں کو لے کر اڑ جاتی ہے۔دراصل یہ Motherhood کی داستان ہے۔بچوں کو ماں ہر طرح کی آفات سے بچاتی ہے۔جب عمر کے کارواں کا آخری پہر آتا ہے بچوں کی سخت ضرورت ہوتی ہے تب وہ گھونسلے لے کر اڑ جاتے ہیں۔مولانا آزاد نے بھی جیل میں ایک افسانہ لکھا تھا ''چڑے چڑی کی کہانی'' مگر ان کو چڑیوں کی رفاقتیں میسر آئی تھیں وہ دور رفاقتوں اور رشتوں کا سنہرا دور تھا۔مشرق تنہائی کے آزار میں مبتلا نہ تھا۔اس افسانے میں آزاد نے بھی ملازم اور چڑے چڑی کو دوست اور ہمراز بنایا تھا مگر آج بیگم صاحب اور ملازمہ بھی اس آزار میں مبتلا ہیں۔یہ دونوں اپنے اپنے گھر چڑیوں کی طرح لیکر اڑ نہیں سکتیں۔اب تنہائی ان کا مقدر ہے۔شائستہ فاخری کو ان سے بے حد ہمدردی ہے۔گو یہ کہانی آزاد کی کہانی سے بالکل مختلف نوعیت کی ہے اور آج کے معاشرتی حقائق پر اس کا پورا انطباق ہوتا ہے۔

مجموعے میں شامل افسانوں کو پڑھ کر موضوعاتی وحدت (Themetic Centinuity) تو نظر نہیں آتی مگر مرد وزن کے رشتوں کی نفسیات اور اس کی کارفرمائیاں بیش از بیش ہیں۔اندازہ ہوتا ہے کہ مصنفہ کسی انجانے کرب سے جوجھ رہی ہیں اور اضطراب کی زد میں ہیں۔ وہ اس Syndrome سے باہر آنے کے لیے رشتوں کے آفاق کی تلاش میں ہیں جس کے لیے ''اداس لمحوں'' میں بھی بڑی خلوص نیتی سے سرگرداں ہیں۔زندگی کر رہی ہیں۔اسی لیے تو ''کسی کے حصے کا درد بانٹوں، کسی کے چہرے کا کرب لکھوں، کسی کے اندر نئے نئے سے جہان ڈھونڈوں، نئی نئی سی دنیا، نئے نئے آسمان ڈھونڈوں۔ ''اداس لمحوں کی خود کلامی، کے مقتبس مصرعوں سے ہمیں اندازہ ہوتا ہے کہ تخلیقیت شائستہ فاخری کے افسانوں کی زبان کا حصہ ہے اور یہ بھی کہ وہ ترسیل کی زبان لکھتی ہیں، سادہ اور شستہ زبان۔اسلوب میں طنز وفلسفہ کی آمیزش ان کے فن کو شناختی وصف بخشتی ہے۔کہیں کہیں شعری وجدان اور اساطیری بیانیہ کا بھی احساس ہوتا ہے۔امید کہ حرارت آفریں اور تازہ کار افسانوں کا مجموعہ ہماری قرأت کو ضرور متاثر کرے گا۔

(انیس رفیع)

کماری شائستہ فاخری ''مشلا کا'' ہندی کی ابھرتی ہوئی تخلیق کار ہیں۔وہ ابھی دور طالب علمی میں ہیں۔لیکن انھوں نے شاعری، کہانی، نثر وغیرہ کی تخلیق میں جس طرح کی صلاحیتوں کا مظاہرہ کیا ہے وہ ان کے روشن مستقبل کی نشاہدی کرتی ہیں۔

''سندھی بیلا'' (ہندی افسانوں کا پہلا مجموعہ) میں انہوں نے فطرت کی رنگا رنگی میں علامتی انداز میں زندگی کے حساس موضوعات کو اس ڈھنگ میں پیش کیا ہے جو کہیں کہانی اور کہیں نثری نظم کی دھوپ چھاؤں کے تانے بانے سے بنے جان پڑتے ہیں۔

زندگی کے تئیں کماری شائستہ کی تیز روی ان کی حساس طبیعت سے پورے طور پر آشکارا ہے جو ہر ایک تخلیقی عمل کا لازمی حصہ ہے۔اس تخلیق کار کے روشن مستقبل کے لیے میری نیک تمنائیں ان کے ساتھ ہیں۔

(مہادیوی ورما)

آپ کا مجموعہ ''اداس لمحوں کی خود کلامی'' دیکھ کر بہت خوشی ہو رہی ہے۔ماشاءاللہ آپ بہت اچھا لکھ رہی ہیں۔کولکتہ میں آپ سے افسانہ سنا تھا۔مختلف رسالوں میں پڑھتا رہتا ہوں۔خوشی ہوتی ہے کہ نئی نسل میں آپ جیسے ہونہار لکھنے والے موجود ہیں۔

(عبدالصمد)

کہانی ''اداس لمحوں کی خود کلامی'' شاہکار کی حیثیت رکھتی ہے۔عصمت چغتائی کی ''لحاف'' مجھے کمزور لگی۔لیکن آپ کی اس کہانی میں علامتیں اتنی واضح اور خوبصورت ہیں کہ کھلتی ہی چلی جاتی ہیں۔پینٹنگ ایک ایسا استعارہ ہے جو عورتوں کی نفسیات کو مضبوطی سے سامنے رکھتی ہے۔میرے لیے یہ حیران کر دینے والی دنیا ہے۔یہ کہانی ''لحاف'' سے بہت بڑی ہے۔شہر خموشاں، عورت ہونے کا احساس، پینٹنگ، گیلی قبریں، روبینہ علی جیسی لڑکیاں، وارڈن۔۔۔اور ڈسٹ بن میں رکھے ہوئے پینٹنگ۔۔۔آپ نے سوچا بھی نہ ہوگا کہ کہانی کیا سے کیا بننے جا رہی ہے۔۔۔عصمت کی لحاف ہلنے لگی۔۔۔دیوار پر ہاتھی جھولنے لگا، یہ اس کان کی ناکامی تھی اس لیے مجھے عصمت کی لحاف میں کہیں سے بھی ترقی پسندانہ رنگ نظر نہیں آیا۔لیکن آپ کی کہانی پہلی سطر سے آخر سطر تک بہت کچھ سوچنے پر مجبور کرتی ہے۔غالب نے کہا تھا کچھ اور چاہیے وسعت میرے بیاں کے لیے۔۔۔تو یہ وسعت یہاں موجود ہے۔

(مشرف عالم ذوقی)

شائستہ فاخری کا نام موجودہ افسانہ نگاروں میں ایک اہم نام ہے کیونکہ انہیں زندگی میں بکھرے ہوئے واقعات کو سلیقے سے سمیٹنے کا ہنر آتا ہے۔

یہی وجہ ہے کہ ان کے بعض افسانے دل کو چھو جاتے ہیں۔ مثلاً کہانی ''ایک جانور'' میں انہوں نے اشرف المخلوقات کہے جانے والے انسان کو جس طرح جانوروں کی زبانی بے نقاب کیا ہے یا افسانہ ''ریچھ'' میں انہوں نے مرد کی ہوس ناکی کو اشاروں اشاروں میں جس نفسیاتی طریقے سے پیش کیا ہے یا ''خالی گھونسلہ'' جس خوبصورتی سے ایک مالدار عورت کی بے بسی کی داستان سناتا ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ شائستہ فاخری کہانی کہنے کا ہنر خوب جانتی ہیں۔ کہانی وہی کامیاب کہلاتی ہے جب کلائمکس میں پہنچ کر قاری کو ایک دھچکے کا احساس ہو۔ اس مجموعے (ہرے زخم کی پہچان) میں شامل کہانیاں اس معیار پر پوری اترتی ہیں۔ اگر وہ اسی طرح لکھتی رہیں تو ان کا قلم اور رواں ہوگا، ایسی مجھے امید ہے۔

(آصفہ زمانی)

آج جب میں شائستہ فاخری کے افسانے پڑھ رہا ہوں تو سوچتا ہوں کہ شائستہ فاخری نے اس عہد کی ''عورت'' ہونے کا کفارہ ادا کرنے کے لیے جو خوبصورت افسانے لکھے ہیں وہ اس عہد کے بھیانک سچ ہیں جو دلوں میں خوف کی صلیب بن کر لٹک رہے ہیں۔ ان افسانوں میں لوگوں کے جذبات، احساسات زندگی کو برتنے کے طور طریقے کی ہو بہو تصویر پیش کی گئی ہے۔ لیکن یہ واقعات تمام تر سچ ہونے کے باوجود سیدھے سپاٹ سچ نہیں ہیں۔ بلکہ ان میں کہانی پن پوری قوت سے موجود ہے۔ اور یہی کہانی پن قاری کی توجہ کو بھر پور انداز میں اپنی گرفت میں لیے رکھتا ہے اور میں سمجھتا ہوں کہ یہی شائستہ فاخری کی ایک بہت بڑی کامیابی ہے۔

شائستہ فاخری نے اپنے مختصر افسانوں میں خطیبانہ، واعظانہ اور ناصحانہ انداز اختیار نہیں کیا بلکہ سادگی کے ساتھ بیانیہ انداز میں معاشرے کے افراد کی کمزوریوں اور اچھائیوں کو واضح کیا ہے۔ وہ عام فہم رواں اور سادہ زبان کے ذریعے قاری کے ذہن میں اتر جاتی ہیں، اپنے افسانوی کرداروں کے ذریعے ہماری روزمرہ کی زندگی کا تجزیہ کرتی ہیں۔

شائستہ فاخری مختصر افسانے کے فنی رموز سے بخوبی آگاہ ہیں۔ مختصر افسانہ نویس کی حیثیت سے شائستہ فاخری کی کامیابی کا ایک راز یہ بھی ہے کہ وہ مطالبات فن پر خاص توجہ دیتی ہیں۔ مثلاً پلاٹ کی تعمیر میں ان کی سلیقہ مندی افسانہ کو چار چاند لگا دیتی ہے۔ پیش پا افتادہ واقعات قابلِ توجہ بن جاتے ہیں، عام حالات میں جن چیزوں پر ہم اچٹتی سی نظر ڈال کر گزر جاتے ہیں یک لخت اہمیت حاصل کر لیتی ہیں۔

شائستہ فاخری کے افسانوں میں حقیقت بینی اور حقیقت پسندی ملتی ہے۔ انہوں نے شفاف آنکھوں سے معاشرے کے اچھے اور برے گوشوں کو جانچا اور پرکھا ہے، ہمارے گردو پیش کی اوجھل حقیقتوں کو شگفتہ اور سلیس پیرایۂ اظہار میں قاری تک پہنچایا ہے۔ ان سے اردو افسانہ میں روشن مستقبل کی امیدیں ہیں۔

(پروفیسر صغیر افراہیم)

شائستہ فاخری خواتین افسانہ نگاروں کی صف کی ایسی افسانہ نگار سامنے آئی ہیں جن کے افسانوں میں کہانی پن بھر پور طریقے سے نظر آتا ہے۔ انہوں نے کہانی کی بنت کاری میں علامتوں کا بھی استعمال کیا ہے لیکن انتہائی کمال ہنر مندی اور فنی ریاضت کے ساتھ۔ ''سنور قیہ باجی'' سرخاب ابھی زندہ ہے''کوکھ''، ''گنبد خوف میں روشن آنکھیں'' اس کی روشن مثالیں ہیں۔

شائستہ فاخری نے فن کو اظہار مطالب کا وسیلہ بنایا ہے اور سچی اور کھری بات کو دوٹوک طریقے سے قاری تک پہنچانے کی سعی کی ہے۔ فنی طور پر ان کے افسانے اردو افسانے کی اس روایت سے منسلک ہیں جس میں واقعہ اور کرداروں کے ٹھوس پن پر زور دیا جاتا ہے اور واقعہ کو اس کے تمام جزئیات سمیت پیش کرنے کو فنی معراج سمجھا جاتا ہے۔ شائستہ فاخری نے اس روایت پر مبنی اپنی کہانیوں کی عمارت استوار کی ہے اور اس میں وہ حد درجہ کامیاب ہوئی ہیں۔ شائستہ فاخری کے بعض افسانوں کو کردار کے افسانے کہا جا سکتا ہے۔ اس سلسلے میں ان کی قوت مشاہدہ اور جزئیات نگاری میں چابکدستی کی داد دینا پڑتی ہے۔ شائستہ فاخری کے افسانوں کے کرداروں میں کنور فتح علی، صوفی آپا، جھبری، منگلا، زینی، تازار، رحمو بابا، مس صمدانی ایسے کردار ہیں جن کی دنیاؤں کا بڑا عمیق مطالعہ انہوں نے کیا ہے۔

شائستہ فاخری کا موضوع سے ان کرداروں کا آپس کا رشتہ اور تعلق ہے ان کی کوشش ہوتی ہے کہ وہ ان کرداروں کو ان کی گفتگو اور اعمال کے ذریعے ظاہر کریں۔

خواتین افسانہ نگاروں کے قافلے میں نئی نسل کی افسانہ نگار شائستہ فاخری معاشرے کی نبض شناس بن کر معاشرے کی تفہیم کر رہی ہیں، بالخصوص عورت کے حوالوں سے اپنے افسانوں کو متوازن بنا کر پیش کر رہی ہیں جسے خیال اور فہم و ادراک کا تسلسل کہہ سکتے ہیں۔ میں پرامید ہوں کہ شائستہ فاخری کا افسانوی سفر اسی آب و تاب کے ساتھ اکیسویں صدی میں جاری رہے گا۔

(پروفیسر عاصم شاہنواز شبلی)

شائستہ فاخری کی افسانوں کی قرأت اس احساس کو جگاتی ہے کہ وہ کہانی گھڑتی نہیں بلکہ معاشرے میں رونما ہونے والے حادثات، واقعات، سانحات اور حقائق کو دردمندی سے پیش کرتی ہیں۔ ان کے افسانوں کا کرافٹ افسانوی روپ کو کچھ اس طرح دھار لیتا ہے کہ وہ صرف اور صرف افسانہ ہی لگتا ہے۔

شائستہ فاخری کے افسانوں میں سب کچھ نیا نہیں اور نہ ہی نامانوس مگر افسانہ نگار کا کمال ہے کہ وہ نئے اور مایوس کرداروں سے گزارتی ہیں۔ ان کا اسلوب ان کے افسانوی فن کی زبردست تخلیقی قوت ہے۔

شائستہ فاخری کی افسانوی ادب میں آمد فال نیک ہے۔ ادھر وہ بڑی سرعت کے ساتھ افسانے تخلیق کر رہی ہیں۔ ان کی افسانوی ریاضت اور تخلیقی اپج کی رفتار اسی طرح جاری رہی تو وہ اردو کے افسانوی سرمایے میں وقیع

اضافے کا ضامن ہوگا۔

(حمید سہروردی)

شائستہ فاخری کا افسانہ ''خوف گنبد میں روشن آنکھیں'' خوف الٰہی پرمبنی ہے۔اس افسانے میں افسان نگار نے ایک عورت کو لے کر افسانہ بنا ہے۔ افسانے میں عورت کو مرکزیت حاصل ہے۔ وہ ایک ایسی عورت ہے اس نے اپنی اوائل جوانی میں گناہ کیے تھے اور وہ گناہ کا بوجھ اس کی زندگی میں تادم آخر رہا۔ اس کی الجھنوں اور مسائل کو سلجھانے کے لیے ایک درویش کا کردار اہم ہے۔ وہ صوفیانہ باتوں کے ذریعہ اس عورت کے مسائل کا حل بتانے کی سعی کرتا ہے۔ افسانہ ''خوف گنبد میں روشن آنکھیں'' کو افسانہ نگار نے ایک شائستہ اسلوب میں ڈھالا ہے۔ درویش کی باتوں سے وہ عورت متاثر ہو جاتی ہے۔ درویش عورت کو پرندے میں تبدیل کرتا ہے اور سیر کرواتا ہے۔ افسانے میں ''الف'' پر زور دیا گیا ہے۔ افسانہ نگار نے کہا ''الف'' کی ہر سمت رنگینی پھیلی ہوئی ہے۔ ''الف'' کو علم تصوف میں ایک خاص مقام حاصل ہے۔

افسانے میں ''الف'' کا استعمال اللہ تعالیٰ کی وحدانیت کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ وہ عورت دراصل یہاں علامت کے طور پر آئی ہے۔ اصل میں افسانہ نگار کے بقول وہ اپنا ضمیر ہے اور اپنے اندر کا نور ہے جس سے روحانیت، وحدانیت میں تبدیل ہوتی ہے۔ افسانہ ''خوف گنبد میں روشن آنکھیں'' میں خوف، خوف الٰہی ہے اور روشن آنکھیں یعنی اپنے اندر کی روشنی ہے کیوں کہ انسان اندھیرے سے اجالے کی طرف سفر کرتا ہے۔ افسانہ ذکر الٰہی اور خوف الٰہی سے روشن اور تابناک ہے۔ جس سے تصوف کی کرنیں منکشف ہوتی ہے۔

(غضنفر اقبال سہروردی)

میں نے آپ کے بعض افسانے تو پہلے ہی پڑھ لئے تھے۔ ''شعر وحکمت'' میں بھی آپ کا گوشہ توجہ طلب ثابت ہوا تھا۔ ادھر میں نے باقی افسانے بھی پڑھ ڈالے۔ آپ کے اندر تو حکائی انداز بیان اور کہانی سنا کر تجسس پیدا کرنے کی فطری صلاحیت موجود ہے۔ مجھے آپ کے بیشتر افسانے پسند آئے۔ افسانہ پن کے سبب بھی، فن پر دسترس کے باعث بھی اور مسائل و موضوعات کو افسانہ بنا لینے کی ہنرمندی کی وجہ سے بھی۔ آپ کے افسانے 'اداس لمحوں کی خود کلامی' 'خوف گنبد میں روشن آنکھیں' اور 'مٹی کا بدن' خاص طور سے پسند آئے۔ میری طرف سے اس قدر عمدہ افسانوں پر مبارکباد قبول فرمائیں۔

پروفیسر ابوالکلام قاسمی

شائستہ فاخری کے ایک سے بڑھ کر ایک افسانے کو دیکھنے کے بعد لگتا ہے کہ عورت فطری طور پر تخلیق کار ہوتی ہے۔ اسے تخلیقی ہنر خود فطرت سکھاتی ہے۔ ادب عالیہ کے ضمن میں نظریہ ہے کہ کسی شاہکار کے پیچھے زمانہ، ماحول اور نسل کارفرما ہوتے ہیں۔ شائستہ فاخری جس خانوادے سے تعلق رکھتی ہیں وہ ہندوستان کا جانا مانا دائرہ شاہ اجمل کا خانقاہی ماحول ہے جہاں سے روحانیت اور تصوف سے لوگ باگ فیض یاب ہوتے رہے ہیں۔ خود شائستہ فاخری کی سرشت میں تصوف اور سیکولر عناصر کے ساتھ ساتھ جدید دور کی تانیثی حقیقت، عصری حسیت اور ہر پل بدل رہی سماجی بیداری بھی شامل ہے۔ ان کے یہی فطری اور فکری سروکار ان کی افسانوی دنیا کی تخلیق میں کارفرما ہو کر ان کے افسانے کے نمایاں اوصاف بن جاتے ہیں۔

تانیثی حقیقت نگاری اردو ادب میں کوئی نئی بات نہیں ہے لیکن اس پر لکھنے والی خاتون افسانہ نگاروں میں معدودے چند نے ہی بلا خوف تردید قلم اٹھانے کی جرأت کی ہے۔ ان میں محمدی بیگم، رشید جہاں، رقیہ سخاوت حسین عصمت چغتائی، صغریٰ مہدی، واجدہ تبسم کے ساتھ شائستہ فاخری کا نام بھی جڑ جاتا ہے۔ انھوں نے عورت کے عمرانی تفاعلات کے ساتھ ساتھ ان کے اندرون میں جھانک کر اُن کی داخلی، نفسیاتی اور جنسی گتھیوں کی موشگافی کرنے کی بھی کوشش کی ہے۔ یہاں کمال کی بات یہ ہے کہ ایسا کرتے وقت فنی اور تکنیکی تلازمے کے ساتھ بھی انھوں نے پورا پورا انصاف کیا ہے جس سے ہماری کہانیوں کے افق میں یقینی طور پر وسعت پیدا ہو جاتی ہے۔ ان کے بیشتر افسانے فلیش بیک تکنیک پر لکھے گئے ہیں۔ کردار نگاری میں بسا اوقات تحلیل نفسی سے کام لیا ہے۔ ان کی بعض کہانیوں میں مافوق الفطرت عناصر کے استعمال سے بھی ماجرا بننے کی مثالیں موجود ہیں۔ اس قبیل کے افسانوں میں صوفی آپا، منگلا کی واپسی، گنبد خوف میں روشن آنکھیں، اداس لمحوں کی خود کلامی کو سرفہرست رکھا جا سکتا ہے۔

(ڈاکٹر پرویز شہریار)

معاصر کہانی کا چہرہ آج کچھ زیادہ پیچیدہ اور جدید ہو گیا ہے۔ لیکن معاصر ہونا صرف وقت کے بیچ ہونا نہیں ہے۔ معاصر کا مطلب ہے وقت اور زمانہ کے سارے دباؤں کو اپنے اندروں میں حلول کر کے اپنے وقت کے منظر اور پس منظر میں پہچاننا۔ براہ راست زندگی سے اپنا ہوا پانی کھینچتے ہوئے شائستہ فاخری کی کہانیاں زندگی کی کچی پکی چوٹیں ہیں، دکھتے جوڑ ہیں۔ ان کہانیوں کو دیکھ کر لگتا ہے کہ ہر غم جھیلنے لائق اور ہر دکھ قابل برداشت ہے۔

(ممتا کالیہ)

شائستہ فاخری کی کہانی 'عالم خاک آب وباد' کا کیا کہنا۔۔۔

شائستہ فاخری کی کہانی نے تصوف کی تہوں کو کھولا ہے۔ اناالحق انکسار کی آخری منزل ہے، جہاں عالم استغراق میں ڈوبا کوئی صوفی اناالعبد نہیں کہہ سکتا کہ یہ غرور اور دوئی کی منزل ہے۔ انسانی خواہشات وجذبات سے پرے، عقل وخرد سے ماورا یہ عجب معمولات قلندری ہیں۔ دراصل یہ جہان قلندری ہی ہے جہاں عبد ومعبود میں کوئی فرق نہیں رہ جاتا۔ من تو شدم تو من شدی۔ فلسفہ کی اس شق کو کریدنا اور اس پر کہانی لکھنا اور ایسی پُراثر کہانی لکھنا واقعی کمال ہے۔۔۔ شائستہ فاخری کی کہانیوں کا کوئی مجموعہ تو نظر سے نہیں گزرا مگر رسائل میں پڑھی کہانیوں سے لگا تھا کہ 'پنک پینتھر' ان کا اب تک کا حاصل ہے مگر خوشی کا مقام ہے کہ

موجودہ کہانی کولکھ کرانہوں نے بہت ہی بلند منزلیں ایک ساتھ طے کر لی ہیں۔ یہ کہانی بہت دنوں تک یادرہیگی۔شائستہ فاخری کے ساتھ آپ بھی مبارکباد کے مستحق ہیں کہ بہت عرصہ بعد ایک اچھی کہانی پڑھنے کا موقعہ فراہم کیا۔

رضا جعفری

آپ کا افسانہ ''صوفی آپا'' ہم نے تین بار پڑھا۔عرصہ بعد بیانیہ طرز کے سہارے مکمل ہندوستانی، مسلم خانوادہ و ماحول کو پیش کرتے ہوئے صنف نازک کے عالی کردار کو ہی نہیں بلکہ اس کے بےغرض الفت وقربانی کودکھا کر دل کو موہ لینے والی کہانی دی گی ہے۔شائستہ کی یہ کہانی ہر دور میں پسند کی جائیگی۔کہانی زبان اور قلم دونوں سے پیش کی جاتی ہے۔قصہ گوئی پرانا فن ہے۔اس جدید دور میں فنِ 'قصہ گوئی' نے تحریری شکل میں آکر تو اپنا وقار اور بھی بلند کیا ہے۔اور ادب سے وابستہ قلم کاروں نے کہانی کےفن کو دوام بخشا ہے۔شائستہ کی تحریر میں کردار و ماحول اور پلاٹ کو جاندار شاندار بنانے والی عمدہ خوبی ہے۔جو قاری کو اپنے بہاؤ میں لے کر، اپنی کشش میں لے کر آہستہ خرامی سے کلائمکس کے دروازے پر کھڑا کر دیتی ہے'صوفی آپا' تو ایسی ہی کہانی ہے۔اس طرز کی کہانی ہے جو سدا زندہ رہیگی۔ ایسے ہی جیسے ممتاز کہانی کار قاضی عبدالستار کی کہانی 'پیتل کا گھنٹہ' ہے۔جسے آج بھی فنِ افسانہ نویسی میں بلند و بالا جگہ پر تخت نشیں کیا جاتا ہے۔'صوفی آپا' افسانے میں افسانوی فن کی تمام بلندی کے ہم صفت ومعیار کو پیش کیا ہے۔خاص طور سے اس افسانے کا خاتمہ قاری کو کئی جہتوں میں غور وفکر کی دعوت دیتا ہے۔اہم یہ کہ اسلامی ثقافت وعمل کو صاف اجاگر کرتا ہے۔شائستہ کو ایسی عمدہ ومعیاری کہانی اردو قارئین نیز اردو ادب کو دینے کے لئے دلی مبارکباد پیش کرتا ہوں۔

عبدالباقی

میں ایک عرصے سے آپ کی تخلیقات پڑھ رہا ہوں، اور مجھے حیرت ہے کہ آپ نے جب سے قلم سنبھالا، آپ کا فن مسلسل ارتقائی منزلیں طے کر رہا ہے۔بہت کم ایسے قلم کار ہیں جو شہرت ملنے کے بعد اپنے آپ سے انصاف کر پاتے ہیں، کچھ تو شہرت کے جوش میں کمزور تخلیقات کا انبار لگا کر اپنے منصب کو سنبھال نہیں پاتے، اور کچھ کنفیوژن کا شکار ہو کر کچھ لکھ ہی نہیں پاتے، لیکن مجھے اس بات کی خوشی ہے کہ آپ ایک متوازن، باشعور ادیبہ ہیں اور اپنی شہرتوں سے گمراہ نہیں ہوئیں بلکہ خوب سے خوب تر کی جستجو میں منہمک ہیں۔میں نے آپ کی دونوں ناولیں پڑھیں، خصوصاً دوسری ناول میں تو آپ نے کمال کر دکھایا، زبان وبیان پر آپ کی حاکمانہ گرفت، عمدہ مکالمہ نگاری، قاری کو باندھے رکھنے والا تجسس اور بہترین کردار نگاری، آپ کی انفرادیت کو ثابت کرتی ہے ۔

افسانہ نگاری میں بھی آپ کی یہی انفرادیت قائم ہے۔موضوعات میں تنوع اور اسلوب میں ایک دلکشی ہے۔آپ جس موضوع پر بھی قلم اُٹھاتی ہیں، اُس کا حق ادا کر دیتی ہیں۔

نورالحسنین

☆

○

روان جس طرح چشمۂ سلسبیل
ہے یہ نظم دنیا کی سب سے طویل

امریکہ میں مقیم جناب نقشبند قمر نقوی بخاری اردو زبان وادب کے نہایت باہنر اور باکمال شخصیت کے مالک ایسے قلمکار ہیں کہ جو جب بھی اور جس صنف میں بھی طبع آزمائی کرتے ہیں تو اُس صنف کو نئے معنی ومفہوم بلکہ زبان بھی نئی عطا کر دیتے ہیں۔حال ہی میں آپ کی دو نایاب کتب منظرِ عام پر آئی ہیں۔پہلی کتاب دنیا کی طویل ترین نظم ''حماسہ'' کا پانچواں ایڈیشن ہے۔یہاں طویل ترین کا لفظ روا روی میں قطعاً نہیں تحریر ہوا۔یہ حقیقت اردو ادب سے وابستہ ہزار ہا لوگوں پر عیاں ہے کہ ''حماسہ'' اسلام کے اولین دور سے شروع ہو کر ہمارے عصر کو محیط ہے جس کے اب تک پانچ ہزار اشعار ہو چکے ہیں اور جوں جوں وقت پہلو بدل رہا ہے اُسی حساب سے نقشبند بخاری صاحب بھی مسلسل مسلم اُمّہ کی تاریخ وحالات منظوم کیے جاتے ہیں۔یہ ایسی کاوش ہے جو شاید اپنے طرز کی ایک منفرد اور جداگانہ حیثیت کی حامل ہے اگر ہمارے مزاج میں سیکھنے سمجھنے اور آگے بڑھنے کا مادہ باقی رہا تو یہ نظم رہنما کا فریضہ انجام دے گی۔

دوسری کتاب ''دل ہے آئینہ'' جس میں جناب نقشبند قمر نقوی بخاری کی شخصیت اور فن کی روشنی میں پچاس سے زائد اہلِ دانش نے مقالات و منظومات رقم کیے ہیں جس کے مطالعے کی روشنی میں جناب نقشبند قمر بخاری صاحب کی شخصیت اور کارناموں سے بخوبی آگاہی ہو رہی ہے اور ایک نئے باب العلم کا دروا ہو رہا ہے۔اس اہم کتاب کے مرتب جناب رئیس الدین رئیس ہر طرح سے لائق مبارکباد اور قابلِ ستائش ہیں۔

دستیابی: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، لال کنواں، دہلی، بھارت۔

''بُراقِ نور''

نعت

اسقدر میرے نبی کا گھر منوّر ہو گیا
ہم خلا بازوں کی بھی راہوں کا رہبر ہو گیا

وہ بُراقِ نور تھا سارے ستاروں سے بلند
یہ شٹل کی کھڑکیوں سے شب کا منظر ہوگیا

خُلد کے نزدیک تھے ہم اُس شبِ معراج کو
تم کرو اب رشک وہ میرا مقدّر ہوگیا

میں بھی اُس دعوت میں پہنچا آپ تھے جس میں شریک
جامِ کوثر اور اُس پر جام کوثر ہوگیا

شاعرِ حضرت محمدؐ ہوں میں اپنے وقت کا
حملۂ جبریل یہ مجھ کو بھی ازبر ہوگیا

خُلد کے صحراؤں میں قائم ہے اک طیرا نگاہ
اب تو چودہ سو برس سے وہ میرا گھر ہوگیا

بُت پرستی ہم بھی کرتے صفوتؔ دہرِ وجود
رحمت اللعالمیں کا رحم ہم پر ہو گیا

صفوت علی صفوت
(کنےکٹ،امریکہ)

نعت

کس درجہ ہے عجیب یہ شانِ رسول بھی
برسا کئے جہاں پہ رحمت کے پھول بھی

جب بھی چلا ہوں جانبِ کعبہ تو دشت کا
میرے لیے تو پھول بنا ہے ببول بھی

کرتے ہیں زندگی کو حقیقت سے روشناس
انمول گیان دیتے ہیں اُس کے اصول بھی

جس کی زبان پہ نامِ نبیؐ گونجتا رہا
اللہ نے درگزر کی ہے اُس کی تو بھول بھی

دولت ہے جس کے پاس بھی ایماں کی دوستو
اُس سے تو خوش ہی رہتے ہیں دیکھو رسول بھی

رنج و الم کی یورش کافور ہو گئیں
کِھل کِھل گئے ہیں جا کے وہاں تو ملول بھی

دیدار کی تو بات ہی پرویزؔ اور ہے
مجھ کو تو ہے قبول مدینے کی دُھول بھی

کرشن پرویز
(موہالی، بھارت)

من موہنی چوڑیاں

ڈاکٹر محمد مظفر الدین فاروقی
(یو۔ایس۔اے)

یہ کہانی نہ طوفان کی ہے نہ دیے کی بلکہ اس سرزمین کی ہے جہاں چنگھاڑتی موجوں کے طوفان آتے ہیں تو ہزاروں دیے بجھ جاتے ہیں۔ بجھے ہوئے دیوں کی تاریک سرائے فانی میں بکھرے ہوئے سرآمد انسانوں کے بے جان اجسام کو سپرد خاک کرنے کے بعد سرگشتہ انسان پھر سے چمن آرائی میں مصروف ہوجاتے ہیں۔ یہ تگ ودو پتہ نہیں کب سے جاری وساری ہے۔ تاریخ کے ایک زشت موڑ کر سراج الدولہ شہید کی روح نے انہیں پکارا تھا کہ ''میں نے اس سرزمین کی حنابندی کے لیے خون دیا تھا۔ تم صرف پسینہ ٹپکاؤ اور اس چمن کو سرسبز وشاداب رکھو۔ گیتا نجلی کے نغمے ان کے جذبات کے دھاروں کو منزل کا شعور عطا کرتے ہیں اور سپاہی شاعر کی گھن گرج سے انکا عزم لہروں کے قد سے ہم آہنگ ہوکر وہ بے تردّد کارچمن بندی کے لیے نکل پڑتے ہیں۔

جو کہانی میں لکھ رہا ہوں اس کے لیے اتنی گاڑھی اردو کی تمہید ضروری نہیں تھی۔ اتنا کہنا کافی تھا کہ یہ کہانی۔۔۔!!نہیں یہ کہانی نہیں ہے ایک حقیقی واقعہ ہے۔ یہ بنگال کے ایک چھوٹے سے گاؤں کے مضافات کا واقعہ ہے۔ یہ تو سب جانتے ہیں کہ بنگال کو آزاد رکھنے کے لیے سراج الدولہ نے اپنے خون کا نذرانہ پیش کیا تھا۔ رابندر ناتھ ٹیگور اور قاضی نذر السلام کے ذکر کی بھی کوئی ضرورت نہیں تھی۔ پر کیا کیا جائے کہ میں خود اپنے قلم کی افزونی سے نالاں ہوں جب بھی کوئی کہانی لکھنے بیٹھتا ہوں تو وہ بے قابو ہوکر وہ کچھ لکھ ڈالتا ہے جو میں لکھنے سے گریز کرنا چاہتا ہوں۔ خیر آپ نے یہ تمہید پڑھ ہی لی ہے اور دو ایک منٹ کے زیاں پر ناراض نہیں ہیں تب بھی میں معافی چاہتے ہوئے اصل کہانی کی طرف رجوع کرتا ہوں۔

میں نے کہا نا کہ یہ بنگال کے ایک خوبصورت گاؤں کے مضافات کا حقیقی واقعہ ہے۔ یہ گاؤں گنگا کے مغربی ساحل سے کچھ تین چار فرلانگ (فرلانگ میل کا آٹھواں حصہ) کے فاصلے پر واقع ہے۔ گاؤں کے مشرق میں ایک وسیع میدان ہے وہاں آم کے اونچے اونچے درخت استادہ ہیں۔ ان درختوں کے درمیان بیل گاڑی گزرنے کا ایک کچا راستہ ہے جو گاؤں سے گنگا کے ساحل تک جاتا ہے۔ آم کے درختوں کے بعد اس راستے کے دونوں طرف رنگ برنگے چھوٹے بڑے پتھر پھیلے ہوئے ہیں اگر آپ گنگا سے گاؤں کی طرف آئیں تو وہ رنگ برنگے پتھر اور ہرے بھرے قوی ہیکل درخت مل جل کر ایسا خوش نما منظر پیش کرتے ہیں کہ قدرت کی صناعی پر بے ساختہ کلمہ تحسین بلند ہوتا ہے۔ گاؤں کے شمال اور شمال مشرق میں ایک وسیع وعریض زرخیز زمین ہے جس کے ڈانڈے گنگا کے ساحل سے ملتے ہیں۔ یہاں گنگا کا ساحل بہت اونچا ہے جسے قدرت نے پشتہ بنادیا ہو۔ اس پشتہ کو کاٹ کر نہر نکالی گئی ہے جو اس زرخیز زمین کو سیراب کرتی ہے۔ اور حد نظر تک دیکھو اس میں چاول کی کاشت ہوتی ہے۔ سیکڑوں دھن مڑیوں کے بیچ ایک مسجد ہے۔ مسجد کے اندر کا حصہ اور صحن کو ملا لیا جائے تو کوئی سو سے زیادہ نمازی یہاں عبادت کرسکتے ہیں۔ گاؤں کے بیچوں بیچ صدیوں پرانا ایک خوبصورت مندر ہے اور مندر میں درگا ماتا کی مورتی نہایت شان وتمکنت سے وشرام کررہی ہے۔ مسجد اور مندر کی ایک مشترکہ انتظامیہ کمیٹی ہے۔ پجاری جی مسجد کے امام صاحب اور موذن کو چھوڑ کر انتظامیہ کمیٹی میں گیارہ ممبر ہیں۔ چھ ممبر ہندو اور پانچ مسلمان ہیں۔ گاؤں کا کسان نہایت خوش حال ہے۔ کیونکہ چاول کی کاشت سے وہ خاصی دولت کما لیتا ہے جب سال کے آخیر میں فصلیں کٹ جاتی ہیں تو ہندو کسان اور مسلمان کسان حسب استطاعت مسجد اور مندر کی مشترکہ انتظامیہ کمیٹی کو رقم اور کچھ چاولوں کا دان دیتے ہیں۔ اس سرمایہ سے کمیٹی دونوں عبادت گاہوں کی دیکھ بھال کرتی ہے۔ اگر کبھی بدانتظامی کی شکایت ہوئی تو معاملہ پنچائیت کمیٹی کے سپرد کردیا جاتا ہے۔ پنچائیت کمیٹی کا صدر ایک سال ہندو اور دوسرے سال مسلمان چنا جاتا ہے۔ یوں دونوں مذہب کے ماننے والے دونوں مذہب ہی عبادت گاہوں کی حفاظت کرنا اور دیکھ بھال کرنا اپنا فرض سمجھتے ہیں۔ انتظامیہ کمیٹی کے ہندو ممبر باضابطہ مسجد جاکر اس کی حالت اور ضروریات کی جان کاری کرتے اور مسلمان ممبر مندر کر جاکر پجاری جی سے ملتے ہیں اور مندر کی حالت اور اس کی ضروریات کا مطالعہ کرتے ہیں۔ مسجد کے امام اور موذن کو گذارے کے لیے رقم دی جاتی ہے اور مندر کے پجاری جی کو صفائی کرنے والے نوکر کو بھی گذارا دیا جاتا ہے۔ اس کے علاوہ جب کوئی پوجا کرنے کے لیے آتا ہے تو پوجا کرنے کے بعد اسے سات روپیہ بارہ آنے درگا ماتا کے قریب رکھے ہوئے صندوقچے میں ڈالنا پڑتا ہے۔ پوجا کرنے والا یہ سمجھتا ہے کہ یہ چڑھاوا درگا ماتا کی بھیٹ ہے پجاری جی سے اس کا کوئی سمبندھ نہیں ہے لیکن یہ پیسہ ہر صورت پجاری جی کے ہاتھ ہی لگتا ہے۔ کمیٹی پجاری جی اور پوجا کرنے والوں کے بیچ کوئی مداخلت نہیں کرتی۔ یہ انکا ذاتی معاملہ سمجھا جاتا ہے۔ مسجد میں نماز کے بعد چڑھاوا یا بھیٹ نہیں دی جاتی اور اگر کوئی دینا چاہے تو امام صاحب اسے قبول نہیں کرتے۔ البتہ کبھی کبھی امام صاحب کے چاہنے والے کھانے پینے کی چیزیں مسجد میں لے آتے ہیں تو امام صاحب اور موذن صاحب کھانے میں ان کے شریک ہوجاتے ہیں۔

یہ طریقہ کار برسوں کے تجربے اور ہندو مسلمان کے باہمی اعتماد اور اتحاد سے پروان چڑھا ہے۔ گو کہ اتحاد اور اعتماد کا یہ سماجی بندھن بنگال کی بین المذاہب سوسائٹی کا طرۂ امتیاز ہے وار بطور انڈر کرنٹ صدیوں سے رہا ہے لیکن اسے بے انتہا تقویت بیرونی تسلط کے خلاف ۱۷۵۷ء کی پہلی جنگ کے بعد ملی۔

سراج الدولہ کی فوج کا بڑا حصہ جو میر جعفر کے زیر کمان تھا عین لڑائی کے دوران نواب کی فوج سے علیحدہ ہوگیا۔ لیکن نواب کے وفادار آزادی کے متوالے سپہ سالار مہاراجہ موہن لال اور میر مدن تھوڑی سی فوج لے کر میدان میں

ڈٹے رہے اور یلغار کرتے ہوئے انگریزی فوج کے توپ خانے تک پہنچ گئے اور انگریزی فوجیں پسپا ہونے لگیں اور میدان چھوڑ کر آموں کے باغ میں جا کر پناہ گزین ہوگئیں۔ میر مدن تعاقب کرتا ہوا انگریزوں کے سر پر پہنچ گیا۔ عین اس وقت توپ خانے کے گولے سے زخمی ہو کر میر مدن شہید ہو گیا۔ شام ہو رہی تھی بہادر مہاراجہ موہن لال برابر پیش قدمی کر رہا تھا۔ اور قریب تھا کہ فیصلہ نواب سراج الدولہ کے حق میں ہو جاتا۔ غدار میر جعفر نے نواب کو جنگ بند کرنے کا مشورہ دیتے ہوئے کہا کہ وہ دوسرے دن انگریزوں کا خاتمہ کر دے گا۔ ویسے نواب میر مدن کی شہادت سے دل شکستہ ہو چکے تھے۔ میر جعفر پر بھروسہ کر کے اُنہوں نے مہاراجہ موہن لال کو واپس بلوالیا۔ یہ حالت دیکھ کر فوج بددل ہوگئی اور میدان چھوڑ کر بھاگ گئی۔ کلایو نے نواب سراج الدولہ اور مہاراجہ موہن لال کو گرفتار کر کے بے حد تکلیف دے کر قتل کر دیا۔ جب یہ دونوں روحیں جسد خاکی کو چھوڑ کر ایک ساتھ بھگوان کے پاس چلی گئیں تو جاتے جاتے ان روحوں نے بنگال میں ہندو مسلم اتحاد کو جاوداں کر دیا۔

جب یہ الم ناک خبر عظیم آباد پہنچی تو وہاں کے صوبہ دار راجہ رام موہن نرائین نے اپنے کپڑے پھاڑ ڈالے اور روتے ہوئے بازار میں نکل پڑے اور ان کے پیچھے پیچھے عظیم آباد کے سارے ہندو اور مسلمان بھی زار و قطار روتے ہوئے سڑکوں پر نکل آئے۔ راجہ رام موہن نرائین بے ساختہ یہ شعر پڑھتے جاتے تھے:

غزالاں تم تو واقف ہو کہو مجنوں کے مرنے کی
دوانہ مر گیا آخر تو ویرانے پہ کیا گزری

یہ ہے بنگالیوں کا مزاج اور ان کے کردار کی عظمت اور اس خوبصورت گاؤں میں بین المذاہب معاشرتی یک جہتی کا رویہ اس تاریخی کردار کا عملی مظاہرہ تھا۔ اور نتیجہ میں یہ گاؤں امن اور سلامتی کا گہوارہ بن گیا تھا۔ گاؤں کے گلی کوچوں میں معصوم نونہال، کم سن بچے، جوان دوشیزائیں، مائیں، بیٹیاں، بہنیں، نو بیاہتا گاؤں سے باہر سے آئی ہوئیں ناریاں، عمر رسیدہ مہلائیں، مہاشے، ادھیڑ جوان اور نوجوان مرد نہایت آزادی سے بے خطر گھوم پھر سکتے تھے۔ برس ہا برس سے اس گاؤں کے باسیوں نے فرقہ وارانہ کشیدگی اور دنگا فساد کا منحوس منہ نہ دیکھا تھا۔ ایک دوپہر جبکہ گرم ہوا کے جھونکے چل رہے تھے گاؤں کی گوریوں کا ایک قافلہ چوڑیوں سے بے نیاز ہاتھوں کو ہوا میں لہراتا ہوا اور پازیب کی جھنکار کی لے پر دل آویز نغمات بکھیرتا ہوا نکلا اور گنگا کی اُور چل پڑا۔ گنگا برہم پتر کو اپنی آغوش میں لے کر خلیج بنگال سے ملنے کی خوشی میں دیوانہ وار بھاگے چلی جا رہی تھی۔ گنگا کو بھی شاید یہ ارمان تھا کہ حدِ نظر محیطِ بیکراں کا نظارہ کر کے اس کے اندر خود سما جائے۔ لیکن ایک چھوٹا سا قطعہ زمین جو اس گاؤں کی سرحد تھا نہایت مسطح میدان تھا جہاں گنگا پھیل کر آہستہ آہستہ چہل قدمی کر رہی تھی۔ وہاں پانی کم گہرا اور تیراکی کے قابل تھا۔ گاؤں کی گوریوں کا قافلہ اسی ساحل کی طرف جا رہا تھا کہ وہ پانی میں ڈوبکی لگا کر گرم ہوا کے جھونکوں سے نجات حاصل کریں۔ آم کے درختوں کے جھنڈ سے نکل کر وہ رنگ برنگے پتھروں کے نظارے سے محظوظ ہو رہے تھے کہ ان کے کانوں میں ایک رس بھری آواز آئی۔

''چوڑیاں لو چوڑیاں، کانچ کی ہری ہری چوڑیاں، کانچ کی لال لال چوڑیاں، سنہری چوڑیاں، کھنکتی چوڑیاں، جھنجھناتی چوڑیاں''۔ منھیار کی آواز سن کر گوریوں کا قافلہ رک گیا۔ اتنی بہت ساری کنیاؤں کو دیکھ منھیار بھی موج میں آ گیا اور ہانک لگائی۔ ''آوری گوریاں، پہنوں ری چوڑیاں سہاگ رات چوڑیوں کی جھنجھناہٹ سن کر ساجن کا دل مچل جائے گا۔ پر کنواری کنیا اپنی چوڑیوں کو دیکھ کر اپنا ہاتھ لہرائے گی تو خود اس کا دل بھی مچل جائے گا۔ تو آوری گوریاں پہنوں ری چوڑیاں''

یہ لمبا چوڑا ہانکا سن کر پہلے تو گوریوں نے خوب غل مچایا اور پھر چوڑی والے منھیار کو اپنے حلقے میں لے لیا۔ پھر ساری گوریوں نے ایک ساتھ آواز بلند کی ''بتاؤ منھیار بھیا کیا دام لو گے۔''

منھیار نے لہرا کر کہا ''بھیا کہا ہے تو میں دام نہیں بتاؤں گا۔ جو ادھک دے اُس کی بھی بھلا جو کم کم دے اُس کا بھی بھلا۔ تو بہنوں جو دینا ہے دے دو اور پہن لو چوڑیاں''

پھر ایک ایک کر کے گوری منھیار کے قریب آتی گئی اور اپنے پسندیدہ رنگ کی کانچ کی چوڑیاں پہنتی گئی۔ اور کسی نے آٹھ آنے دیے تو کسی نے چھے اور کسی نے بارہ۔ یوں منھیار نے آدھے سے زیادہ چوڑیاں کنیاؤں کو پہنا کر اچھی خاصی رقم بٹور لی اور اپنا بوجھ ہلکا کر لیا۔ اور پھر کنیاؤں کا سارا قافلہ چوڑیاں کھنکناتا لہراتا ناچتا گاتا گنگا کی اُور چل پڑا۔ اپنے ساتھ آواز کی نغمگی اور شوخ و سنگ لہراتے جسموں کی لچک لے ہوئے آہستہ آہستہ منھیار کے اطراف کے منظر نامے کو بے رونق کر گیا۔ تب منھیار نے دیکھا کہ ایک کنیا کچھ دور کھڑی منھیار کو حسرت بھری نظروں سے دیکھ رہی ہے۔ اس کا چہرہ اپسراؤں جیسا چمکدار چہرہ ہے۔ اس کا لباس اطلس و کمخواب سے بھی ادھک خوبصورت کپڑے سے تراش خراش کر یوں بنایا گیا ہے کہ جس کے کچھ حصوں کو ڈھانک رہا ہے اور کچھ خوبصورت حصے عریاں ہیں جس سے کنیا کا حسین سراپا ناقابل بیان حسن میں ڈھل گیا تھا۔ منھیار نے ہاتھ کے اشارے سے کنیا کو قریب بلایا۔ جب وہ قریب آئی تو اس کے صحت مند جسم کی چمک اور آنکھوں میں بسی اداسی ایک ایسا حیران کن منظر پیش کر رہی تھی کہ منھیار دیکھتا کا دیکھتا رہ گیا۔ پر کب تک۔ آخرش اس نے کہا۔ ''کیا بات ہے گوری تم نے چوڑیاں نہیں پہنی؟ تمہارے یہ خوبصورت ہاتھ خالی ہیں۔''

گوری تھوڑی دیر تک تو چوڑیوں کو گھورتی رہی۔ پھر نہایت مترنم آواز جس میں کچھ حسرت اور جھک (غصہ یا غضب) کا ملا جلا انداز تھا کہا ''بابا میرے پاس پیسے نہیں ہیں۔''

''کیا کہا؟ پیسے نہیں ہیں۔ کیا گھر سے کچھ لے کر نہیں چلیں تھیں۔''

''گھر!!۔ گھر سے!! گھر کی بات نہ کرو بابا۔ مگر دیکھو میں نے آج تک کبھی پیسوں کو ہاتھ نہیں لگایا۔''

''یہ تو اور بھی اچنبھے کی بات ہے۔ پر مایوس نہ ہونا گوری میں تمہیں آج چوڑیاں پہناؤں گا اور پیسے کبھی نہ لوں گا۔''

''کیا تم مجھے ادھار چوڑیاں پہناؤں گے منھیار۔ اور پیسے اب نہیں

لو گے تو یہ نادو کانچ کی لال لال چوڑیاں۔''

''لال چوڑیاں سہاگ رات سے ایک دن پہلے پہنائی جاتی ہیں جو سہاگ کی نشانی میں جیسے منگل سوتر۔ تو آؤ لال چوڑیاں پہن لو اور جب تمہارا اوواہ ہوجائے تو اپنے پتی سے ہمارے دو بول کہہ دینا۔''

''نہیں، نہیں منھیار بابا پتی کی بات نہ کرو۔ ہمیں سہاگ کی لال چوڑیاں نہیں، دھرتی ماتا کی کوکھ سے نکلنے والے پودے سمان رنگ والی ہری چوڑیاں پہنادو۔''

منھیار ناچتے ناچتے اچانک رک گیا۔ اور کنیا کے چہرے پر ایک نظر ڈالی تو وہاں سے پھوٹنے والی براج جوتی دیکھ کر حیران رہ گیا اور مزید ایک لفظ کہے بغیر اس کے دونوں ہاتھوں میں اتنی ہری چوڑیاں پہنادیں کہ اس کی دونوں کلائیاں قریب قریب کہنی تک چوڑیوں سے ڈھک گئیں۔ گوری نے اپنے دونوں ہاتھوں کو دیکھا اور پھر منھیار کو محبت بھری نظروں سے دیکھ کر کہا۔

''منھیار بھیا۔ تم گاؤں کو جاؤ اور مندر میں پجاری جی سے ملو۔ وہ میرے پتا ہیں۔ شام تک مندر میں اتنا چڑھاوا آجائے گا کہ وہ تمہیں ان چوڑیوں کے پیسے دے سکیں گے۔ تم اُن سے بات کر کے وہ پیسے لے لینا۔''

اتنا کہا اور پھر وہ اچھلتی، کودتی گنگا کی اُور چلی گئی۔ منھیار دیر تک اُسے جاتے ہوئے دیکھتا رہا۔ پھر اس کی نظر اس کے قدموں کے نشانات پر پڑی۔ وہ کسی کومل کنیا کے قدموں کے نشان نہیں تھے۔ کچے راستے پر دھسے ہوئے بیضوی نشانات تھے جیسے صرف ایڑی کا نشان ہو۔ پنجے اور انگلیوں کا حصہ غائب تھا۔ ان نشانات کو دیکھ کر منھیار تعجب میں پڑ گیا۔ کیا وہ کنیا صرف ایڑی ٹیک کر چلتی ہوگی۔ منھیار اس سے آگے سوچ نہ سکا۔ ابھی وہ اسی الجھن میں تھا کہ مقامی مسجد سے اذان کی آواز بلند ہوئی۔ منھیار نے سوچنا چھوڑ کر قدم بڑھائے اور گاؤں کے قریب والی مسجد میں پہنچ گیا۔ منھیار نے جب مسجد کے صحن میں قدم رکھا تو اس وقت موذن اذان کا آخری بول ادا کر رہا تھا۔ لَا اِلٰہَ اِلَّا اللہ۔ منھیار نے بلندی پر کھڑے ہوئے موذن کو دیکھا۔ موذن کے قریب کسی کی پرچھائیاں نظر آئیں۔

''ارے یہ تو وہی کنیا ہے'' موذن نے کہا اور محسوس کیا کہ وہ اپنے دونوں ہاتھ لہرا کر مسکرا رہی ہے۔ اور اس کے سر کے اوپر ذرا سی بلندی پر ایک بہت بڑا کنول معلق ہے۔ منھیار نے اُسے اپنا وہم سمجھ کر ایک لمحے کے لیے آنکھیں بند کر لیں اور چوڑیوں کا تھیلا ایک طرف رکھ کر وضو کرنے کے لیے بیٹھ گیا۔

نماز سے فارغ ہو کر وہ سیدھا گاؤں کی طرف چل پڑا۔ درگا ماتا کا مندر بیچ گاؤں میں نہایت شان و شوکت سے کھڑا تھا۔ سنہرا کلس اور اس پر لگی ہوئی سنہری کلغی سورج کی روشنی میں جگ مگ کر رہی تھیں۔ منھیار نے محسوس کیا کہ کلغی پر دو آنکھیں ہیں اور بڑا کنول ان پر سایہ کئے ہوئے ہے۔ دونوں عبادت گاہوں پر آنکھوں اور کنول کی موجودگی کا احساس کر کے منھیار کا دماغ تقریباً ماؤف ہو گیا اور اس کے قدم لڑکھڑا گئے۔ وہ مندر کی سیڑھیاں چڑھتے ہوئے قریب قریب لڑکھڑا کر گرنے ہی والا تھا کہ اس کے کانوں میں ایک سریلی سرسراتی ہوئی آواز آئی۔

''سنبھلو منھیار بھیا ڈرو نہیں۔ پجاری جی مندر میں ہونگے۔ اندر چلے جاؤ'' یہ سن کر منھیار حالت نیم غنودگی میں چونک پڑا۔ اور تیزی سے سیڑھیاں چڑھ کر مندر میں داخل ہو گیا۔ اندر بالکل سناٹا تھا پجاری جی ایک کونے میں کھڑے ہوئے تھے۔ درگا ماتا کی مورتی سرخ زبان نکالے ہوئے ڈراؤنا منظر پیش کر رہی تھی۔ لیکن چہرے پر بڑی کوملتا اور معصومیت تھی جو زبان کے خون آلودہ منظر سے کوئی میل نہیں کھاتی تھی۔ پتہ نہیں سنگ تراش نے ایسی دو متضاد کیفیات والی مورتی کیوں بنائی ہوگی کوئی نہیں جانتا۔ شاید درگا ماتا ایسی ہی ہوگی۔ یہ بھی کوئی نہیں جانتا۔ یہ تو انسان کے سوچ بچار کا کرشمہ ہے وہ ان دیکھے بھگوان کو کئی کئی روپ میں دیکھتا ہے۔ یہ سوچتا ہوا منھیار مورتی کے قریب پہنچ گیا۔ آہٹ سن کر پجاری مہارج نے دروازے کی طرف دیکھا۔ ایک آدمی بغل میں بڑا سا تھیلا لٹکائے ہوئے مورتی کے قریب جا رہا تھا۔ پجاری جی دو چار قدم چل کر منھیار کے سامنے پہنچ گئے اور کہا۔

''کیا پوجا کرنے آئے ہو مہاشے''

''نہیں مہاراج میں عبدل منھیار ہوں۔ پوجا کرنے نہیں آیا۔''

''تم عبدل ہو اور چوڑیاں بھی تم ہی بناتے ہونا۔ پر یہاں کیوں آئے ہو منھیار۔''

''پجاری مہاراج میں آپ سے ملنے کے لیے آیا ہوں اور ایک بات کہنی ہے۔''

''کیا بات ہے جلدی سے کہو۔ پوجا کرنے والوں کے آنے کا اب سے ہو گیا ہے۔ وہ تمہیں یہاں دیکھ کر کچھ کہیں گے نہیں پر انہیں اچھا نہیں لگے گا۔ تو کہو کیا کہنا ہے۔''

''وہاں'' منھیار نے اپنا سیدھا ہاتھ اٹھا کر بیل گاڑی کے راستے کی طرف اشارہ کیا ''تمہاری پتری مجھے ملی تھی اور میں نے اس کے دونوں ہاتھوں میں ہری ہری چوڑیاں پہنائی ہیں۔ اس نے کہا ہے کہ مندر جا کر پجاری جی سے ملوں اور ان سے چوڑیوں کے پیسے لے لوں۔ اس نے یہ بھی کہا تھا کہ آپ اس کے پتا ہیں۔''

''میری پتری!! یہ کیا کہہ رہے ہو منھیار جی۔ میری کوئی پتری نہیں ہے۔ میں نے وواہ نہیں کیا ہے تو یہ پتری کہاں سے آ گئی۔''

''کیا کہا! تمہاری کوئی پتری نہیں ہے! مگر اُس خوبصورت کنیا نے یہی کہا تھا کہ پجاری جی اس کے پتا ہیں اور ان سے ادھار چوڑیوں کے پیسے لے لینا۔ میں نے اس کی بات پر یقین کر لیا اور اس کی بات رکھنے کے لیے یہاں تک آ گیا۔ اگر تمہارے پاس پیسے نہیں ہیں تو کوئی بات نہیں میں پیسے لئے بغیر چلا جاؤں گا۔''

''ٹھہرو منھیار جی۔ یہ کوئی گھمبیر بھید معلوم ہوتا ہے۔ کوئی کنیا میرے بارے میں ایسا جھوٹ نہیں بول سکتی۔ ہو نہ ہو وہ درگا ماتا کی آتما ہوگی جو کنیا کا روپ دھار کر آ گئی ہوگی۔ دیکھو میں بیس سال سے درگا ماتا کی پوجا کر رہا ہوں۔ اس نے مجھے درشن نہیں دیے لیکن تم کو دیے جبکہ تم اس کے پجاری بھی نہیں

ہواور نہ ہندودھرم کو مانتے ہو۔ ہائے رام یہ کیسا انائے ہے درگا ماتا میں تمہارے درشن کی آس میں جی رہا ہوں۔"

"یہ کیا کہہ رہے ہو پجاری جی! وہ کنیا چوڑیاں پہننے کے لیے اُدھر آئی ہوگی۔ درشن ورشن کی بات میں نہیں جانتا۔"

"اچھا تو وہ چوڑیاں پہن کر کہاں چلی گئی"

"گنگا کی اُور جہاں ساری کنیائیں گنگا میں ڈبکی لگانے کے لیے جارہی تھیں۔"

"تو چلو جلدی کرو منھیار ہم بھی وہیں چلتے ہیں۔ اگر وہ وہاں ہوگی تو میں اس کے درشن کرلونگا" یہ کہہ کر پجاری جی تیزی سے مندر کے باہر آگئے اور قریب قریب دوڑتے ہوئے گنگا کی اُور چلنے لگے۔ منھیار کو ان کا ساتھ دینے میں مشکل پیش آرہی تھی کیونکہ اس کے بغل میں لٹکتے ہوئے تھیلے میں موجود چوڑیوں کا بوجھ خاصا وزنی تھا۔ بہرحال وہ دونوں چلتے چلتے خاصی دُور نکل آئے۔ وہاں سے گنگا کا ساحل نظر آرہا تھا۔ اس وقت گنگا کی طرف سے گوریوں کا قافلہ آتا دکھائی دیا۔ جب وہ پجاری جی کے قریب پہنچ گئے تو پجاری جی کھڑے ہوکر نہایت غور سے ایک ایک کنیا کا چہرہ دیکھنے لگے۔ وہ ساری کی ساری اُسی گاؤں کے رہنے والیاں تھیں۔ جب وہ نظروں سے اوجھل ہوگئیں تو پجاری جی پھر گنگا کی اُور چلنے لگے۔ آخرش دونوں ایک ساتھ گنگا کے ساحل پر پہنچ گئے۔ وہاں کوئی بھی نہیں تھا۔ گنگا آہستہ آہستہ بہہ رہی تھی۔ اور ساحل سنسان تھا۔ البتہ پانی کے بہنے کی موسیقی ریز آواز سے ایک سماں بندھ گیا تھا۔ پجاری جی نہایت آزردہ اور مایوس نظروں سے منھیار کو دیکھ رہے تھے۔ پھر ان کے ہونٹ ہلے اور نہایت کمزور آواز میں انہوں نے کہا۔

"منھیار جی یہاں تو کوئی نہیں ہے اور نہ میرے نصیب میں درگا ماتا کا درشن ہے۔ میری بیس سال کی تپسیا اکارت گئی۔ چلو میں تو مندر چلا جاؤں گا اور تم بھی جاؤ۔ سورج ڈوبنے سے پہلے یہاں سے نکل جاؤ۔ سورج ڈوبتے ہی یہاں غنڈوں کا راج ہوتا ہے۔ بھگوان تمہارا بھلا کرے جاؤ منھیار جی۔ پھر کبھی ملنے آجانا۔ کیا پتہ تمہیں دیکھ کر درگا ماتا ناری کے روپ میں پھر سے پرگٹ ہوجائے۔" یہ کہہ کر پجاری جی مڑ کر واپس گاؤں کی طرف چل پڑے۔ منھیار نے اپنے بغل میں لٹکے ہوئے بوجھ کو اُتار کر تپتے ساحل پر رکھ دیا۔ اور اِدھر اُدھر دیکھ کر آہستہ سے کہا۔

"میں کیسے یقین کرلوں کہ درگا ماتا نے کنیا کے بھیس میں آ کر مجھ سے چوڑیاں پہنی ہوگی۔ یہ یقین کرنے والی نہیں ہے۔ تو پھر وہ کنیا کہاں غائب ہو گئی۔ دوسری کنیاؤں کے ساتھ واپس کیوں نہیں آئی۔۔۔"

عبدل جو کہنا چاہ رہا تھا اُسے مکمل نہیں کر پایا تھا کہ ایک ایسا واقعہ ہوا جو واقعی ناقابل یقین تھا۔ مگر وہ ہوا۔ گنگا کے اندر سے دو چوڑیوں بھرے ہاتھ برآمد ہوئے۔ ایک ہلکا سا قہقہہ بلند ہوا اور پھر ایک موسیقی ریز نسوانی آواز آئی۔

"اے منھیار تم پجاری جی کو کیوں لے آئے؟ اور تم بھی یہاں کیوں آئے ہو اب یہاں تمہیں کوئی نہیں ملے گا۔"

"یہ کس کی آواز ہے کنیا؟ کیا تم درگا ماتا یا مہا کالی ہو۔ پجاری جی تمہارا درشن کرنے کے لیے خود ہی آئے۔"

"تم اس چکر میں مت پڑو منھیار کہ میں کون ہوں اور کیا ہوں۔ تم نے مجھے دیکھا اور چوڑیاں پہنائیں من موہنی چوڑیاں!! بس اتنی سی بات ہے۔ اس سے آگے مت سوچو۔"

"ہاں بہن مجھے اتنا ہی پتہ ہے اور میرے لیے یہی بہت ہے۔ لیکن پجاری جی مہاراج بہت نراش ہوکر یہاں سے گئے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ تمہارے درشن کی آس میں وہ جی رہے ہیں۔"

"کیا مندر میں روز وہ مجھے نہیں دیکھتے؟ اور چھ سات بار میری پوجا کروا کر میرے بھگتوں سے پیسے نہیں بٹور لیتے؟ بس ان کے بھاگ میں اتنا ہی ہے۔ اگر وہ مجھے دیکھنا چاہتے تو میرے بھگتوں سے پیسہ بٹورنے کے بجائے اپنے بھگوان کے آگے جھکتے اور ماتھا ٹیکتے۔ تب بھگوان یا بھگوان کے بنائے ہوئے دیوی دیوتا پرسن ہوکر انہیں اپنا منش روپ دکھاتے۔ میں نے اُس مینار پر کھڑے ہوکر تم سب کو دیکھا تھا۔ ایک منش آگے کھڑے ہوکر کچھ بول رہا تھا۔ پھر تم سب نے زمیں پر ماتھا ٹیک دیا۔ کیا وہ تمہاری پوجا تھی؟ پوجا ہونے کے بعد کیا تم اپنے پجاری کو پیسے دیتے ہو۔"

"نہیں بہن! ہم سب بھگوان کے آگے جھکتے ہیں اور اس کی بڑائی کو مان کر ماتھا ٹیک دیتے ہیں۔ اس میں روپے پیسے کا کیا کام۔"

"ہاں! میں بھی یہی کہتی ہوں۔ دیوی دیوتا کو انہوں نے دیوی دیوتا نہیں سمجھا۔ اپنے جیسا مٹی کا پتلا سمجھ لیا۔ آؤ میں تمہیں بتاتی ہوں۔ میں ایک آتما ہوں پرم آتما کا کھنڈ (حصہ)، الکھ پرش (وجودِ غیر مرئی) اور سوچم شیر سری (جسم لطیف) ہوں۔ میں وِبھوتی (خاکی) نہیں وِبھو (محیط کل) کی اُجوت (روشنی کا ضیاء) ہوں۔ پراچین کال کے وِدوان تھے تو بدھی مان پر میرے بارے میں ان کا گیان کھرا نہیں تھا۔ مجھے ایک مٹی سے بنی ناری سمجھ کر وہ سارے کام مجھ سے کروائے جو ایک وِبھوتی شریر کے گن تھے۔ انہوں نے مجھے مہادیو کی پتنی بنایا، مہا کالی بنایا، مہشا مار دھنی بنایا، شاکھمبری بنایا اور لمبھری ملاری بنایا۔ یہ اُچت نہیں ہے منھیار بابا۔ ہے نا!! یہی کارن ہے میں ان پجاریوں سے کوئی سمبندھ نہیں رکھنا چاہتی۔ اگر تم کبھی اُدھر جاؤ تو یہ بات پجاری جی سے کہہ دینا۔"

"نہیں بہن یہ کام مجھ سے نہ کرواؤ۔ کہیں پجاری جی یہ نہ سمجھ لیں کہ میں انہیں اپنا جیسا بنانا چاہتا ہوں اور۔۔۔" میری بات ابھی مکمل نہیں ہوئی تھی کہ چوڑیوں کے جھنجھنانے کی آواز آئی اور پھر سناٹا چھا گیا۔ افق مغرب پر سورج کا لال گولا تھرتھرا رہا تھا۔ شاید وہ ڈوبنے کے خوف سے کانپ رہا تھا۔ فطرت بھی مخلوق ہے۔ اِسے بھی فنا کا خوف لاحق ہے جیسے ایک انسان کو۔ منھیار نے ایک آہ بھری اور کہا۔

"مجھے کس مصیبت میں ڈال دیا اے درگا ماتا کچھ کہوں تو جان کے لالے پڑتے ہیں اور نہ کہوں تو اندر کا بوجھ چین نہیں لینے دیتا۔"

''دوادھورے ہاتھ''

حنیف باوا

(جھنگ)

وہ ہر روز شہر کے پُر رونق چوک میں کھڑا ہوتا۔

وہ صبح آتا اور رات کے دھندلکوں کے آنے تک کھڑا رہتا۔

گرمیوں کے دنوں میں وہ چوک سے ذرا ہٹ کر نیم کی گھنی چھاؤں میں آجاتا۔ موسمِ سرما میں نیم کی رس گھنی چھاؤں سے ڈر کر گہری دھوپ میں آکر ڈیرہ جماتا۔

وہ دونوں رُتیں کسی نہ کسی شکل میں اُس کی معاونت کرتیں۔

متضاد سمتوں سے آتی ہوئی چوک کی دونوں سڑکیں ایک خاص نقطے پر آکر ایک دوسری سے معانقہ کرتی ہوئی ایک دوسری سے بچھڑ کر آگے بڑھ جاتیں۔

ایک سڑک شہر کے مشہور بانو بازار سے آتی تھی اور چوک سے ہوتی ہوئی سیدھی شہر کی گنجان آبادی کی گود میں جا چھپتی۔

دوسری سڑک ادا بازار سے نکل کر لاری اڈے کی جانب جا رہی تھی۔ ان دونوں سڑکوں پر لوگوں کا آنا جانا لگا رہتا تھا۔ خواتین اپنا میک اپ اور آرائش و زیبائش کا سامان لانے کے لیے بانو بازار کا رُخ کرتیں۔ دوسری سڑک کے دونوں جانب بڑی بڑی دکانیں تھیں جہاں سے ہر قسم کا سامان دستیاب ہو جاتا تھا۔ اس سڑک پر بھی کافی رش رہتا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ شہر کا یہ چوک ہمیشہ پُر رونق رہتا تھا۔

وہ ایک چودہ پندرہ برس کا لڑکا تھا۔ وہ اپاہج تھا۔ اس کے دونوں ہاتھ نہ ہونے کے برابر تھے۔ اُن کی ننھی منی ہتھیلیوں پر جو انگلیاں تھیں وہ بھی چھوٹی چھوٹی تھیں جنہیں دیکھ کر ایسا لگتا تھا جیسے وہ ایسی نچڑی ہوئی جونکیں ہوں جنہیں کبھی خون کی ایک بوند بھی نہ ملی ہو۔ اس کے یہ دونوں ہاتھ بظاہر کسی کام کے نہ تھے لیکن اس کے لیے تو یہ ہاتھ بہت پیارے تھے۔

وہ صبح سویرے اس چوک میں آتا اور رات کا اندھیرا پھیلتے ہی چلا جاتا۔

وہ سدا اپنے دائیں کاندھے پر ایک تھیلا لٹکائے رکھتا۔ اُس کے اس تھیلے میں جو کچھ بھی ہوتا وہ ایک نمبر ہوتا تھا۔

جب بھی کوئی اس کے پاس سے گزرتا تو وہ بڑی خود اعتمادی سے آواز لگاتا۔

''ایک نمبر مال ہے۔ بچوں کے لیے، بڑوں کے لیے بھی، میرا مال ذائقے دار نہ ہو تو پیسے واپس لے جائیں''

''دس روپے کا ایک پیکٹ۔ اس میں بچوں کے پسند کی ہر چیز ہے''

''لے جائیں۔ اسے میری بہنوں نے اپنے ہاتھوں سے تیار کیا ہے''

جب آنے والا اُس کی طرف دھیان دیے بغیر گزر جاتا تو وہ کچھ دیر کے لیے مایوس تو ہوتا لیکن جب اُس کے منہ سے یہ الفاظ پھسلتے تو اُس کی مایوسی امید میں بدل جاتی۔

''اللہ ہی مالک ہے''

''اللہ ہی رازق ہے''

اس کا کنبہ چار افراد پر مشتمل تھا۔ ایک وہ خود، دو بہنیں جو دونوں اُس سے بڑی تھیں اور ایک ماں جو صبح کے وقت نماز سے فارغ ہو کر دعا مانگنے کے بعد اپنے بیٹے حمید سے کہتیں۔ ''بیٹے میرے کہے کو بھول مت جانا۔ اگر تو میرے کہے پر عمل پیرا رہا تو دیکھنا ایک روز تُو اپنے مقصد میں ضرور کامیاب ہوگا۔''

نہیں ماں ایسا کبھی نہیں ہوگا۔ میں ہمیشہ آپ کے کہے کو یاد رکھتا ہوں۔''

''اچھا کرتا ہے۔'' ماں تسبیح کرتے ہوئے بڑے فخر سے کہتی۔

جب وہ اپنی چھوٹی چھوٹی دونوں ہتھیلیوں کو ملا کر پیکٹ پکڑتا تو ایسا تاثر ملتا جیسے وہ کچھ مانگنے کے لیے ہاتھ جوڑ رہا ہو۔

جیسے ہی اُس کی اس کیفیت کو دیکھ کر کوئی راہی اُس کے پاؤں میں کچھ نقدی پھینک کر جلدی سے آگے بڑھ جاتا تو وہ چیخ کر کہتا۔

نہیں بھائی صاحب نہیں۔ آپ ان پیسوں کے عوض یہ پیکٹ لیتے جائیں میری ماں نے مجھے مانگنے سے۔۔۔ اتنے میں وہ شخص آنکھوں سے اوجھل ہو جاتا۔

حمید اُن پیسوں کو پاؤں کی ٹھوکر سے اپنے سے دُور کر دیتا۔

اُس کے یہ پیکٹ ہر روز کتنے بکتے۔ ان سے کتنا منافع ملتا۔ اس کے بارے میں جاننے کے لیے کسی بھی شخص کے پاس اتنی فرصت نہ ہوتی۔ لیکن اتنا ضرور ہوتا کہ جب اس کا کوئی پیکٹ بکتا تو بے محابہ اس کے منہ سے نکلتا۔

''شکر ہے تیرا مالک''

''سارے رزق کا مالک بھی تو ہی ہے''

لیکن جب کوئی شخص اُس سے پیکٹ بھی نہ لے اور نفرت سے اُس کے پاؤں میں چند سکے پھینک کر چلتا بنے تو اُس وقت اُسے بہت دکھ ہوتا لیکن جب اُس کی ماں کی باتیں یاد آتیں تو اُس کے دکھ میں قدرے کمی آجاتی۔

بیٹا اگر تمہیں کوئی بھکاری سمجھ کر کچھ نقدی دے جاتا ہے تو اُس کا بُرا مت منانا بس اتنا کرنا کہ اُس نقدی کو اپنی نیک کمائی میں کسی صورت میں شامل نہیں کرنا۔ اگر تو ایسا کرے گا تو تمہاری اس نیک کمائی کی تمام برکتیں تجھ سے رُوٹھ

جائیں گی۔''

آج تک اُس نے اپنی ماں کی باتوں سے سرِ مو انحراف نہیں کیا۔

اُس کا باپ ان تین بہن بھائیوں کو ان کی چھوٹی عمر میں ہی چھوڑ کر اللہ کا پیارا ہو گیا تھا۔ اس کے بعد اُس کی ماں نے صاحبِ حیثیت لوگوں کے گھروں میں پوری ایمانداری اور فرض شناسی سے کام کر کے انہیں پال پوس کر بڑا کیا۔ چونکہ اُس کی ماں کی محنت مزدوری میں ہمیشہ خلوص اور صبر شکر شامل رہا اس لیے اُس کی حق حلال کی کمائی نے اس کے بچوں کو کسی بھی غلط روش اختیار کرنے سے بچائے رکھا۔ اب اُس کی دونوں بیٹیاں ماں کی طرح من میں کوئی کھوٹ لائے بغیر کام کرتی تھیں جس کے نتیجے میں گھروں کے مالک اُنہیں قدر کی نگاہ سے دیکھتے تھے اور اُن پر پورا بھروسہ کرتے تھے لیکن بعض اوقات جب وہ انہیں آزمانے کے لیے جان بوجھ کر بستروں میں کافی بڑی رقمیں چھوڑ کر اپنے کام پر چلے جاتے تو وہ انہیں اٹھاتیں اور گھر کی مالکنوں کو وہ رقم دیتے ہوئے کہتیں۔

بی بی جی۔'' یہ پیسے بستر پر سے ملے ہیں۔ شاید صاحب جاتے ہوئے وہیں پر بھول گئے تھے'' ایسا کرتے ہوئے انہیں جس قدر خوشی ہوتی اس کا اندازہ کوئی بھی نہیں لگا سکتا۔

اُس کی بہنوں نے کبھی بھی ایسے گھر میں کام نہیں کیا تھا جو گھر انہیں پٹڑی سے اترا ہوا نظر آتا۔

اُس کی یہ دونوں بہنیں اور اُس کی ماں مل کر اتنا کما لیتی تھیں جس سے اُس کے گھر کا نظام بخوبی سے چلتا رہتا۔ اُس کی ماں اور بہنوں نے بارہا کہا تھا۔

''حمید ہمیں تمہارے کام کی کوئی ضرورت نہیں۔ ہمارے پاس اللہ کا دیا ہوا بہت کچھ ہے۔ وہ آرام سے گھر بیٹھے اور اپنی تمام ضروریات کی تکمیل کو اُن پر چھوڑ دے۔'' لیکن جب وہ سنِ شعور تک پہنچا تو اُس نے بس ایک ہی رٹ لگا رکھی تھی۔'' وہ اُن پر بوجھ بن کر جینا نہیں چاہتا۔''

وہ اپنی زندگی کو اپنے انہیں ننھے منّے اور ادھورے ہاتھوں کے سہارے جینا چاہتا تھا۔ کیا ہوا اگر اُس کے بازوؤں میں اتنی سکت نہیں پاؤں تو اتنے مضبوط اور توانا ہیں جو اُس کے ارادوں کو کبھی لڑکھڑانے نہیں دیں گے۔

چنانچہ وہ انہیں حوصلہ مند سوچوں کی انگلی پکڑ کر اس چوک میں آ گیا تھا۔

جب سے وہ اس چوک میں آیا تھا وہ ایک ہی آواز لگا رہا تھا۔

''لے جائیں صاحب۔ دس روپے کا ایک پیکٹ''

''اس میں صاحب نمکین اور میٹھا دونوں ذائقے ایک دوسرے سے گلے مل رہے ہیں۔''

''صاحب لے جائیں۔ اپنے لیے۔ اپنے بچوں کے لیے''

''بی بی جی لے جائیں۔ دس روپے کوئی اتنی زیادہ قیمت نہیں''

''اس پیکٹ کو میری دونوں پیاری بہنوں نے تیار کیا ہے''

''بی بی جی میری یہ دونوں بہنیں بہت اچھی ہیں۔۔۔ ان کے ہاتھوں کے بنے ہوئے پیکٹ لے جائیں''

اس کی یہ بہنیں اُس کے کام پر آنے سے پہلے اپنے بھائی کے ادھورے ہاتھوں کو چومتیں اور پھر آنکھوں میں آنسو بھر کر کہتیں۔

''جاؤ بیٹے۔ اللہ کا نام لے کر کام شروع کرو تو اللہ تیری روزی میں برکت ڈالے گا''

جب وہ تھیلے میں سے پیکٹ نکالتا تو اس وقت اُسے دونوں ہاتھوں کی ہتھیلیوں کو اندر ڈالنا پڑتا۔ جب وہ پیکٹ باہر نکالتا تو وہ پیکٹ اُس کے دونوں ہاتھوں کی کمزور سی گرفت میں ہوتا۔

جیسے ہی کوئی شخص اُس کے پاس سے گزرتا تو وہ ہتھیلیوں میں گھرا ہوا پیکٹ اُس کے سامنے کر دیتا اور آواز لگاتا۔

ہر ذائقہ اس پیکٹ میں بند ہے۔ نمکین، کھٹا اور میٹھا۔ لے جائیں صاحب۔

کچھ لوگ اس سے پیکٹ خرید لیتے اور کچھ اُس کی طرف دھیان دیے بغیر گزر جاتے۔ اُن میں سے کچھ اُس کے ہاتھوں کو آگے بڑھا ہوا دیکھ کر اُسے بھکھ منگا سمجھ کر اُس کے پاس چند سکے پھینک کر چلے جاتے جنہیں دیکھ کر اُسے بڑی تکلیف ہوتی اور اُسے ایسا محسوس ہونے لگتا جیسے اُس کے اندر سے ایک ایسی چیخ نکلنے والی ہے جو انسان تو کیا پتھر کے سینے میں بھی چھید پیدا کر دے لیکن جلد اُس کے سامنے اُس کی مہربان ماں کا چہرہ آ جاتا جو کہہ رہا ہوتا۔

''دل چھوٹا نہیں کرنا میرے بیٹے۔ بس تُو اپنا کام کرتے جانا''

وہ ماں کے کہے پر عمل کرتے ہوئے کام کرتا رہا۔

کچھ لوگ اُس سے یہ پیکٹ خریدتے رہے۔

اور کچھ اُسے بھکاری کے روپ میں دیکھتے رہے۔

کچھ سکّے اُس کے ہاتھ میں آتے رہے۔

کچھ اُس کے پاؤں کی ٹھوکر کی زد میں رہتے رہے۔

لیکن بعض اوقات ایسا بھی ہوتا کہ جب صبح سے لے کر شام تک اُس کی حق حلال کی کمائی میں ایک پیسہ بھی نہ ملتا تو آن واحد میں مایوسی کے گہرے سائے اُسے اپنی کڑی گرفت میں لے لیتے جس سے اُس کا دل بجھ سا جاتا اور وہ اسی بجھے ہوئے دل کے کہنے پر پاؤں کی جانب جھکتا اور اُن بھیک میں دیے ہوئے پیسوں کو اپنے اُن ادھورے ہاتھوں سے اٹھاتا اور جیب میں ڈال لیتا جن ہاتھوں سے وہ اپنی پیاری بہنوں کی جانب سے تیار شدہ پیکٹ بیچتا تھا۔

پھر جب وہ چند لمحے خاموش رہنے کے بعد اُن غلط پیسوں کے بارے میں سوچتا تو اُسے جھرجھری سی آ جاتی۔ اور جب وہ جھرجھری اُس کے دل کو بھی لرزا جاتی تو فوراً اُس کا ہاتھ جیب کی جانب بڑھتا اور دیکھتے ہی دیکھتے وہ پیسے پھر سے اُس کے پاؤں کی زد میں ہوتے۔ اور وہ پھر سے آواز لگانے لگتا۔

''دس روپے کا پیکٹ''
''دس روپے کوئی زیادہ پیسے نہیں''
لے جائیں صاب

اُس کے اس طرح آواز لگانے کے دوران کچھ ایسا ہوا کہ صبح کے وقت ایک کاروالا اُس کے نزدیک کار روک کر باہر نکلتا اور اُس سے دو پیکٹ لیتا اور اُسے سو روپے کا نوٹ تھما کر کار میں بیٹھتا اور فوراً چلتا بنتا۔ وہ بہت چیختا چلاتا۔

''صاب جی باقی پیسے لیتے جائیں میرے تو صرف بیس روپے بنتے ہیں۔'' لیکن وہ کاروالا اُس کی طرف سے کان بند کر کے کار سٹارٹ کرتا اور وہاں سے نکل جاتا۔

جب کاروالے کو ایسا کرتے ہوئے ایک ہفتہ گزر گیا تو ایک روز حمید چوکس ہو کر کھڑا ہو گیا۔ صبح کے وقت جیسے ہی کاروالا وہاں آ کر رکا تو وہ فوراً کار کے پاس گیا اور کھلی کھڑکی کے اندر جھانک کر کاروالے سے کہنے لگا۔

بابو جی۔ یہ لیں اپنے سات دنوں کے بقایا پیسے۔ میرے پیکٹ کی قیمت تو دس رپے ہے پچاس نہیں۔

حمید نے جب بقایا رقم اُس کی جھولی میں پھینکی تو کاروالا فوراً کہہ اٹھا۔

''قیمت تو مجھے معلوم ہے بیٹے۔ دراصل میں تو بس باقی پیسوں سے تمہاری مدد کرنا چاہ رہا تھا''

یہ سنتے ہی حمید کی پیشانی پر بل آ گئے اور ذرا ترش روئی سے کہنے لگا۔

''سر جی مجھ پر ترس کھانے کی کوئی ضرورت نہیں۔ میرے ہاتھ جیسے بھی ہیں اللہ انہیں سلامت رکھے۔ میرے لیے یہی کافی ہیں'' یہ کہہ کر حمید پھر اپنے ٹھکانے پر آ گیا۔

حمید کی یہ باتیں سن کر کاروالا نیچے اترا اور حمید کے پاس آ کر پہلے اُس نے اسے بڑے تجسس کی نگاہ سے دیکھا اور پھر کہنے لگا۔

''شاباش بیٹے۔ مجھے تم سے یہی امید تھی۔ معلوم ہوتا ہے تو کسی ایسی نیک ماں کا بیٹا ہے جس نے تمہیں سیدھے راستے سے کبھی بھٹکنے نہیں دیا۔'' یہ کہہ کر پہلے اُس کاروالے نے حمید کے ادھورے اور قابلِ ستائش ہاتھوں کو چوما پھر یہ کہتے ہوئے وہاں سے چلا گیا۔

''اچھا بیٹے تم سے بہت جلد ملوں گا۔ تمہارے سنہری خوابوں میں رنگ بھرنے کے لیے تمہاری قسمت کو چار چاند لگانے کے لیے''

حمید نے اُس کی بات کو پہلے بڑی توجہ سے سنا اور پھر جب اُس نے چند لمحوں کے لیے اُس پر غور کیا تو اس کے چہرے کے تیور ہی بدل گئے۔ اُس کی آنکھیں سکڑ سی گئیں۔ لیکن وہ اُس کی بات کا جواب دینے کی بجائے پھر سے گرمیوں کی کڑی دھوپ میں ماں جیسی نیم کی گھنی چھاؤں میں آ گیا اور پھر سے آواز لگانے لگا۔

''صاب جی لے جائیں''
''اس پیکٹ کی قیمت صرف دس روپے ہے''
''یہ قیمت کوئی زیادہ نہیں ہے''
''اس پیکٹ کو میری پیاری بہنوں نے تیار کیا ہے''
''اس پر میری نیک ماں کے ہاتھوں کا لمس موجود ہے''
''لے جائیں صاب''
''لے جائیں بی بی جی''
''قیمت کوئی اتنی زیادہ نہیں ہے''

چند روز کے بعد وہی کاروالا اپنے وعدے کے مطابق چوک میں آیا۔ کار سے نیچے اتر کر ادھر اُدھر نظر دوڑائی دیکھا کہ وہ نیم جہاں پر ہر روز حمید کھڑا ہوتا تھا آج وہ تنہا تھی اور اُس کی گھنی چھاؤں میں جیسے اداسی نے ڈیرے ڈالے ہوئے تھے۔ یوں تو اس چوک کے اردگرد بڑی بھیڑ تھی لیکن حمید جس کے سنہری خوابوں کو اُجالنے کے لیے وہ یہاں آیا تھا کہیں نظر نہیں آ رہا تھا۔ شاید اُس نے اپنا ٹھکانا بدل لیا تھا ہمیشہ کے لیے۔ کاروالے نے اپنے تمام نیک ارادوں اور نیک تمناؤں کو سمیٹ کر بجھے ہوئے دل کے ساتھ کار کو سٹارٹ کیا اور بڑی آہستہ روی سے وہاں سے چلا گیا۔

سورج جو پہلے ہی آگ برسا رہا تھا اُس کے مزاج میں مزید تلخی آ گئی لیکن نیم کی چھاؤں میں اب بھی ٹھنڈک تھی جیسے وہ ماں کی طرح حمید کا انتظار کر رہی ہو۔

''ماربا''

شہناز خانم عابدی (کینیڈا)

گاڑی پارک کر کے جیسے ہی وہ اترا اس نے دیکھا ماربا آرام کر
سی پر نیم دراز ہے وہ تیزی سے لان کی طرف بڑھا اور ماربا کے نزدیک جا کر فکر
مندی کے لہجے میں بولا۔

''ارے تم باہر آ کر کیوں بیٹھی ہو تھک جاؤ گی۔ ویسے بھی اس موسم میں شام کے
وقت ہلکی سی خنکی ہو جاتی ہے۔ تمہارا بخار بھی بڑھ سکتا ہے۔''

ماربا نے گلابی ساڑھی پہن رکھی تھی اور شاید ساڑھی کے رنگ نے
اس کے چہرے پر چھائی ہوئی زردی کو قدرے کم کر دیا تھا۔ اس کی نسائیت جلال
کی غیر معمولی توجہ سے اندر ہی اندر اترانے لگی تھی۔ اٹھلا کر بولی۔

''بہت دن ہو گئے تھے آپ کا استقبال کرنا نصیب نہیں ہوا تھا سو
میں نے سوچا آج باہر بیٹھ کر آپ کو ویلکم ہوم کہوں۔'' اس سے پہلے کہ جلال کوئی
جواب دیتا ماربا نے چہک کر ایک سوال جلال کی جانب پھینک دیا۔ ''میں کیسی
لگ رہی ہوں۔؟ آج میں نے بہت عرصے کے بعد ساڑھی پہنی ہے۔''

جلال نے محبت بھری نظروں سے اس کی طرف دیکھا، اس کی
آنکھوں میں آنسو امڈ آئے تھے۔ وہ دیکھ رہا تھا ماربا کی صحت دن بہ دن گرتی جا
رہی تھی، اس کے چہرے کی گلابی رنگت زردی مائل ہو چکی تھی، اس کی آنکھوں
کے گرد سیاہ حلقے پڑ گئے تھے اور وہ بے حد دبلی اور کمزور ہو چکی تھی۔ جلال کا دل
اندر سے رو رہا تھا۔ ''کاش وہ ماربا کی صحت واپس لا سکتا۔''

''تم بہت حسین لگ رہی ہو۔'' جلال ماربا کے برابر کرسی پر بیٹھتے
ہوئے بولا۔ اور پھر اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر کہنے لگا۔

''ایک تو تم ہو ہی بلا کی خوبصورت اور پھر اس پر تمہارا یہ ساڑھی
باندھنے کا انداز۔

خدا کے واسطے اس کو نہ ٹوکو
یہی اک شہر میں قاتل رہا ہے

جلال شعر ایک خاص انداز سے پڑھتا تھا کہ حرف حرف دل میں
اتر جائے۔ ماربا اپنی تعریف سن کر شرما گئی۔ اسی دوران خرم اور سحر بھی بھاگے
بھاگے آئے اور بابا بابا کہہ کر جلال سے لپٹ گئے۔ جلال نے دونوں بچوں کو لپٹا
لیا اور بولا ''تمہارے دونوں معصوم فرشتے بابا پر حق جمانے آ گئے۔ کچھ دیر باپ
اور بچوں کا رومان چلا تا آنکہ بچے اپنی کھلائی رشیدہ کے ساتھ گھر کے اندرونی جا
نب لوٹ گئے جو بچوں کے تعاقب میں ہانپتی کانپتی پہنچ گئی تھی۔

جلال نے رشیدہ کو تاکید کی تھی کہ وہ بچوں کی ذمّہ داری سے ماربا کو
سبکدوش رکھے۔ رشیدہ خاصی بڑی رقم پر ان بچوں کے گورنس کے فرائض انجام دیتی
تھی۔ اسی سبب جلال کے آگے اپنی مستعدی کی نمائش کرنے سے نہیں چوکتی تھی۔

بچوں کے اندر چلے جانے کے بعد جلال نے ماربا کو آرام کرسی پر
سے اٹھایا اور اس کو سہارا دیتے ہوئے بیڈروم کی طرف چلا۔ وہ کسی چھوٹی بچی کی
طرح مچل گئی ''نہیں میں بیڈروم میں نہیں جاؤں گی۔ ڈائننگ روم میں چلو آج ہم
ساتھ ہی چائے ناشتہ کریں گے اور آج ڈنر بھی ساتھ ہی کیا جائیگا۔ یہ میرا فیصلہ
ہے۔۔۔ آپ کی اپنی ماربا کا۔''

''جو حکم سرکار۔'' جلال نے مسکراتے ہوئے کہا اور دونوں چلتے ہو
ئے کھانے کے کمرے میں جا کر بیٹھ گئے۔

''جلال مجھے بے حد دکھ ہے کہ میں نے تمہاری کبھی کوئی خدمت
نہیں کی، کوئی آرام تمہیں نہیں پہنچایا، ہمیشہ تم سے اپنے ناز نخرے اٹھواتی رہی، اپنی
باتیں منواتی رہی۔ مگر اب میری خواہش ہے کہ میں تمہاری خوب خوب خدمت
کروں اپنے ہاتھوں سے تمہیں کھانا پکا کر کھلاؤں۔۔۔ لیکن شاید اب دیر ہو چکی
ہے۔'' آخری جملہ کہتے کہتے اس کی آواز رندھ گئی۔ جلال نے اس کا آخری فقرہ
نہیں سنا۔ نقاہت نے ماربا کو زیادہ بولنے نہیں دیا۔ جلال نے اس کے ہاتھ سے
کپ لے کر ٹرے میں رکھا اور بولا۔

''تم جلدی سے اچھی ہو جاؤ پھر میں تم سے خوب خدمت لوں گا۔
ڈاکٹر کے آنے کا وقت ہو گیا ہے، اب چل کر لیٹ جاؤ۔'' جلال
نے سہارے سے ماربا کو اٹھایا اور خواب گاہ میں لے جا کر لٹایا۔ جیسے ہی وہ اس کو
لٹا کر جانے کے لئے مڑا ماربا نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا اور بولی۔

''ایک بات کہوں!''

جلال اس کے بیڈ پر بیٹھ گیا اور بہت محبت کے لہجے میں بولا

''ہاں بولو کیا بات ہے۔؟''

''کیوں نہ ہم کراچی چلیں میں کچھ دن آپ کے امی ابو کے ساتھ
رہنا چاہتی ہوں۔''

''تو اس میں کیا مشکل ہے۔ میں آفس سے ایک ماہ کی چھٹی لے
لیتا ہوں۔ پھر ہم سب کراچی چلیں گے ویسے بھی بہت دن ہو گئے ہیں ہم امی ابو
کے پاس نہیں گئے ہیں۔ جلال نے کہا۔

جلال اپنے ماں باپ کا اکلوتا بیٹا تھا۔ ایم۔ بی۔ اے کرنے کے بعد
اسے ایک امریکن کمپنی میں ملازمت مل گئی مگر اس ملازمت کے لئے اسے اسلام
آباد جانا پڑا۔ ملازمت ملتے ہی والدین نے شادی کرنے پر زور دیا۔ وہ اتنی
جلدی شادی نہیں کرنا چاہتا تھا مگر ماں کے سامنے اسے ہار ماننا پڑی۔ شادی کے
لئے اس نے ہاں تو کر دی مگر اسے شادی سے نہ کوئی دلچسپی تھی اور نہ ہی کوئی
خوشی۔ اس نے اپنی ہونے والی بیوی کی تصویر تک نہیں دیکھی تھی۔

شادی کے بعد جب اس نے پہلی مرتبہ ماربا کو دیکھا تو دیکھتا رہ گیا۔ اس نے اس سے پہلے اتنا حسین چہرہ نہیں دیکھا تھا۔ ماربا پہلی ہی نظر میں اس کے دل میں ایسی اتری کہ وہ اسے دل وجان سے چاہنے لگا۔

ماربا امیر ماں باپ کی لاڈلی بیٹی، بھائی بہن کی چہیتی، ساس سسر کی پیاری بہو اور اپنے شوہر کی دل وجان تھی۔ وہ بے حد خوبصورت تھی اتنی خوبصورت کہ جو دیکھتا، دیکھتا ہی رہ جاتا۔ اپنے پرائے سب لوگوں نے اس کے حسن کی تعریف کر کر کے بچپن سے ہی اسے اسپوئل (Spoil) کر دیا تھا۔ محبت بھی اسے بہت ملی تھی۔ ماں باپ، بہن بھائی سب اس سے بہت محبت کرتے، اس کی دلجوئی کرتے اس کی ہر خوشی، ہر ضد پوری کرتے۔ وہ نہ کسی کی خدمت کرتی اور نہ ہی کسی کی دلجوئی کرتی۔ وہ سوچتی ''سب اس کے لئے ہیں وہ کسی کے لئے نہیں ہے۔'' سب اس کی خوشامد کرتے رہیں، اس کی ہر بات مانتے رہیں یہی اس کی خواہش تھی۔ دوسروں کی خدمت کر کے، ان کے کام آ کر، جو خوشی اور طمانیت حاصل ہوتی ہے وہ اس سے واقف ہی نہ ہو سکی تھی۔

چھٹی ختم ہونے کے بعد جلال کو اسلام آباد جانا پڑا۔ وہ ماربا کو اپنے والدین کے پاس ہی چھوڑ گیا۔ وہ ان کی اکلوتی بہو جو تھی۔۔

جلال کے والدین کی خوشی کا کوئی ٹھکانہ نہ تھا، انہوں نے اپنی بہو کے خوب ناز نخرے اٹھائے، وہ انہیں بہت عزیز تھی۔ ان کا دل نہیں چاہتا تھا کہ وہ اپنی بہو کو اپنے سے جدا کریں لیکن بیٹے کا بھی خیال تھا اس لئے نہ چاہتے ہوئے بھی انہوں نے کچھ دنوں کے بعد ماربا کو جلال کے پاس اسلام آباد بھیج دیا۔

جلال کو کمپنی نے اچھے عہدے کی وجہ سے بہت سہولیات دی تھیں، تنخواہ بھی بہت اچھی تھی۔ جلال نے ماربا کو بہت عیش وآرام سے رکھا ہوا تھا۔ وہ دن بھر ناولیں پڑھتی رہتی، ٹی وی دیکھتی رہتی، فون کرتی رہتی اعلیٰ طبقے کی خواتین اور ایک دو انگریز خواتین کے ساتھ پارٹیوں میں شرکت کرتی اور خود بھی پارٹیز کرتی اور شاپنگ کرنا، یہی اس کی مصروفیات تھیں۔ گھر کے کام کاج کے لئے نوکر تھے، گھر کا کوئی کام اسے نہیں کرنا پڑتا۔ شادی کے ایک سال بعد خرم پیدا ہو گیا جلال نے اس کے لئے بھی ایک آیا کا انتظام کر دیا۔ خرم کے دو سال بعد سحر پیدا ہو گئی رشیدہ جو خرم کی دیکھ بھال کرتی تھی اب دونوں بچوں کو سنبھالنے لگی۔ ماربا کی مصروفیات میں کوئی تبدیلی پیدا نہیں ہوئی تھی۔ لیکن تمام مصروفیات کے باوجود وہ اپنے بچوں کو ضرور وقت دیتی، ان سے کھیلتی، ان سے باتیں کرتی، ان کے پسندیدہ کھلونے خرید کر انہیں دیتی۔

وقت تیزی سے گزر رہا تھا ماربا کے چاروں اُور خوشیاں ہی خوشیاں تھیں، محبتیں ہی محبتیں تھیں۔

اچانک ماربا کو بہت تیز بخار ہوا، بخار کافی دنوں تک رہا۔ اس کے بعد سے اکثر یہ ہوتا کہ کچھ دنوں وہ ٹھیک رہتی پھر اسے بخار ہو جاتا، کبھی تیز اور کبھی ہلکا۔ جوب کی طرف سے جلال کو اعلیٰ طبی سہولیات حاصل تھیں، بہترین ڈاکٹرز اس کا علاج کر رہے تھے، اس کے ٹیسٹ کروائے جاتے، ڈاکٹرز اس کا چیک اپ کرتے مگر کسی نتیجے پر نہیں پہنچتے۔ جلال نے ماربا کے علاج میں کوئی کسر نہیں چھوڑی یہاں تک کہ حکیم کو بھی دکھایا۔ ماربا حکیم کی دوائی بہت مشکل سے کھاتی تھی لیکن جلال نے سمجھا بجھا کر ایک مہینے تک حکیم کی دوائی بھی کھلائی مگر کوئی افاقہ نہیں دکھائی دیا۔

اب تو اس کو مستقل بخار رہنے لگا، کبھی کم اور کبھی زیادہ، وہ دن بدن کمزور ہوتی جا رہی تھی اس کا رنگ روپ پھیکا پڑ گیا تھا۔ وہ اپنی بیماری کے بارے میں بہت سنجیدہ تھی۔ اس کی خواہش تھی کہ وہ جلد صحت یاب ہو جائے۔

ماربا بہت بدل گئی تھی، اس کی خواہشیں کم ہو گئی تھیں اس کا غرور ختم ہو گیا تھا۔ رحم، مروت، محبت پہلے جن کے معنوں سے بھی وہ بظاہر نابلد تھی اب اس کی شخصیت میں جگہ پانے لگے تھے۔ اس نے اپنی بیماری سے بھی بیزار ہونا چھوڑ دیا تھا۔ خیریت پوچھنے والوں سے بھی وہ شکر گزاری کا اظہار کرتی اور خود بھی رب کا شکر کرتی رہتی۔۔۔۔۔

اسے یہ محسوس ہونے لگا تھا جیسے وہ شاید اب زیادہ دن زندہ نہ رہ سکے گی۔ اس احساس کے ساتھ ہی اسے والدین کی محبت، بھائی بہن کا پیار، ساس سسر کا بیٹی کی طرح سمجھنا اور اسے بے حد محبت دینا، جلال کی محبت، پیار، اس کی ہر فرمائش پوری کرنا، اس کے ناز نخرے اٹھانا سب یاد آنے لگا، پچھتاوا بھی ہونے لگا کہ سب کے اتنے اچھے سلوک کے بدلے میں اس نے انہیں کیا دیا۔۔۔ ۔ وہ اپنے آپ کو گنہگار سمجھتی تھی اور سب سے معافی مانگنا چاہتی تھی۔ جلال سے بھی وہ بار بار معافی مانگتی۔

جلال ماربا کی اس تبدیلی سے خوش ہونے کے بجائے فکر مند تھا۔ ایک دن ماربا سے بولا ''تم مجھ سے فرمائشیں کیوں نہیں کرتیں۔؟ اور اپنی طبیعت کی خرابی کی بھی کوئی بات نہیں کرتی ہو۔''

''طبیعت کی خرابی کی تو میں عادی ہو گئی ہوں اور رہی فرمائش کی تو جب ضرورت ہو گی تو میں ضرور فرمائش کروں گی۔ ماربا نرم لہجے میں بولی۔

جلال اس کے چہرے کی طرف دیکھتا رہ گیا اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے اس نے ماربا کو لپٹا لیا۔

جلال اور ماربا کے والدین ان لوگوں کے آنے سے بہت مطمئن تھے۔ کیوں کہ ماربا کی بیماری کی وجہ سے سب ہی بہت پریشان اور فکر مند تھے اور یہی چاہتے تھے کہ یہاں کے بہترین ڈاکٹرز سے اسکا علاج کرایا جائے۔ کراچی آ کر ماربا بھی بہت خوش تھی۔ وہ اپنے ساس سسر سے لپٹ کر بہت روئی، ان سے بہت معافیاں مانگیں کہ میں آپ لوگوں کی کوئی خدمت نہ کر سکی الٹا آپ لوگوں سے اپنے نخرے اٹھواتی رہی۔ اپنے والدین اور بھائی بہنوں سے مل کر بھی بہت روئی ان سب سے بھی بہت معافی مانگی۔ مگر ان کے ساتھ جانے سے انکار کر دیا کہ میں ''اپنی سسرال میں ہی رہنا چاہتی ہوں۔''

جلال آغا خان ہسپتال کے جس فزیشن سے اس کا علاج کروانا چا

ہتے تھے معلوم ہوا وہ لندن گئے ہوئے ہیں چار دن بعد لوٹیں گے جلال نے انتظار کرنا ہی مناسب سمجھا۔

''ماربا! کیوں نہ ہم کلفٹن چلیں وہاں کی فریش ہوا شاید تمہیں فائدہ کرے۔اور کیونکہ ویک ڈیز ہیں اس لئے زیادہ مجمع بھی نہیں ہوگا۔۔۔۔۔''
جلال نے ماربا سے کہا۔

وہ دونوں ہوٹل کے باہر لگی ہوئی کرسیوں پر بیٹھ گئے۔ یہاں سے سمندر صاف نظر آرہا تھا۔شام کا وقت تھا،سورج غروب ہونے پر تھا،ایسا لگ رہا تھا جیسے پوری فضا کو سونے سے نہلا دیا گیا ہو۔جلال اور ماربا اس نظارے سے لطف اندوز ہورہے تھے اور گھونٹ گھونٹ کافی پی رہے تھے۔

''وہ دیکھو کتنا بڑا چاند نکلا ہے۔'' ماربا انگلی سے چاند کی طرف اشارہ کر کے جلال سے مخاطب ہوئی۔

''اس کا مطلب چودھویں کا چاند ہے۔'' جلال چاند کی طرف دیکھ کر بولا۔ دیکھتے ہی دیکھتے سنہری ماحول چاند کی ٹھنڈی فضا میں بدل گیا۔شام گہری ہونے کے ساتھ موجوں کا تلاطم بھی بڑھ گیا اور ٹھنڈک بھی بڑھ گئی۔ ماربا نے کھانسنا شروع کردیا۔

''ہمیں اب گھر چلنا چاہئے۔تمہاری طبیعت زیادہ خراب نہ ہو جائے۔'' جلال نے اٹھتے ہوئے کہا اور ماربا کو سہارا دے کر اٹھانے لگا۔ ماربا بہت خوش تھی بہت عرصے کے بعد وہ جلال کے ساتھ اس طرح تفریح کے لئے نکلی تھی۔

تھکن کی وجہ سے ماربا جلدی سوگئی۔جلال کو نیند نہیں آرہی تھی۔آدھی رات کے وقت ماربا کی آنکھ کھلی وہ بہت بے چین ہورہی تھی اچانک اس پر غفلت طاری ہونے لگی اس نے آنکھیں کھول کر دیکھا جلال اس کے پاس بیٹھا تھا جلال کو دیکھکر جیسے اسے ہوش آگیا۔اس نے جلال کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا،آنسوؤں کا سمندر بہہ نکلا بڑی مشکل سے بولی۔''جلال! میں مرنا نہیں چاہتی، میں تم سب سے جدا نہیں ہونا چاہتی۔'' اس کی آواز میں بڑا درد تھا۔

جلال پریشان سا ہوگیا اور بولا۔''تم ایسی باتیں کیوں کررہی ہو۔ تمہیں کچھ نہیں ہوگا، میں تمہیں اپنے سے جدا نہیں ہونے دوں گا تم بہت جلد اچھی ہوجاؤ گی۔''

''کوئی مجھے اس خوبصورت زندگی سے دور لے جانا چاہتا ہے۔'' ماربا نے جلال کے ہاتھ کو مضبوطی سے پکڑ کر کہا۔

''ماربا! پلیز ایسی باتیں مت کرو تمہیں مجھ سے کوئی جدا نہیں کر سکتا۔'' جلال رورہا تھا۔

''چند لمحوں بعد ماربا نے آنکھیں کھول کر جلال کی طرف دیکھا اور بولی''اللہ حافظ۔۔۔۔''

جلال اسے چیخ چیخ کر آوازیں دے رہا تھا اور رورہا تھا۔۔۔گھر کے سب لوگ اکھٹے ہوگئے ،فوراً ڈاکٹر کو بلایا گیا ڈاکٹر نے اس کی موت کی تصدیق کردی۔ پورا گھر ماتم کدہ بن گیا۔ ہر آنکھ اشکبار تھی۔اور جلال۔۔۔وہ ماربا کی جدائی کے صدمے سے بے حال تھا۔

بڑی مشکل سے اس نے خرم اور سحر کی وجہ سے اپنے آپ کو سنبھالا۔

ماربا کی موت کا غم جلال کے والدین کو بھی بہت تھا۔وہ اس کو اپنی بیٹی کی طرح مانتے تھے۔لیکن خرم اور سحر کی وجہ سے وہ چاہتے تھے کہ جلال شادی کرلے۔لیکن جلال شادی کا نام تک سننے کو تیار نہیں تھا۔

ماربا کی موت کو ایک سال سے زیادہ ہوگیا تھا۔اس مرتبہ جلال کراچی اپنے کزن کی شادی میں آیا تھا۔جلال کو دیکھتے ہی خرم بھاگ کر اس کی گود میں چڑھ گیا۔جلال نے ادھر اُدھر دیکھا پھر پوچھنے لگا''امی سحر کہاں ہے۔؟'' اتنے میں سحر ایک نازک سی لڑکی کا ہاتھ تھامے ہوئے آئی۔سحر جلال کو دیکھتے ہی اس لڑکی سے اپنا ہاتھ چھڑا کر بابا بابا کہتی ہوئی جلال سے لپٹ گئی۔

''امی! یہ لڑکی کون تھی۔؟'' کُسم کے جانے کے بعد جلال نے پوچھا۔

''یہ میری دوست کی بیٹی کُسم ہے۔ پہلے یہ پشاور میں رہتے تھے تقریباً ایک سال ہوا یہ لوگ کراچی شفٹ ہوگئے ہیں۔نزدیک ہی رہتے ہیں۔تم نے دیکھا دونوں بچے اس سے کسطرح مانوس ہوگئے ہیں۔''

جلال خاموش ہوگیا وہ ماں کا مطلب سمجھتا تھا۔ماں نے بھی زیادہ بات نہیں کی۔

کُسم کو دیکھ کر ماربا کے ساتھ بتایا ہوا ہر ایک پل پلٹتا ہوا محسوس ہوا۔اس نے آنکھیں بند کیں اور اپنی بند آنکھوں کے آگے کُسم کو موجود کرلیا۔کُسم کا چہرہ مہرہ ماربا سے بالکل مشابہہ نہ تھا اس کے باوجود وہ ماربا لگ رہی تھی۔کُسم کا سارا وجود، ظاہر، باطن ماربا کو وائبریٹ کررہا تھا۔جلال نے کُسم کو اپنی بند آنکھوں سے دیکھنے اور اس کی جگہ ماربا کو محسوس کرنے کے بعد آنکھیں کھولیں۔ اپنے حواس مجتمع کئے،سر کو ایک دو مرتبہ دونوں جانب گھمایا اور اپنی حالت پر ہنسا۔ ''ماربا کی جدائی شاید مجھ سے برداشت نہیں کی جارہی ہے۔اس کا دنیا سے چلا جانا میرے دل، ذہن اور روح نے اب تک قبول نہیں کیا ہے اسی لئے کُسم میں ماربا کا احساس ہورہا ہے۔لیکن کُسم ہی کیوں۔؟ ماربا کی عمر کی ہر قبول صورت عورت کے اندر ماربا کیوں نہیں محسوس ہوئی۔۔۔۔۔''

شادی کا ہنگامہ ختم ہونے کے بعد ایک دن ماں نے جلال کو اکیلے میں بٹھا کر بہت سمجھایا کہ''کُسم بہت اچھی لڑکی ہے میں اس کے پورے خاندان سے واقف ہوں۔تمہارے بابا کو بھی پسند ہے، بچے بھی اس سے بہت ہل گئے ہیں وغیرہ وغیرہ۔۔۔۔'' لیکن جلال نے شادی کرنے سے صاف انکار کردیا اور جا کر اپنے کمرے میں لیٹ گیا۔اس کو نیند نہیں آرہی تھی۔ماربا مستقل اس کے سامنے تھی اس کی ایک ایک بات اس کو یاد آرہی تھی۔ماربا کی یاد میں آنکھیں،

رخسار اور تکیہ بھگوتے ہوئے اس نے دیکھا ماربا اس کے بیڈ کے سامنے کھڑی ہے۔سفید ساری میں ملبوس وہ حسن کی زندہ تجسیم دکھائی دے رہی تھی۔

جلال نے اس کا نام لیا یا شاید اس سے کچھ کہنے کی کوشش کی لیکن ماربا نے اپنے ہونٹوں پر انگلی رکھ کر اسے چپ کر دیا، وہ ہنسی اپنی مخصوص دلآویزی سے اور پھر سفید ساری میں ملبوس وجود، گلابی رنگ کے شلوار قمیص پہنے کسم کے وجود میں بدل گیا۔'' جلال مجھ میں اور کسم میں کوئی فرق نہیں ہم دونوں ایک ہیں۔کسم جو ماربا بھی ہے اور ماربا جو کسم بھی ہے۔۔تمہاری، بچوں کی ، ماں باپ اور ساس سسر کی خدمت کی حسرت لے کر میں اس دنیا سے چلی گئی تھی۔میری یہ حسرت اس قدر شدید اور سچی تھی کہ کسم کے وجود میں گھل مل کر ایک ہو کر لوٹ آئی ہوں۔''الفاظ کے جلال کی سماعت میں داخل ہونے کے فوراً بعد نیند نے اس پر غلبہ پالیا اور وہ سو گیا۔اچانک اس کی آنکھ کھلی، وہ جنوری کی سردی کے باوجود پسینے سے شرابور تھا،اس نے گھڑی دیکھی صبح کے پانچ بج رہے تھے یہ وہی وقت تھا جب ماربا کی روح اسکے بدن سے جدا ہوئی تھی۔فجر کی اذان کی آواز اس کے کانوں میں آئی۔

''آؤ نماز کی جانب''۔۔۔''آؤ فلاح کی جانب''

جلال نے بستر چھوڑ دیا۔چوکیدار سے گیٹ بند کروا کے وہ قریبی مسجد کی طرف دوڑ پڑا۔مسجد سے واپسی پر اس نے ایک بار پھر ماربا کو دیکھا جو پلک جھپکنے میں کسم بن گئی اور پھر فضا میں تحلیل ہو گئی۔

گیٹ سے جلال سیدھا میڈیٹیشن روم کے اندر چلا گیا۔کمرے کے ایک گوشے میں اس کی امی اور دوسرے کونے میں ابوذکرِ ربی میں مصروف تھے۔جلال خاموشی سے امی کی چوکی کے پاس بیٹھ گیا۔کچھ دیر بعد وہ اس سے مخاطب ہوئیں۔

''کیا بات ہے جلال! کچھ کہنا ہے۔؟''

''جی امی جان۔''

''اچھا تو پھر کہو۔''

''امی۔۔آپ کسم والوں سے بات کر لیں۔۔۔یہی کہنا ہے۔''

یہ سن کر جلال کی والدہ سجدے میں گر گئیں۔سجدے سے سر اٹھا کر انہوں نے جلال کو لپٹا لیا۔

سب لوگ حیران تھے کہ جلال اچانک شادی کے لئے کیسے تیار ہو گیا۔۔۔اور خوش بھی تھے کہ جلال کی سونی زندگی میں ایک مرتبہ پھر خوشیوں کا ڈیرا ہوگا۔

...... دِل مسافر ہے ......

رومانہ رومی نے شاعری میں جو رنگ اپنایا ہے اُسے میں فکر اور خوش کلامی کا امتزاج قرار دوں گا۔انہوں نے جو کچھ بھی کہا اور پورے اعتماد (Confidence) اور تیقّن (Commitment) کے ساتھ کہا۔

وہ سادہ، مانوس اور سلیس الفاظ میں اپنے خیالات رقم کرتی ہیں۔اُن کے اشعار تخیل اور تکلم کی پیچیدگیوں سے پاک ہیں اس لیے دل پر اثر کرتے ہیں۔انہوں نے معاملاتِ قلب ونظر پر بھی طبع آزمائی کی ہے اور انہیں حالاتِ حاضرہ کا بھی بخوبی ادراک ہے۔پورے کلام پر ایک پُر کیف رجائیت کی فضا طاری ہے جو قاری کو اپنی گرفت سے نکلنے نہیں دیتی۔انہوں نے نسوانی جذبات کا اظہار بھی بڑی متانت کے ساتھ کیا ہے اور یہ بات اُنہیں بہت سی ہم عصر شاعرات سے ممتاز کرتی ہے۔

......ڈاکٹر ایس۔ایم معین قریشی

اشاعت: ۲۰۱۵ء، قیمت: پانچ سو روپے، دستیابی: جبران اشاعت گھر، عائشہ منزل، اردو بازار، کراچی۔

مجھے یہ جان کر مسرت ہوئی کہ کرشن چندر جی کی صد سالہ تقریبات کے سلسلے میں آپ اپنا نیا شعری مجموعہ ''جلوہ نظر نظر'' اُن کے نام منسوب کرنے جا رہے ہیں۔کرشن جی ایک صحت مند معاشرے کے لیے ہمیشہ اچھے ادب کے حامی رہے ہیں۔اُمید ہے ''جلوہ نظر نظر'' عوام میں مقبول ہو کر شعری ادب میں اپنا مقام حاصل کرے گا۔ ......سلمیٰ صدیقی

یہ خوشبو پیار کی آئی کہاں سے
یہ ہے اُردو زباں ہندوستاں سے

کیا بیاں ہوگا کسی سے اُس رُخِ تاباں کا حُسن
دید کے قابل ہے لیکن دیدۂ حیراں کا حُسن

اُس ماہِ مکمل کے ادھورے ہیں فسانے
چھپتا ہے وہ کم کم تو نظر آتا ہے کم کم

بچھائی ہیں کس نے اپنی آنکھیں تیرے رستے میں
نظر نیچی کئے آنا ذرا آہستہ آہستہ

شوق سے آپ مسکرائیں مگر
دِل نہ ٹوٹے کہیں ستاروں کا

(جلوہ نظر نظر سے منتخبہ)

ایک عورت کی عام سی کہانی

سیدسعیدنقوی

(نیویارک)

''لاہور سے امرتسر پہنچنے والی گاڑی ان گنت لاشوں سے اٹی پڑی ہے۔ چند ہی مسافر زندہ تھے، وہ بھی مردوں سے بدتر۔ کٹے بازو اور پیٹ سے ابلتی آنتوں کے ملبے تلے دبے ہوئے''، احمد علی نے گھنڈی مروڑ کر ریڈیو بند کردیا۔ اس کے ماتھے پر پسینے کی بوندیں پھوٹ پڑی تھیں۔ وحشت جیسے ریڈیائی لہروں کے زریعے اس ریل گاڑی سے اس کے جسم میں منتقل ہوگئی تھی۔ ملک کے دوٹکڑے ہونے کی داستان خون کی ندیوں اور کٹی ہوئی لاشوں سے لکھی جارہی تھی۔ اس نے کرتے کے بٹن کھول دیے۔ مگر گرمی کا احساس کم نہ ہوا۔ نومبر کے مہینے میں یہ گرمی؟ نومبر میں تو لدھیانہ میں کمبل اور سوئٹر کا موسم آجاتا تھا۔ شاید گرمی کے احساس میں وہ اپنے خوف کو بھول جانا چاہتا تھا۔ یا پھر سب کچھ بدل رہا تھا، موسم بھی اور احساسات کا پیمانہ بھی۔

''ابا، جسونت چاچا آئے ہیں'' اکبر علی کے نوعمر بیٹے قادر نے کمرے میں جھانک کر کہا

''جسونت، کہاں ہے وہ، کیوں آیا ہے؟'' اکبر علی کے سارے خدشات سوال بن کر کھڑے ہوگئے۔

''ابا، باہر کھڑے ہیں۔ان کے ساتھ چاچی بھی ہے۔ پوچھ رہے ہیں کہ اگر آپ گھر پر ہیں تو وہ اندر آجائیں؟''

''کہہ دو میں گھر پر نہیں ہوں'' اکبر علی کا پہلا ردِعمل یہی تھا۔ اگر موت کے فرشتے کو پتہ چل جائے کہ مطلوب اس وقت گھر پر نہیں تو شاید وہ ٹل جائے؟ ''ٹھہرو، ایسا کرو چاچی کو اندر بھیج دو امی کے پاس، اور جسونت کو یہاں لے آؤ'' اکبر علی نے بیٹھک کی کرسی سیدھی کی، ریڈیو کو ریڈیو پوش سے ڈھانک دیا، اور اپنے کرتے کے بٹن لگا لیے۔ اس نے آئینہ میں چہرہ دیکھا، اندرونی گھبراہٹ چہرے پر نظر نہ آئے۔ انگلیوں سے بال سیدھے کر لیے۔

''سلام اکبر جی''۔ جہاں تک اکبر علی کو یاد تھا ان کا اور جسونت کا خاندان کئی صدیوں سے لدھیانہ کے اسی محلے میں رہ رہا تھا۔ ۱۸۵۷ء کی جنگ میں اکبر علی کے پرنانا شہید ہوئے تو جسونت کے پردادا نے ہی ان لوگوں کو پناہ دی تھی۔ ورنہ اکبر علی کے پرنانا کا تو سارا خاندان ہی گوروں کے زیرِ عتاب آگیا تھا۔ بھگت سنگھ کی پھانسی پر کیسے اکبر علی اور جسونت نے مل کر غم منایا تھا۔ اکبر علی کے گھر ہونے والی ہر نذر، نیاز میں جسونت کا خاندان ایسی عقیدت سے شریک ہوتا تھا کہ اوپر والے کو بھی ان کا سکھ ہونا بھول جائے۔ مگر اب کئی برس سے ماحول بدل گیا تھا۔ بٹوارے سے پہلے ہی دلوں کا بٹوارہ ہوگیا تھا۔ اب جسونت سنگھ ایک سکھ اور اکبر علی مسلمان رہ گئے تھے۔ وہ دو دوست، دو انسان مذہب کی اس تفریق میں کہیں کھو گئے تھے، اب ایک سکھ اور مسلمان باقی تھا، جنہیں اچانک اپنی شناخت یاد آگئی تھی۔ ایسے میں اگر اچانک سال بھر کے بعد جسونت سنگھ ملنے چلا آئے تو سمجھو کچھ ہونے والا تھا۔

''کیسے ہو اکبر علی، جے ہووا ہگر و کی؟''

''ٹھیک ہوں جسونتے'' نہ چاہتے ہوئے بھی اکبر علی کے ہونٹوں سے وہ نام نکل گیا جو ان کی دوستی کی یاد تھی۔ ورنہ انہوں نے تو سوچا تھا اسے جسونت سنگھ کہہ کر مخاطب کریں گے۔

''بس اکبر جی حالات بہت بگڑ گئے ہیں۔ لدھیانہ مسلمانوں سے خالی ہو رہا ہے۔ خدا کی قسم مجھے اس بات کا بہت دکھ ہے، میں نہیں چاہتا کہ ایسا ہو'، جسونت بھی روانی میں اسی خدا کی قسم کھا گیا تھا جس کے بندوں سے اسے ناتا توڑنے پر مجبور کیا جا رہا تھا۔

''میں بھی نہیں چاہتا تھا کہ ایسا ہو جسونت سنگھ۔ صدیوں سے اسی زمین سے پیوست تھے۔ جڑیں اکھڑ جائیں تو درخت کتنا کمزور ہوجاتا ہے۔ ہماری تو پرکھوں کی ہڈیاں اسی خاک میں ملی ہوئی ہیں۔ زمین کی تو بڑی شناخت ہوتی ہے، اب ہمیں اپنی نئی شناخت قائم کرنی پڑے گی'' اکبر علی کے لہجے میں نہ چاہتے ہوئے بھی زہر گھل گیا۔

''اکبر جی، آپ کو یہاں سے نکلنے میں جس مدد کی ضرورت ہو میں حاضر ہوں۔ میں آپ سے یہ نہیں کہہ رہا کہ آپ چلے جاؤ۔ وہ آپ کا اپنا فیصلہ ہے۔ میں تو آپ کو کبھی یہ مشورہ بھی نہ دیتا، مگر یہاں آپ بہت خطرے میں ہیں۔ میں بھی نہیں بچا سکوں گا۔ میرے کان کھلے ہیں، اور لوگوں کے ارادے میرے کانوں میں سیسہ انڈیل رہے ہیں جی، سیسہ۔ انہیں آپ کی موجودگی کھل رہی ہے اکبر علی۔''

''ہاں جسونتے، میں نے تو سوچا تھا کہ تمھیں بھی نہ بتاؤں اور خاموشی سے ایک دن نکل جاؤں۔ اب کس پر بھروسہ کرے آدمی۔ مگر تجھے دیکھ کر نہ جانے کیوں دل بھر آیا ہے۔ اور جب دل بھر آئے تو بھروسہ بھی کر لیتا ہے، دل کے اپنے ہی اصول ہیں، عقل کی کب بات مانی ہے اس نے۔ بھیا سارا سامان بندھا رکھا ہے، بس دو چار دن میں روانگی ہے۔''

''مجھے وشواس تھا اکبر علی، کہ تسی صحیح فیصلہ کرو گے، میں اسی لیے آیا تھا اس وقت'' جسونت کی آواز میں اکبر علی کو ذرا لجاجت کا شبہ ہوا تو انہوں نے یکدم سر اٹھا کر اس کی جانب دیکھا۔ وہاں چہرے پر جو تھا وہ اسے سمجھ نہ سکا کبر علی خاموش رہے۔ 'بہتر ہے کہ اسی کو بولنے دوں۔ جب چھت ہی گر جائے تو بے آسرا تو ہونا ہی ہے۔ بس دیواریں گرنے سے پہلے نکل جائیں یہاں سے کسی طرح۔ یہ یہاں بے مقصد تو نہیں آیا' اکبر علی نے ذہن میں اٹھتے خدشات کو

چہرے تک نہ آنے دیا۔

''اکبر علی میں سیدھی بات کرنا چاہتا ہوں۔تو میرا بچپن کا متر ہے، ہمارے بچے بھی ساتھ کھیلے ہیں۔تمھارے بچے میرے، بچوں ہی جیسے ہیں!''

اکبر علی اب بھی خاموش تھے۔تمھید سے کوئی اشارہ نہیں مل رہا تھا کہ بات کس طرف جا رہی ہے۔بس اتنا یقین تھا کہ جسونت کی آمد بے مقصد نہیں۔یہ مدعا کس کروٹ بیٹھے گا۔اکبر علی کے ذہن نے اور کچھ سوچنے سے فی الحال انکار کر دیا۔

''اکبر علی، ہماری خواہش ہے کہ جانے سے پہلے ہماری بیٹی روشن ہمیں دے دو۔''

''کیا؟''اکبر علی اضطراب میں کھڑے ہوگئے۔زیور، زمین؟ یہ سب تو وہ جب چاہتا چھین سکتا تھا۔لیکن اس کی یہ مانگ تو بہت خوفناک تھی''کیا کہہ رہا ہے جسونتے''۔جسونت سنگھ سے جسونتے کی یہ جست بے معنی نہیں تھی۔ اکبر علی کا ذہن خطرے کی بو سونگھ کر طوفان کے آگے کمزور بند باندھ رہا تھا۔

''اکبر علی، میری بڑی خواہش ہے کہ روشن میرے گھر کا چراغ بنے۔مجھے اور تیری بھابی کو وہ ہمیشہ سے بہت پسند ہے۔میری خواہش کہ اسے اپنی بہو بنا کر لکشمی اپنے گھر لے آؤں؟''

''لیکن جسونت، یہ کیسے ممکن ہے؟''

''کیوں اکبر علی، ہم بچپن کے دوست ہیں۔بچے ساتھ پلے بڑھے ہیں۔ایک دوسرے سے خوب واقف ہیں۔اگر تمھیں ملوم نہ ہو تو ایک دوجے کو پسند بھی کرتے ہیں۔یہ ہماری امانت ہمیں دے جاؤ۔پھولوں کی طرح رہے گی، ہمارے گھر۔''

''جسونت ہماری نسلوں میں کبھی بیٹی سکھوں میں نہیں بیاہی گئی۔ اب بھی نہیں بیاہی جائے گی۔''

''اکبر علی، ایسا مت کرو۔تمھیں اس سے بہتر سمبندھ نہیں ملے گا۔بھابی اور دونوں لڑکوں کو لے کر نکل جاؤ،لیکن روشن ہمیں دے دو، جوان لڑکی کا ساتھ لے جانا بھی خطرناک ہے۔''

''جسونت، ایسا کسی حال میں ممکن نہیں۔سورج مغرب سے نکل سکتا ہے،لیکن روشن کو میں مہندر کے ہاتھ میں نہیں دے سکتا، کسی صورت نہیں۔''

''اکبر علی، مجھے مجبور نہ کر۔روشن کو تو میرے گھر ہی جانا ہے، کس طرح یہ تمھارا فیصلہ ہے۔''

''کیا مطلب ہے اس بات کا جسونت سنگھ؟''اکبر علی کے بدن میں رعشہ پیدا ہوگیا

''اکبر علی، روشن کو ساتھ لے جانے کی کوشش کرو گے، تو تمھارا خاندان یہاں سے زندہ نہیں نکل سکے گا۔روشن کو میری بہو ہی بننا ہے۔''

''جسونت''اکبر علی کی آواز رندھ گئی، ان کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

جسونت نے اٹھ کر اپنی پگڑی اکبر علی کے قدموں میں ڈال دی

''رب دی سوں، اکبر، مجھے مجبور نہ کر۔مجھے ایسا کرنے پر مجبور نہ کر کہ میں آئنہ بھی نہ دیکھ سکوں اور اپنے آپ سے شرمندہ رہوں۔مہندر روشن کے بغیر مر جائے گا۔اس کے دوستوں نے اسے وچن دیا ہے۔میں انہیں نہیں روک سکوں گا۔اکبر علی تو بھاوج سے مشورہ کر لے، میں کل صبح آؤں گا۔بعض دفعہ دل سے نہیں دماغ سے سوچنا پڑتا ہے اکبر علی۔روشن بیٹی سے بھی پوچھ لے۔''

''مہندر سنگھ کے مرنے کی تجھے اتنی فکر ہے، روشن اس کے ساتھ مر جائے گی۔''

جسونت سنگھ نے کوئی جواب نہ دیا، اپنی پگڑی اٹھائی اور باہر بر آمدے سے آواز لگائی''چل چاندنی''اور دونوں میاں، بیوی اکبر علی کے گھر سے نکل گئے۔

اکبر علی کی بیوی، جسونت اور چاندنی کے جاتے ہی کمرے میں آ گئی۔

''کیا ہوا قادر کے ابا، کیوں آئے تھے جسونت بھائی؟''

اکبر علی کی زبان سے پہلے اس کے چہرے نے داستان سنا دی۔ اکبر علی کی بات ختم ہوئی تو بیوی نے سینہ کوٹ لیا، پھر دونوں میاں بیوی رو پڑے۔ دو بیٹے اور ایک بیٹی۔روشن واقعی تھی بھی روشن۔خوب صورت اور خوب سیرت۔ رنگ ایسا کہ ہاتھ لگائے میلا ہو۔ہنستی، مسکراتی خوش دل روشن تو ان کے آنگن کا چاند تھی، اس کا ہاتھ کیسے ایک سکھ کے ہاتھ میں دے دیتے۔

''اب کیا کریں قادر کے ابا؟''قادر کے ابا کیا بتاتے۔ان کے جسم کا سارا خون تو جسونت نچوڑ کے لے گیا تھا۔ان کا قاتل مژدہ سنا گیا تھا کہ اگر زندگی چاہیے تو اپنا داہنا ہاتھ ہمیں دے دو، اور خوشی سے دو۔اور صرف اکبر علی کی زندگی ہی کیا، بیوی اور دو بیٹے۔ان سب کا کیا حشر ہوگا۔پھر انکار کی صورت میں خود روشن کا کیا حشر کریں گے۔ابھی تو بیاہ کی بات کر رہے ہیں۔انکار کی صورت میں اغوا، زنا، قتل اکبر علی کو جھرجھری آ گئی۔وہ اپنی سوچ مکمل بھی نہیں کر سکا۔

روشن اس مسئلے سے بے خبر نہیں تھی۔عورت تو ہمیشہ اپنے خاندان کی ضامن رہی ہے، چاہے مالِ غنیمت یا گروی ہو کر ہی سہی۔اپنے خاندان کی بقا کے لیے، مغرور شہزادیاں تک جابر حکمرانوں کے حرم میں داخل ہوتی رہی ہیں۔روشن کو معلوم تھا کہ اس کے والدین کوئی فیصلہ نہیں کر سکیں گے۔وہ مہندر سے بچپن سے واقف تھی۔وہ ایک اچھا آدمی تھا۔لیکن اس کے ذہن میں کبھی اس سے شادی کا سوال ہی پیدا نہیں ہوا تھا۔وہ اس ممنوعہ خیال کو کبھی ذہن میں بھی نہیں لائی تھی۔لیکن اب یہ عام حالات کب رہے تھے۔اسے معلوم تھا کہ اس کی قربانی سے اس کے ماں، باپ اور دونوں بھائی خیریت سے پاکستان پہنچ جائیں گے۔اگر وہ اس سمبندھ پر راضی نہ ہوئی تو وہ سب مارے جائیں گے۔نفرت اور غصہ میں وہ کچھ بھی کر سکتے ہیں۔مار دینا تو شاید آسان سزا ہو۔

روشن بیٹھک کا دروازہ کھول کر اندر داخل ہو گئی۔اس کے ماں باپ نے چونک کر اسے دیکھا۔وہ اس کی موجودگی تو بھول ہی گئے تھے۔دونوں کے لبوں پر قفل لگ گئے۔اکبر علی اضطراب میں کھڑا ہو گیا۔روشن بغیر کچھ کہے باپ کے سینے سے لگ گئی۔دونوں سسکنے لگے۔ایک اپنی بے بسی پر، دوسری ان دیکھے کے خوف سے۔

''بیٹی فکر نہ کر، چاہے ہماری جان چلی جائے۔'' اکبر علی بات مکمل بھی نہ کر سکے

''نہیں ابا نہیں، اللہ آپ لوگوں کو امان میں رکھے''

''لیکن روشن'' اس کی امی نے کھڑے ہو کر اس کے لرزتے جسم کو لپٹا لیا۔

''نہیں امی، میں ایسا کرنے سے پہلے مر جاتی۔لیکن میری موت بھی آپ لوگوں کی زندگی کی ضمانت نہیں بن سکتی۔میری عمر قید سے آپ سب کی جانیں بچ جائیں گی۔اگر آپ میری جگہ ہوتیں تو کیا کرتیں۔یہ سب سوچ کر تو میں مر بھی نہیں سکتی۔آپ جسونت چاچا کی بات مان لیں۔آگے جو خدا کو منظور ہوگا۔جو اس نے لکھ دیا ہے وہی ہو کر رہے گا۔''

اور وہی ہو کر رہا۔انسان حالات کے سامنے ایسا بے بس ہے جیسے طوفانی ہواؤں میں شاخ سے ٹوٹا کوئی پتہ۔نے ہاتھ باگ پر ہے نہ پا ہے رکاب میں۔روشن کی ضد تھی کہ وہ سرخ، پیلا، نیلا کوئی رنگدار جوڑا پہن کر گھر سے نہیں جائے گی۔پچھلے محرم جو کالا جوڑا پہنا تھا وہی پہن کر اکبر علی کے گھر سے مہندر کے گھر اترے گی۔اکبر علی نے بھی شرط رکھی کہ نکاح ہو یا نہ ہو، گردوارے میں پھیروں کے بعد ہی روشن مہندر کے گھر جائے گی۔جسونت نے ہر بات مان لی۔جسونت اور مہندر کی خوشی ان کے چہرے سے نمایاں تھی۔روشن نے کالا جوڑا بھی پہنا اور گردوارے میں پھیرے بھی ہوئے ۔ روشن کے آنسو نہ تھمتے تھے۔سب ہی کچھ دو دن میں ہو گیا۔روشن جسونت کے گھر گئی تو اسی رات اکبر علی نے گھر چھوڑ دیا۔جسونت نے بہت منت کی کہ چند دن تو ٹھہر جائیں، لیکن خود روشن نے ماں سے گڑگڑا کر التجا کی تھی، وہ تو چاہتی تھی، کہ اس کا خاندان اس کے پھیروں سے پہلے ہی چلا جائے، لیکن اکبر علی یقین کرنا چاہتا تھا کہ پھیرے ضرور ہوں۔روشن مالِ غنیمت نہ بنے۔کم از کم مہندر کے اپنے ایمان کی رو سے روشن اپنے جائز مقام کے ساتھ اترے۔

جسونت اور مہندر کے گھر میں روشن واقعی رانی کی طرح رہی۔شادی کی پہلی شب ہی جب مہندر کمرے میں داخل ہوا تو روشن نماز ادا کر رہی تھی۔وہ انتظار کرتا رہا کہ وہ نماز ختم کر لے، پھر بولا:

''روشن، میرے تو بھاگ جاگ گئے۔تو میرے دل کی رانی بن کر رہے گی۔تیری مرضی تو جس مذہب پر رہے۔میری طرف سے تجھ پر کوئی سختی نہیں۔تجھے یہاں کوئی تکلیف نہیں ہوگی۔تو میری جائز بیوی ہے، میری عزت ہے۔میں تو کب سے تیرے عشق میں گرفتار تھا۔یہ بٹوارہ نہ ہوتا تو شاید ہمارا سمبندھ بھی نہ ہو پاتا۔''

وہ نہ جانے کیا کیا کہتا رہا۔عذر تراشتا رہا۔حیلے، بہانے کرتا رہا۔روشن نے کچھ سنا کچھ نہ سنا۔اس نے تو دل میں سوچ رکھا تھا کہ اپنے گھر والوں کے جانے کے دو تین دن بعد سنکھیا پھانک لے گی۔یوں اس کے گھر والے حفاظت سے ہجرت کر جائیں گے اور وہ بھی عمر قید کی سزا سے بچ جائے گی۔

دن ہفتوں میں بدل گئے، روشن سنکھیا نہ پھانک سکی۔مہندر کے پیار کے آگے اس کے ارادے کمزور ثابت ہوئے۔اس نے روشن کو وہی محبت اور عزت دی جو اسے شادی کے بعد کسی بھی گھرانے میں ملتی۔جسونت اور اس کے گھرانے نے واقعی روشن کا ایسا سواگت کیا، جس کی ہر بہو تمنا ہی کر سکتی ہے۔روشن بیٹی کی طرح رہی۔وہ اپنے دین پر ہی قائم رہی۔

ہفتے مہینوں اور پھر سالوں میں بدل گئے۔روشن کے اب دو بچے تھے۔ایک لڑکا اور ایک لڑکی۔ان خوشی کے سالوں میں وہ اپنی ماں، اکبر علی، اور بھائیوں قادر، ذاکر کسی کو بھی ایک لمحہ کے لیے نہیں بھولی تھی۔اس نے اپنے آنسو کبھی آنکھوں تک نہیں آنے دیے تھے۔اس کے رویے سے مہندر کو بھی شکایت کا موقع نہ ملا۔روشن کو گھر والوں کی کوئی خبر نہ ملی۔صرف اتنا کہ کراچی کے علاقے ملیر میں بس گئے ہیں۔

''روشن، نادر پتر اب چوبیس برس کا ہو رہا ہے۔تیری بیٹی بھی بائیس برس کی ہو رہی ہے۔کچھ ان کے بیاہ کی فکر کر'' مہندر نے پیار سے روشن کا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لیتے ہوئے کہا۔سال ہا سال گزرنے کے بعد بھی مہندر کی محبت میں کوئی کمی نہیں آئی تھی۔

''تجھے کس کے بیاہ کی فکر ہے، بیٹے کے یا بیٹی کے'' روشن نے محبت سے اسے چھیڑا۔

''مجھے تو بیٹی کی پہلے فکر ہے، چھوٹی ہوئی تو کیا ہوا''

''اگر اسے کوئی مسلمان پسند آ گیا تو؟''

مہندر خاموش ہو گیا۔یہ بات بعید از امکان تو نہیں تھی۔لیکن روشن نے یہ سوال کیوں کیا ہے۔کیا ماں بیٹی نے کوئی لڑکا پسند کر رکھا ہے۔روشن اسے ایک متوقع خاموشی سے دیکھتی رہی۔

''جب وقت آئے گا تو دیکھا جائے گا'' مہندر نے بات ٹالی

''وقت آ تو گیا ہے۔تو ہی تو کہہ رہا ہے کہ ان کی شادی کی فکر کر''

''کیا اسے کوئی مسلمان لڑکا پسند ہے؟'' مہندر نے روشن کی آنکھوں میں جھانک کر پوچھا۔

''نہیں، اس نے کبھی ایسا کوئی تذکرہ نہیں کیا۔اور اگر ایسا ہوتا تو مجھے یقیناً معلوم ہوتا'' روشن نے پوری سچائی اور یقین سے جواب دیا۔مہندر کے دل کو قرار آ گیا۔اسے روشن پر اندھا اعتماد تھا۔

''مہندر ے''

''ہوں''

''ایک بات کہوں''

''کہہ'' مہندر نے اسے چونک کر دیکھا۔ روشن کے لہجے میں کوئی ایسی بات تھی جو نئی تھی۔

''اگر تو اجازت دے تو میں بچوں کو ان کے نانا سے پاکستان جا کر ملا لاؤں۔ میں چاہتی ہوں کہ بیاہ سے پہلے انہیں ایک بار ملا دوں جانے پھر موقع ملے نہ ملے۔''

مہندر سنّاٹے میں آ گیا۔ پچھلی پانچ منٹ کی گفتگو کا سیاق وسباق بدل گیا۔ مہندر کے دل میں وہ وسوسے جاگنے لگے جو پچھلے پچیس برس سے کہیں سوئے ہوئے تھے۔

''یہ ایسی آسان بات تو نہیں روشن۔ پاکستان کا ویزا، پھر ہمیں تو ان کا پتہ بھی نہیں معلوم، انہیں کہاں تلاش کریں گے'' اور دیگر کئی اندیشے جو اس کے ذہن میں سر اٹھا رہے تھے وہ انہیں زبان پر نہ لا سکا۔

''پچھلے برس، ادھر مسلم کالونی میں جو حامد صاحب رہتے ہیں، ان کی بیوی نے مجھے بتایا تھا کہ ابا کراچی میں کہاں رہ رہے ہیں۔ ان کا بھائی بھی ابا کے ساتھ ہی ہجرت کر گیا تھا۔ وہ ابا سے ملتا ہے کراچی میں۔''

''کچھ روز سوچ لیں اس بات پر روشن، یہ اتنا آسان تو نہیں'' مہندر اس سے زیادہ کچھ نہ کہہ سکا۔

''تو کہہ تو میں بیٹی کو چھوڑ جاؤں، تیرے لیے روٹی بھی بنا دیا کرے گی'' روشن جیسے مہندا کا ذہن پڑھ رہی تھی۔ گروی رکھنے کی روایت دہرائی جا رہی تھی۔

''پھر تجھے کوئی اعتراض تو نہیں مہندر؟'' وہ پوچھنا تو یہ چاہتی تھی کہ تجھے مجھ پر بھروسہ تو ہے ناں مہندر۔ مگر وہ ممکنہ جوابات کا خطرہ مول لینے کو تیار نہ تھی۔

''نہیں مجھے کیوں اعتراض ہوگا؟'' مہندر کا کچھ روز خاموشی کے بعد جواب آ گیا۔

روشن دونوں بچوں کو لے کر کراچی ایئرپورٹ اتری تو اس کا دل بے قابو ہو رہا تھا۔ اس نے جہاز میں ہی وہی کالا جوڑا دوبارہ پہن لیا تھا جس میں وہ باپ کے گھر سے مہندر کے گھر اتری تھی، اور جو اس نے سنبھال کر رکھا ہوا تھا۔ جو آنسو اس نے پچیس برس سے چھپا رکھے تھے اب وہ رکنے کو تیار نہیں تھے۔ اس نے حامد صاحب سے انتظام کر لیا تھا کہ ان کا بھائی انہیں کراچی ایئرپورٹ پر مل جائے، اور وہاں سے وہ اکبر علی کے گھر جائیں۔ روشن انہیں اچانک حیران کر دینا چاہتی تھی۔ نادر بھی خاصہ پرجوش تھا۔ اپنے والدین کی محبت دیکھ کر اسے کبھی شبہ بھی نہ ہوا کہ ان کے ماضی میں کوئی پیچیدگیاں بھی رہی ہوں گی۔ اسے تو بس یہی معلوم تھا کہ ان کے نانا کا خاندان پاکستان ہجرت کر گیا تھا، بس ان کی امی نہیں گئی تھیں۔

روشن نے لرزتے ہاتھوں سے دروازہ کھٹکھٹایا تو اکبر علی ہی نے دروازہ کھولا۔ دونوں کو کچھ کہنے کی ضرورت ہی نہ پڑی۔ روشن ان کے سینے سے لپٹ کر ایسی روئی کہ اکبر علی بھی گھبرا گئے۔ انہوں نے روشن کا کالا لباس دیکھا تو پچیس برس پہلے کی دلخراش یادیں تازہ ہو گئیں۔

''ارے بہو، دیکھو کون آیا ہے؟'' قادر کی بیوی جو دوپٹے سے ہاتھ پونچھتی باورچی خانے سے باہر آ رہی تھی، انہیں دیکھ کر ٹھٹھک گئی۔

''ابا یہ میرے قادر کی بیوی ہے، میری بھاوج'' روشن نے حیرت اور خوشی سے پوچھا۔

''ہاں بیٹی، آؤ اندر آؤ۔ قادر شام میں آ جائے گا نوکری سے۔ ذاکر کی تو ابھی شادی نہیں ہوئی۔ وہ بھی شام میں ہی لوٹے گا نوکری سے''

کوئی بھی روشن کی ماں کا ذکر نہیں کر رہا تھا۔ وہ تو پاکستان آنے کے بعد سالوں روشن کی تقدیر کو روتی رہی، پھر سینے پر یہ داغ لیے اپنے خالق سے ملنے چل پڑی۔ پچھلے برس جب روشن کو حامد صاحب سے اپنے گھرانے کا پتہ چلا تھا تو ماں کے انتقال کی بھی خبر مل گئی تھی۔

''ارے بھئی آؤ، ماشاءاللہ یہ کون ہے؟''

''ابا آپ کا نواسہ ہے، نواسی نہیں آ سکی''

''ارے بھئی واہ، اسے کیوں نہیں ساتھ لائیں؟''

روشن کی خاموشی میں اکبر علی کو جواب مل گیا۔ کچھ نزاکتیں سمجھی جا سکتی ہیں، بیان کر دو تو پھر وہ جواب کا عمل کا تقاضہ کرتی ہیں۔ خاموشی سب کی مجبوریوں کا پردہ رکھتی ہے۔

نادر نے آگے بڑھ کر اپنائیت اور تپاک سے سلام کیا۔ گو دونوں بیس برس سے زیادہ کے تھے لیکن یہ جذباتی ملاپ ان کے لیے نیا تھا۔ اس نے اپنی ماں کو کبھی اس طرح روتے نہیں دیکھا تھا۔

اکبر علی کے چہرے سے خوشی نمایاں تھی۔ ان کا بس نہیں چل رہا تھا کہ بیٹی اور نواسے کو کس طرح اپنے سے جدا نہ کریں۔ قادر کی بیوی کی سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ کس طرح کا رویہ رکھے۔ اس نے کچھ کچھ کہانی ضرور سن رکھی تھی، لیکن پوری تفصیل اسے بھی معلوم نہیں تھی۔ ''آیئے، اندر آیئے، قادر تو دیر میں آئیں گے۔ آپ لوگ بھوکے ہوں گے، میں کھانا لگاتی ہوں۔''

روشن نے سب کے لیے تحفے نکالے۔ سالوں کی دوری نے جو جھجک پیدا کر دی تھی وہ چند لمحوں کی رفاقت میں مسمار ہو گئی۔ گھر کا ماحول اجنبیت سے خوش گوار محبت میں تبدیل ہو گیا۔

قادر گھر آیا تو اس کے لیے یہ منظر غیر متوقع تھا۔ وہ بھولا نہیں تھا کہ اس کی مسلمان بہن، ایک سکھ کے ہاتھ چڑھ گئی تھی۔

نادر نے لپک کر ماموں سے گلے ملنا چاہا تو قادر نے ہاتھ بڑھا کر مصافحہ کر لیا۔ وہ خفیف سا ہو گیا اور ذاکر سے ہاتھ ملانے کی کوشش ہی نہیں کی۔ قادر کے رویے سے صاف ظاہر تھا کہ وہ ان لوگوں کی آمد سے خوش نہیں۔

رات کے کھانے اور رسمی علیک سلیک کے بعد نادر سونے چلا گیا۔ ذاکر، قادر، اکبرعلی اور روشن باتیں کرنے بیٹھ گئے۔ روشن، بھائیوں کے رویے سے الجھ گئی تھی۔

''تم یہاں کیوں آئی ہو'' قادر نے سوال کیا تو اس سے کوئی جواب نہ بن پڑا۔ اسے خود نہیں معلوم تھا کہ وہ یہاں کیوں آئی ہے۔

''یہ کس قسم کا سوال ہے، قادر'' اکبرعلی نے بیٹے کو ڈانٹا۔

''بھائی صحیح کہہ رہے ہیں، ابا'' ذاکر نے بھائی کی حمایت کی۔

''آپا، اس سکھ کے ساتھ رہنے کی بجائے تم مر کیوں نہیں گئیں؟''

''میں مر ہی گئی تھی۔ بس جسم زندہ رہا، پوری مر جاتی تو تم زندہ نہ ہوتے آج'' روشن رو پڑی۔ دونوں بھائی اس کے بہتے آنسوؤں کی طرف سے انجان بن گئے۔

''نادر کو دیکھ کر مجھے مہندر یاد آ رہا ہے۔ میں نے ہر رات خواب میں اس کمینے کی بوٹیاں نوچی ہیں روشن۔ ہم نے تو سب کو یہی بتایا تھا کہ تم مر چکی ہو۔ یہاں آنے کی کیا ضرورت تھی'' قادر کی مٹھیاں بھنچی ہوئی تھیں۔

''بہر حال اب آ گئی ہو تو واپس نہیں جاؤ گی۔ ہم جانتے بوجھتے تمھیں واپس اس سکھ کے پاس نہیں بھیج سکتے۔ کوئی اور ہوتا تو اپنے ہاتھ سے تمھیں قتل کر دیتا۔ یہ سوچ کر میں سو نہیں سکوں گا کہ ہم نے تمھیں اس کے پاس واپس جانے دیا ہے'' ذاکر کے لہجے میں قطعیت تھی۔ گو روشن سے چھوٹا تھا لیکن نفرت کی آگ میں رشتے کا احترام جھلس گیا تھا۔

''لیکن قادر۔۔'' روشن کے سامنے مہندر کا چہرا گھوم گیا۔ وہ اس کے یہاں آنے پر کچھ بولا نہیں تھا، لیکن خدشات اس کے چہرے پر تحریر تھے۔

''بس طے ہو گیا۔ نادر واپس جانا چاہے تو ضرور چلا جائے، اب تم وہاں واپس نہیں جا سکتیں''

''یہ تم مجھے قتل ہی تو کر رہے ہو۔ میں پہلے بھی اپنی مرضی سے ہی گئی تھی۔ ابا نے مجھے نہیں بھیجا تھا، اور ہاں میں جان دے سکتی تھی، لیکن اس کے بدلے وہ لوگ تمھاری جان کے درپے ہو جاتے۔ جس طرح انہوں نے میرا خیال رکھا ہے اور کوئی نہیں رکھ سکتا تھا۔ میں آج بھی اپنے مذہب پر قائم ہوں'' روشن کی ہچکیاں بندھ گئی تھیں۔

''کسی سکھ سے شادی کے بعد مذہب کیسا؟ اب تمھاری واپسی ایک گناہ ہوگی، ہم سب کی توہین!'' قادر کے لہجے سے اکبرعلی کو پچیس برس پہلے کا جسونت کا لہجہ یاد آ گیا۔ وہی رعونت، وہی اقتدار۔ وہی مذہبی منافرت۔ صرف سر پر پگڑی کی جگہ ٹوپی آ گئی تھی۔ انہیں قادر کے لہجے میں جسونت بولتا محسوس ہوا۔

اس رات کوئی نہ سو سکا۔ کل نوکری سے واپس آ کر وہ نادر سے بات کرے گا۔ قادر نے واضح کر دیا تھا۔ وہ آزاد ہوگا۔ چاہے تو ضرور یہیں رہ سکتا ہے، ورنہ اپنے باپ کے پاس واپس جا سکتا ہے۔

قادر اور ذاکر دوسرے دن کام پر جانے سے پہلے کچھ کھسر پھسر کرتے رہے۔

''لاؤ اپنے پاسپورٹ میرے پاس رکھا دو'' قادر نے سوال کیا، تو روشن نے انہیں یاد دلایا کہ پاسپورٹ تو اکبرعلی نے تحفظ کی خاطر اپنے پاس رکھ لیے تھے۔ ایک لمحے کو تو لگا کہ قادر باپ کو نیند سے جگا دے گا، مگر پھر ذاکر نے کہا کہ شام میں لے لیں گے۔ اکبرعلی ان کے جانے تک اپنے کمرے سے نہیں نکلے۔ اکبرعلی، ہجرت کے وقت تہی دامن آئے تھے۔ آہستہ، آہستہ بیٹوں کی کمائی پر انحصار بڑھتا گیا، تو ساتھ ہی بیٹوں کی گھر پر حاکمیت بڑھتی گئی۔

''روشن بیٹی، سامان کھولا تو نہیں؟'' اکبرعلی نے ناشتے کے کمرے میں آ کر روشن سے سرگوشی کی۔

''ابا'' روشن باپ کی بات سمجھ تو گئی تھی، لیکن الجھ گئی۔

''ابا، میں مہندر اور اپنے بچوں کے بغیر رہنے کا تصور بھی نہیں کر سکتی؟''

''میرا بھی یہی اندازہ تھا بیٹی۔ قادر اور ذاکر نفرت کی دھند میں اندھے ہو رہے ہیں۔ وہ یقیناً تیری زندگی میں دشواریاں گھولیں گے۔ پھر شاید میں بھی کچھ نہ کر سکوں۔

''ابا، کیا آپ کے خیال میں بھی مجھے مر جانا چاہیے تھا؟ ابا میں نے تو سکھیا۔۔''

''روشن تُو کتنی بار مرتی میری بیٹی۔ تُو نے تو ہم سب کو زندگی دی تھی۔ تُو مر جاتی تو میں بھی زندہ نہ رہ پاتا۔ مجھے خوشی ہے کہ انہوں نے تیرا اتنا خیال رکھا۔ پہلے تُو اکبرعلی کے خاندان کو بچانے کے لیے گئی تھی، اب مہندر سنگھ کے خاندان کو بچانا ہے۔''

روشن اٹھ کر سامان سمیٹنے لگی۔

کون کہتا ہے

کون کہتا ہے کہ موت آئی تو مر جاؤں گا!
میں تو دریا ہوں سمندر میں اُتر جاؤں گا
تیرا پیمانِ وفا راہ کی دیوار بنا
ورنہ سوچا تھا کہ جب چاہوں گا مر جاؤں گا
چارہ سازوں سے الگ ہے میرا معیار، کہ میں
زخم کھاؤں گا تو کچھ اور سنور جاؤں گا

احمد ندیم قاسمی

''جنوں خیز بھنور''

مامون ایمن
(نیویارک)

وہ ذات، زمانہ کی خبر رکھتے ہیں
شانوں پہ جُداسب سے وہ سَر رکھتے ہیں

جینا اُنہیں آتا ہے جہاں میں، وہ کب
ہونٹوں پہ اگر اور مگر رکھتے ہیں

موسم سے الگ اپنا سفر رکھتے ہیں
پت جھڑ میں بھی وہ پھول، ثمر رکھتے ہیں

وہ ژرف نگاہی کے ہیں پالے، وہ تو
وِجدان سجانے کا ہُنر رکھتے ہیں

اندیشہ، نہ سانسوں میں مفر رکھتے ہیں
دھوکا، نہ کوئی دل میں مکر رکھتے ہیں

حالات کو تجتے ہوئے ہر اک لمحہ
ماحول کو وہ زیر، زَبر رکھتے ہیں

الفاظ، معانی میں اَثر رکھتے ہیں
ایہام کو پابند وہ کر رکھتے ہیں

ابلاغ میں رکھتے نہیں دیوار کا رُخ
اظہار میں افکار کا دَر رکھتے ہیں

ساگر میں جنوں خیز بھنور رکھتے ہیں
صحرا میں بھی مہکا ہوا گھر رکھتے ہیں

رستہ سے بھٹکنے نہیں دیتے خود کو
منزل پہ ہر اک آن نظر رکھتے ہیں

❍

تفتہ زاری
(کروکھیشتر، بھارت)

حیات و موت کے یہ سلسلے اب تک نہیں سمجھے
ہم اپنی زندگی کے آنکڑے اب تک نہیں سمجھے

ہم اوروں کے مسائل کے تو حل تیّار رکھتے ہیں
ہمارے اپنے کیا ہیں مسئلے، اب تک نہیں سمجھے

بدل ڈالی ہے ''کُٹّی'' پیار میں ننھے فرشتوں نے
مگر بابا کا مطلب ہم بڑے اب تک نہیں سمجھے

بشر پر تبصرہ کچھ یوں کیا اہلِ بصیرت نے
ہم اس پاجی کے جملہ پینترے کے اب تک نہیں سمجھے

جہاں میں زیست کا مقصد اسے ہنس کر بتانا ہے
ہوا کیا؟ ہم جو اس کے فلسفے اب تک نہیں سمجھے

غزل کے قافیوں کو تو بخوبی ہم نے سمجھا ہے
مگر ہستی کے کیا ہیں قافیے، اب تک نہیں سمجھے

کبھی سچے، کبھی جھوٹے، کبھی میٹھے، کبھی کڑوے
ہم اپنے ہی بہت سے ذائقے اب تک نہیں سمجھے

کسی کی زندگی کے تجربے وہ خاک سمجھیں گے
جو اپنی زندگی کے تجربے اب تک نہیں سمجھے

تعجب ہے کہ تفتہ! خالقِ ارض و سما نے بھی
بشر کے نفسیاتی زاویے اب تک نہیں سمجھے

❍

غالب عرفان

(کراچی)

جہاں سر بسجدہ ہوئی جبیں ترا در نہیں تھا کچھ اور تھا
مرے جسم سے جو قلم ہوا مرا سر نہیں تھا کچھ اور تھا

دمِ آخریں مری عمر کے سبھی روز وشب نظر آئے تو
وہ طویل وطول مسافتوں کا سفر نہیں تھا کچھ اور تھا

مری فکر نے ترے عکس کو کیا منتقل جو فضاؤں میں
تو مرے وجود پہ جو چھا گیا وہ اثر نہیں تھا کچھ اور تھا

بلا جدّ وجہد اُسے جو ملا وہ خیال سے بھی تھا ماورا
مجھے جو ملا مری کاوشوں کا ثمر نہیں تھا کچھ اور تھا

شبِ خونچکاں کے نصاب میں جو جگا رہا تھا ساعتیں
نئے آفتاب کی صبح کا وہ گجر نہیں تھا کچھ اور تھا

مری انگلیاں جسے لکھ گئیں مرے عشق کی وہ کتاب تھی
ترا حُسن جو مجھے دے گیا وہ ہنر نہیں تھا کچھ اور تھا

○

مہندر پرتاپ چاند

(انبالہ شہر، بھارت)

کس کی ہیں سسکیاں؟ یہ کوئی دلِ فگار ہے!
دامن ہے چاک چاک ، قبا تار تار ہے

ناکام اس لیے ہوں ، جھکایا نہ سر کبھی
میرے لیے یہ بات مگر باوقار ہے

کچھ اور بات ہے، ہوائیں بھی سہمی ہوئی سی ہیں
موسم ہے سوگوار، فضا اشک بار ہے

رکھتا ہے میرے حال پر ہر لحظہ کیوں نظر؟
شاید یہ میرا خاص کوئی غم گسار ہے!

جلتے ہوئے گھروں سے یہ اُٹھتا ہوا دھواں
کس منہ سے اب کہیں کہ ہوا سازگار ہے؟

پھر ناگہاں کسی کے کرم یاد آ گئے
پھر آج دِل کسی کے لیے بے قرار ہے!

آنکھوں میں آس کے ہے ستاروں کا اک ہجوم
کیا نام دوں اِسے ؟ یہ شبِ انتظار ہے

قادر اگر ہے کوئی تو اِک اُس کی ذاتِ پاک
اللہ کی رضا پہ کِسے اختیار ہے؟

وہ جو بھی دے ، سزا جزا، سب مجھے قبول
اے چاندؔ! اسی میں آبروئے طبعِ یار ہے

○

نقشبند قمر نقوی بخاری

(ٹلسا،امریکہ)

روشنی ایک ہے تقسیم نہیں ہو سکتی
یہ حقیقت ہے جو ترمیم نہیں ہو سکتی

تم کو دیکھا ہی نہیں اس نے جو یہ کہتا ہے
خوشبوؤں کی کوئی تجسیم نہیں ہو سکتی

یوں ہی انسان کو رہنا ہے اسیر شب وروز
اور پیدا نئی تقویم نہیں ہو سکتی

بندگی ایک خدا کی ہی بہت مشکل ہے
بے شماروں کی تو تعظیم نہیں ہو سکتی

اس زمانے میں کسی کی کوئی سنتا ہی نہیں
بات کہتے رہو، تسلیم نہیں ہو سکتی

اتفاق اس پہ ہے، بکھرا ہوا شیرازہ ہے
اس لیے اب کوئی تنظیم نہیں ہو سکتی

مل کے بیٹھیں تو قمر نقوی کوئی حل نکلے
ورنہ افہام کی تفہیم نہیں ہو سکتی

○

حسن عسکری کاظمی

(لاہور)

ہم تک یہ خبر بادِ صبا لائی ہے اب کے
چہرے پہ ترے زلفِ سیہ چھائی ہے اب کے

پانی میں ترا عکس نہ دیکھا تو عجب ہے
تصویر تیری دل میں اتر آئی ہے اب کے

اک پھول تھا اوڑھے ہوئے یوں رنگِ حیا کو
بھولی ہوئی صورت تری یاد آئی ہے اب کے

دیکھیں گے زمیں سے نہ کبھی چاند فلک پر
ہم نے ترے چہرے کی قسم کھائی ہے اب کے

خورشید جہاں تاب سے روشن ہے زمانہ
ہر سمت مگر غم کی گھٹا چھائی ہے اب کے

ہم کردہ گناہوں پہ پشیمان ہیں لیکن
ناکردہ گناہوں کی سزا پائی ہے اب کے

نکلا نہیں میں گھر سے حسنؔ صحن چمن میں
خوشبو ہی مری سمت چلی آئی ہے اب کے

○

قیصر نجفی
(کراچی)

نہیں یہ رُت تو اے صیّاد پر کُترنے کی
بہار رُت ہے فضاؤں میں رقص کرنے کی

عجیب کرب میں تھا لا دوا مریض کہ لوگ
دعائیں کرنے لگے اس کے جلد مرنے کی

ہوا تھا ختم تماشا اسی تگ و دو میں
ملے کہیں پہ جگہ ہم کو پاؤں دھرنے کی

مرے ہی سائے نے جب میرا راستہ روکا
ہر ایک سائے سے وہ ابتدا تھی ڈرنے کی

عجب نہیں ہے کہ ہم قتل بھی ہوں اور نوبت
نہ آئے کوچۂ قاتل سے بھی گزرنے کی

ہمیں اُتار دیا نا خدا نے پانی میں
پھر اس کو فکر تھی اس پار ناؤ بھرنے کی

○

اشرف جاوید
(لاہور)

جل رہا ہے قطار سے باہر
اک دیا ہے شمار سے باہر

شہر کے گرد کھینچ کر دیوار
اب کھڑا ہے حصار سے باہر

اُس کے ہونٹوں کی آنچ تو دیکھو!
شعلہ لپکے شرار سے باہر

اُسی ترتیب میں نظر آیا
یار، نقش و نگار سے باہر

ایک رستہ نکلتا جاتا ہے
گاؤں کی رہگزار سے باہر

وہ چلا آیا رقص کرتا ہوا
خلعتِ تاج دار سے باہر

درد مُنہ زور ہوتا جاتا ہے
ضبط بھی اختیار سے باہر

سارے موسم تو انتظار میں ہیں!
خاک ہے انتظار سے باہر

موت پھرتی ہے در بہ در، ہو کر
درِ پروردگار سے باہر

○

ڈاکٹر پنہاںؔ

(امریکہ)

اب تری یاد بہ اندازِ دگر آئی ہے
حرکتِ قلب شرارت پہ اتر آئی ہے

سرِ آئینہ وہی جو پسِ آئینہ تھا
خواب دیکھا تو حقیقت بھی نظر آئی ہے

میرے اطراف تو ہی تو ہے فقط تو ہی تو
زندگی عرصۂ محشر سے گزر آئی ہے

لے کے پیغام محبت کا اڑی تھی لیکن
امن کی فاختہ پھر سوختہ پر آئی ہے

بھول کر خود کو تجھے یاد نہ کر پائیں گے
آگہی لے کے نیا عزمِ سفر آئی ہے

منتظر ماں نظر آتی نہیں دروازے پر
دیکھ بیٹی تری پردیس سے گھر آئی ہے

ایسا لگتا تو نہیں ہے کہ تھی زندہ اب تک
مرگئی شاعرہ پنہاںؔ یہ خبر آئی ہے

○

ڈاکٹر نلنی وِبھا نازلیؔ

(ہمیر پور، بھارت)

رسمِ الفت کو نبھانے کبھی آیا ہی نہیں!
گلشنِ دل پہ گھٹا بن کے وہ چھایا ہی نہیں!

راہِ گُم کردہ مسافر ہوں میں اِک مدّت سے
راستہ گھر کا نظر میں ابھی آیا ہی نہیں

مرحلے جتنے ملے راہ میں ، دشوار ملے
موڑ رنگین سا سفر میں کوئی آیا ہی نہیں

بڑھ گئی پیاس، جلے پاؤں، سفر دھوپ کا تھا
زیست کے ساز پہ ملہار بجایا ہی نہیں

تھا نصیب اُن کا بھٹکنا کہ جنہیں ماں نے کبھی
چھاؤں میں پیار کے آنچل کی، سُلایا ہی نہیں

حق فراموش تھا وہ میں نے یقین جس پہ کیا
جو مِرا حق تھا، کبھی اُس نے دلایا ہی نہیں

نازلیؔ! چاروں طرف یورشِ بادِ صَرصَر
ریگ زاروں کے سفر میں کوئی سایا ہی نہیں!

○

دامودرداس!

سلمان عبدالصمد

(دہلی، بھارت)

''ناہی ، ناہی___ ایسن گھٹیا کام ہمرے بس کا ناہی ___ ''خودکلامی کے بعددامودراپنے ساتھیوں سے ہم کلام ہوا۔

''اے بیٹا،رام اوتارتم سب جاؤت ہوجاؤ،ہم نہ جائب''۔

''کاہے کاکا''۔

''بس دل نہیں مانت، اچھا بیٹا جاتو سب___ بھگوان تم کا بھلا کری''۔

دامودرگھر لوٹ آیا۔

دامودرداس ایک رات ماضی اور حال کے کئی خیالوں میں الجھا تھا۔کسی خیال سے کپکپی طاری ہوجاتی تو کوئی واقعہ سرشار کرجاتا۔توکسی ایک ہی واقعہ سے دونوں طرح کے تاثرات ابھرتے۔

آسمان سے چھن چھن کرآنے والی دودھیا روشنی سے وہ یک دم بے خبر تھا۔

اسی دوران اس نے اُس چارپائی کے ایک پایے کوکئی مرتبہ درست کیا،جس پر وہ لیٹا کئی خیالوں میں الجھا تھا،کیوں کہ چارپائی نہ صرف ادبان سے آزاد تھی بلکہ چاروں طرف سے چاروں پایوں کو جوڑنے والی لکڑیوں_پاسیوں_سے ایک پایابدن کی ذرا تیز حرکت سے کبھی کبھی آزاد بھی ہوجاتا تھا۔

رات کئی پہر گزر جانے کے بعد بھی دامودر کو نیند نہیں آئی اور یکا یک ماضی کے اس واقعہ میں اس کا ذہن الجھ کررہ گیا۔

''اِہے اِہے ،آگئیل ہمری دھڑکن''۔ امی نے سب کام چھوڑ چھاڑ نیلاکوسینے سے چمٹالیا تھا۔

''کا ہے اِس میں اما''۔چولہے پر چڑھا کنستر پرنظریں جمائے اس نے سوال کیا تھا۔

''اِی میں دھان ہے دھان___ بیٹؤ''

''دھان___ دھان کاہوت ہے''۔

''دھان سے چاول بنت ہےاور چاول سے بھات!''۔

''چھی،توبہ!ایسے برتن میں___ چھ!''

دامورد کے ذہن میں وہ برتن بھی ناچ گیا،جس میں چولہے پر دھان ابل رہاتھا، وہ سرسوتیل کا کنستر تھا، جوجگہ جگہ سے پچکا بھی تھا،اوبڑکھابڑ واضح تھے جیسے چہروں پر چیچک کے داغ۔زنگ نے مزیداس کے گہرے کالے رنگ کوڈراؤنی شکل دے دی تھی، جواس کی کہنگی پرشاہد تھی اوردامودرداس کی غربت پربھی۔

چھوٹے سےاس واقعہ سے دامودر کے کئی خیالات جڑے تھے۔غم اورخوشی کے بھی۔

کیوں کہ ایک طرف جہاں یہ واقعہ سیلاب کے قہر سے مسلسل نقل مکانی کی یاددلاتا تھا،جس سے روح کانپ جاتی۔وہیں برسوں بعدشاندار دھان کی فصل سےخوشی کا احساس بھی اورگذشتہ چار پانچ برسوں میں ہونے والی فصلوں میں سب سے اچھی فصل بھی تو یہی تھی نا۔

یہ مکالمہ بھی تواسی وقت ہی ہوا جب دامودراپنی بیٹی نیلا کوسیلاب کا قہرٹل جانے کے بعدنانیہال سے واپس لائے تھے۔

ایک بارپھر جب دامودر چارپائی کے چوتھے پائے کودرست کرنے کے لیے کھڑا ہوا تو ہوا کافی تیز ہوچکی تھی ۔اس نے آسمان کی طرف نظر اٹھا کر دیکھا۔دودھیا روشنی برسانے والا آسمان رنگ بدل رہا تھااور باہر چندلوگوں کے جمع ہونے کی آہٹ کا بھی احساس ہوا۔

''چاہے جوکچھ انومان ہوسب کا،آئے تو مینگھ زور کی آئی، دیکھت نی کا،آسمان کا رنگ با''۔ماہرموسمیات کی طرح دامودر نے کہا۔

''ہاں!ہمرا کا بھی آج ایساہی لاگت! چاچا''

''اونہہ ہوں___ اونہہ ہوں___ ہم کا تو ذرا بھی نہیں لاگت''۔

چشمہ ذرااوپراٹھا کرآسمان کوغور سے دیکھنے کے بعد لکھن دادا نے کہا۔

تجربہ کارلکھن دادا کے اندازے کے بعد سب مایوس ہوکرمنتشر ہوگئے۔دامودر کے بدن سے مانو جیسےامیدیں نچوڑدی گئیں۔

گھر لوٹتے ہوئے اس نے بلڈنگ پر بھی لوگوں کوآسمان کی طرف دیکھتے،دیکھا۔

بلڈنگ میں رہنے والوں کے دمکل پمپنگ سیٹ سے ہی کھیتوں کی ترائی ہوتی تھی۔علاقے کے مختلف مقامات پران کے ہی دمکل سینٹرس تھے۔

لکھن دادا کے ___ اونہہ ہوں___ اونہہ ہوں___ سے جیسے دامودر کا دماغ دھواں دھواں ہوگیا۔فصل کی بربادی کے منظر سے اس کا دل دہل اٹھا۔گھر والوں کے فاقے پر فاقے کی مار سے بدن میں جھرجھری بھی طاری ہوگئی۔وہ کربھی کیاسکتا تھا،بس میں تھا ہی کیا___

''ہیوسرکار!بس ایک رکرپا کردِیَن نا''۔تمام انجام سے بے خبر وہ بلڈنگ پر پہنچ گیا۔

''کرپا___ اَبے رکرپا شروع کیا تو بونٹ لانے کے لائق بھی نہیں رہیں گے''۔

دامودر کو وہ سب اس طرح دیکھنے لگے، جیسے شیش محل میں کوئی غلیظ جانور آدھمکا ہو۔

نظروں کے تیر سے اسے کلیجہ حلق میں اٹکتا محسوس ہوا۔

ہڑ بڑا کر دامودر اپنی چار پائی ___ جسے تین پائی ہی کہنا بہتر ہے ___ پر لوٹ آیا اور آسمان پر نظریں جمائے، کبھی ماضی میں جھانکتا تو کبھی حال میں۔

امید کی ساری لڑیاں ٹوٹ چکی تھیں۔

اسی درمیان اسے سیلاب کے قہر والی وہ رات بھی یاد آئی، جس میں گاؤں گاؤں آن کی آن میں خالی ہو گیا۔ حالانکہ اس سال دامودر پر امید تھا کہ دھان کی فصل ضرور ہوگی، کیوں کہ سیلاب دیر سے آیا تھا، لیکن یکا یک زمین سے پانی ابلنے لگا تو آسمان سے بھی، جیسے ان میں سوراخ ہو گیا ہو۔ راتوں رات سب نے باندھ پر پناہ لی۔

بے تحاشا پانی سے نکل کر باندھ پر آنے کے بعد خوف ختم بھی نہیں ہوا تھا اور ہو ہا ہا، اِدھر کمہر کا شور بھی تھا نہیں تھا کہ یہ افواہ! باندھ سے پانی رس رہا ہے، صبح تک ٹوٹ بھی سکتی ہے۔ ہر ایک کے بدن میں کپکپی طاری ہوگئی، ایک دوسرے کو خاموش اس طرح دیکھنے لگے، جیسے آخری بار دیکھ رہے ہوں۔ انھیں ایسا بھی لگا کہ باندھ ٹوٹتے ہی وہ سب کے سب پانی میں جا سماگیے اور پانی کے تھپیڑوں کے ساتھ بہے چلے جا رہے ہوں۔ بالکل اسی طرح جیسے کچھ دن قبل انھوں نے اسکرین پر دیکھا تھا۔

اسکرین پر دکھائی جانے والی تباہی کی تصویروں سے دامودر کے رونگٹے کھڑے ہو گیے تھے، بھویں تن گئیں تھی، چار پائی پر پڑے اس واقعہ کی یاد سے ایک بار پھر اس کی حالت کچھ ایسی ہی ہوگئی۔ اس کے ذہن کے اسکرین پر وہ ویڈیو چلتی جا رہی تھی۔

دامودر کے گاؤں والوں کو ایک ویڈیو دکھائی گئی تھی کہ کسی ملک میں اس طرح سیلاب آتا۔ شہر اور نہ جانے کتنی بستیاں سیلاب کے قہر کی زد میں آنے سے ویران ہو گیے، مگر کچھ لوگوں کی حکمت عملی سے سیلاب پر قابو پا لیا گیا اور اب وہاں کے باشندے ہنسی خوشی زندگی بسر کر رہے ہیں۔ سیلاب کا قہر رک جانے کے بعد کی خوشحال تصویروں سے گاؤں کے لوگوں میں خوشیاں بھر دی گئیں۔ پھر یہ یقین دہانی کرائی گئی کہ ہم سیلاب کے روک تھام کے لیے سرگرم ہیں، جلد ہی سیلاب پر قابو پالیں گے، یہ علاقہ بھی خوشحالی اور خوشیوں سے ہمکنار ہوگا اور برق رفتاری سے بجلی آ جائے گی۔

بجلی کی آمد کے خیال سے بڑوں سے زیادہ بچوں کے چہرے کھل اٹھے تھے۔

معصوم آنکھوں میں ایک بار گاؤں پھر شادی کی رات کی طرح ہی جگمگا اٹھا تھا۔

رنگ برنگے قمقموں کی روشنی نظروں میں رقص کرنے لگی تھی۔

دامودر نے یادِ ماضی کی بساط لپیٹ کر چار پائی دیوار کے سہارے کھڑی کر دی اور ضروریات سے فراغت کے لیے نکل پڑا۔

سچ مچ جس طرح دامودر کے گاؤں والوں کو اسکرین پر سیلاب کو قابو پاتے دکھایا گیا، اسی طرح ماہرین نے یہاں بھی سیلاب پر قابو پا لیا۔ لہٰذا ادھر کئی برس سیلاب آیا پر قہر بن کر نہیں، یعنی آتا اور ہر برس یہاں کی کھیتی زمینوں کو خوب خوب سیراب کر جاتا۔ اس طرح دونوں فصلیں ہونے لگیں۔ گیہوں کی فصل کے زمانے میں بھی پٹاؤنی کے تعلق سے کوئی پریشانی نہیں ہوتی تھی، کیوں کہ دمکل پمپنگ سیٹ سے ترائی بآسانی ہو جاتی تھی۔ اس نئی سہولیت کے بعد کسانوں کے لیے سیلاب کا آنا اور نہ آنا برابر ہو گیا، اسی طرح موسمی بارش کا بھی انتظار نہیں رہتا تھا۔

تاہم جوں جوں وقت گزرتا گیا، سیلاب کے پانی پر گرفت مضبوط ہوئی اور دونوں فصل کی ترائی کے لیے پمپنگ سیٹ ضروری، ایسے میں اگر بارش بھی رک جائے تو.......!

اس صورتحال میں دامودر کو پے در پے کئی مشکلات سے پنجہ آزمائی کرنا پڑی۔ کیسے وہ دو دو فصلوں یعنی دھان اور گیہوں کی فصل کو پانی دے پاتا۔ اس لیے اس کی کوئی فصل نہیں ہو پائی، اس کی کھیتی کا پورا کا پورا انحصار فقط بارش پر ہی تھا۔ اس لیے اس کی نگاہ اب آسمان پر ہی ٹکی رہتی۔ گاؤں کے تمام کسانوں کی بھی حالت پتلی ہوگئی۔ کب تک وہ پمپنگ سیٹ سے ترائی کی تاب لا سکتے۔ اس لیے وہ سب کے سب دامودر کی صف میں ہی آ کھڑے ہوئے۔

برسہا برس دھان اور گیہوں کی فصل نہ ہونے کی وجہ سے دامودر کی نظروں میں دھان اور گیہوں کی بالیاں دھندلا سی گئیں۔ بالیاں ہی کیا کبھی کبھی تو بھوک کے مارے ہر چیز دھندلائی سی لگتیں اور زمین بھی، اس لیے دامودر کے قدم جم بھی نہیں پاتے تھے۔

دامودر کو رات ٹوٹی چار پائی پر بے سدھ پڑے رہنا پڑتا، کہیں پایے کے الگ ہونے سے چار پائی معنی نہ کھو بیٹھے۔ دن میں دس بار دھان کی کھیت کا چکر، کہیں کھیت پر کھڑا پراتھنا کرنے سے بارش کی دیوی مان جائے۔

دامودر اسکرین والی تصویروں پر یکا یک سوچنے لگا کہ ''سیلابی قہر کے رک جانے کے بعد تو وہاں خوشحالی آ گئی، مگر اب ہمارا علاقہ بھی تو سیلابی قہر سے آزاد ہے۔ جب سیلاب آتا تھا تو دھان کی فصل نہ سہی، گیہوں کی فصل تو ہو ہی جاتی تھی، مگر اب سیلاب بھی نہیں آتا ہے، دھان تو دھان دوسری فصل بھی نہیں ہوتی۔ یہ تو حقیقت ہے کہ سیلاب کی روک تھام کے بعد مسلسل برسوں کسانوں اور ان کے بچوں کی خوشیاں دوبالا ہوئی تھیں۔ کسان دو فصل کی خوشی میں جھومے تھے۔ بچے بجلی کی آمد کے احساس سے، مگر اب وہ سب خوشیاں چلی کہاں گئیں''۔

اسی کشمکش میں دن گزر رہے تھے تو ایک دن صبح ٹوٹی چار پائی کے پاس آ کر نیلا کی امی نے کہا:

باقی صفحہ ۸۵ پر ملاحظہ کیجیے

بارش کے بعد

ارجمند شاہین
(کراچی)

طوفان بادوباراں اور گرج چمک نے نائمہ کے پیروں میں جیسے زنجیر ڈالدی تھی۔کوئی اور موقع ہوتا تو اس موسم میں گھر سے باہر نکلنے کی وہ کبھی جرأت نا کرتی مگر معاملہ تھا منو کو اسکول سے لانے کا۔اسکا شوہر فضل یوں بھی دفتر میں مصروف ہونے کی وجہ سے یہ کام نہیں کرتا تھا اور آج تو وہ شہر ہی میں موجود نہیں تھا۔نائمہ نے اپنی دوست شہلا کو بھی فون کیا تھا کہ اسکول سے واپسی پر وہی منو کو بھی لیتی آئے لیکن خراب موسم کی وجہ سے اسنے اپنے بیٹے کو اسکول بھیجا ہی نہیں تھا۔سمیر کی ممی شائلہ بھی فون پر نہیں مل رہی تھی۔ پھر اسے وجیہہ کا خیال آیا۔وجیہہ نے بتایا کہ اسکی گاڑی سروس کے لئے گیراج گئی ہوئی ہے اسی لئے اسنے سلمان کو اسکول بس میں آنے کی تاکید کر دی تھی۔۔ ناچار نائمہ نے سوچا کیوں نہ وہ بھی پرنسپل سے درخواست کر کے منو کو اسکول بس میں آنے کو کہہ دے مگر پرنسپل کا فون اتنا مصروف تھا کہ کال مل کر ہی نا دی۔۔۔۔!! کبھی کبھی حالات توقع کے کس قدر خلاف ہو جاتے ہیں۔۔۔۔۔!!!! اسکول کے لئے گھر سے نکلنے میں مزید تاخیر کی گنجائش نہیں رہی تھی۔

آخری بار نائمہ نے موسم کا جائزہ لینے کے لئے کھڑکی سے باہر نظر دوڑائی بارش تھمنے کا نام نہیں لے رہی تھی۔دن دیہاڑے کالی گھٹاؤں نے تمام شہر پر جیسے سیاہ رنگ کا شامیانہ تان دیا تھا۔خود پر بیتے ہوئے خوف نے اچانک نائمہ کو اپنی گرفت میں لے لیا۔۔۔۔ایسی ہی طوفانی رات میں تین سالہ نائمہ کو آیا کی نگرانی میں سوتا ہوا چھوڑ کر اسکے ممی، ڈیڈی آفیشل ڈنر پر چلے گئے تھے۔بادلوں کی کڑک اور بجلی کی چمک سے دہل کر رات کے کسی پہر نائمہ کی آنکھ کھل گئی تو کمرے میں خود کو تنہا پا کر مارے خوف کے اس نے زور زور سے رونا اور چلاّنا شروع کر دیا تھا۔جب دیر تک کوئی اسکی مدد کو نا پہنچا تو روتے روتے اسکی گگھی بندھ گئی تھی۔اگر اسکے ممی، ڈیڈی وقت پر نا آجاتے تو خوف سے وہ مر ہی گئی ہوتی۔۔۔۔۔پتہ نہیں آیا اسے چھوڑ کر کہاں چلی گئی تھی۔۔۔۔! ممی، ڈیڈی نے آیا کے ساتھ خانساماں کریم داد کو بھی کیوں نوکری سے نکال دیا تھا۔تب وہ یہ بات نہیں سمجھ سکی تھی۔۔۔۔ممی، ڈیڈی نے آیا اور کریم داد کو تو نوکری سے نکال دیا تھا مگر اس رات کا بیٹھا ہوا ڈر وہ کبھی نائمہ کے دل سے نہ نکال سکے۔موسم سے لطف اندوز ہونے کی بجائے وہ کسی کمرے میں گھس کر دروازے، کھڑکیاں بند کر کے بیٹھ جایا کرتی تھی۔۔۔۔اس وقت بھی یہی ڈر اسکے آڑے آرہا تھا اور وہ گھر سے باہر نہ نکلنے کے بہانے تراش رہی تھی۔

چھٹّی کا وقت ہونے والا تھا اور وہ ابھی تک شش وپنج میں مبتلا تھی۔یہ خیال کہ منو اسکول میں اکیلا رہ گیا تو گھبرا جائے گا اسکے دماغ میں ٹھک ٹھک کرنے لگا اور وہ بے چین ہو اٹھی۔اسنے اللہ کا نام لیکر کار کی چابی اٹھائی اور گھر سے باہر نکل آئی۔کار کا دروازہ کھولا ہی تھا کہ بادل زور سے گرجا۔نائمہ پوری جان سے لرز گئی اور اچھل کر ڈرائیونگ سیٹ پر یوں جا بیٹھی جیسے کسی نے باہر سے اسے کار کے اندر دھکیل دیا ہو۔۔۔نائمہ نے کار سٹارٹ کی اور دوسرے لمحے اسکی کار سڑک پر اس طرح دوڑ رہی تھی جس طرح بارش کا پانی سڑک پر تیزی سے بہہ رہا تھا وہ لمحے کی چوتھائی میں اسکول پہنچ جانا چاہتی تھی جہاں منو اکیلا بیٹھا اسکا انتظار کر رہا تھا۔۔

نائمہ نے ٹریفک رش سے بچنے کے لئے جو راستہ اختیار کیا تھا وہ نسبتاً سنسان اور طویل تھا۔دور تک سڑک خاموش پڑی تھی۔بارش اتنی تیز تھی جیسے بالٹیاں بھر بھر کے کوئی ونڈ اسکرین پر انڈیل رہا ہو۔تیز تیز وائپر چلنے کے باوجود کچھ سجھائی نہیں دے رہا تھا۔حدِ نگاہ تک پانی کا پردہ سا پڑا ہوا تھا۔اچانک نائمہ کی آنکھوں کے آگے اندھیرا چھا گیا اور دو بچوں کو روندتی ہوئی اسکی کار دور تک نکل گئی۔ہوش آیا تو ایک جھٹکے سے اسنے گاڑی روکی۔پتہ نہیں کس کے بچے تھے۔۔۔زندہ تھے یا مر گئے تھے۔۔۔۔!! نائمہ نے گاڑی کا دروازہ کھول کر اترنا چاہا مگر وہ بہت آگے نکل آئی تھی۔دور فاصلے پر بارش میں لپٹا لوگوں کا ہجوم نجانے کہاں سے نکل کر وہاں جمع ہو گیا تھا اسے دھواں دھواں سا نظر آرہا تھا۔اتنے بہت سارے لوگوں میں سے کوئی نا کوئی تو انھیں اسپتال پہنچا ہی دیگا۔لیکن اگر انھوں نے اسے وہاں دیکھ لیا تو اسکی تکہ بوٹی ایک کر دینگے اور پولیس کارروائی میں پھنس کر اسکا بہت سا وقت مزید ضائع ہو جائے گا اور ادھر منو اسکول میں اکیلا۔۔۔۔کسی غیبی ہاتھ نے اسے واپس گاڑی میں کھینچ لیا۔گاڑی جھٹکے سے اچھلی اور مزید تیز رفتاری سے سڑک پر بھاگنے لگی۔

نائمہ نے دور ہی سے دیکھ لیا تھا منو اپنے دونوں ہاتھوں کے پیالوں میں اپنے گال رکھے اسکول کی سیڑھیوں پر بیٹھا منتظر نظروں سے گیٹ کی طرف ہی دیکھ رہا تھا۔چوکیدار بابا کلاس رومز کے دروازے کھڑکیاں بند کرتا پھر رہا تھا۔نائمہ نے دوڑ کر منو کو اپنے وجود کے ساتھ چمٹا لیا نائمہ کا بدن یوں کانپ رہا تھا جیسے شدید زلزلے نے اسے آلیا ہو اور آنسو بارش کے پانی میں ملکر بارش ہو رہے تھے۔

گھر پہنچ کر نائمہ نے خود کو کمرے میں بند کر لیا۔اور صدمے اور پریشانی سے گھٹی گھٹی چیخیں اپنے تکیے میں دبانے کی کوشش کرنے لگی۔یہ اس سے کیا ہو گیا تھا۔۔۔۔! کاش وہ کچھ کر سکتی۔معاً وہ اٹھکر بیٹھ گئی۔وہ دعا تو کر سکتی تھی نا۔۔وہ نماز پڑھ کر اللہ تعالیٰ سے گڑگڑا کر انکی زندگی کی بھیک مانگے گی۔ایک ماں کے دل سے نکلی دعا کبھی رد نہیں ہو سکتی۔۔۔۔۔۔۔مما۔۔۔مما۔۔۔مما۔۔۔! لاؤنج سے منو کے بلک بلک کر رونے کی آواز نے اسے دہلا دیا۔اس طرح تو منو کبھی نہیں روتا۔۔۔الٰہی خیر۔۔۔وہ ننگے پاؤں لاؤنج کی طرف دوڑی۔مما! مما! کہتے ہوئے منو نائمہ کی ٹانگوں سے لپٹ گیا ہوا کی زد پر آئے کسی کمزور پتے کی طرح منو

کانپ رہا تھا۔

کیا ہوا میری جان!؟ منو بیٹا! اسطرح کیوں رو رہے ہو مرے لعل!؟ نائمہ نے جھک کر منو کو گلے سے لگالیا۔

وہ والہانہ منو کا منہ، گال اور آنکھیں چوم رہی تھی۔۔۔۔۔

مما! سلمان۔۔۔! منو نے سسکیوں کے درمیان ماں کی توجہ ٹی ڈی کی طرف دلائی۔

سلمان ؟۔۔۔ اسکا دل سینہ توڑ کر باہر نکل آیا۔ کیا ہوا سلمان کو۔۔؟ مارے حیرت کے نائمہ کی آنکھیں حلقوں سے باہر نکل پڑیں۔ جو بچہ روندا گیا تھا وہ سلمان تھا۔۔۔وجیہہ کا بیٹا۔۔۔، منو کا کلاس فیلو۔۔۔اور دوسرا سمیر۔۔۔۔۔شمائلہ کالختِ جگر۔۔۔اسکی اکلوتی اولاد!۔۔۔۔! جسکی جان بچانے کی ڈاکٹر سرتوڑ کوشش کر رہے تھے۔ جو گاڑی سے ٹکرا کر دور سڑک کے کنارے جا پڑا تھا۔ عینی شاہد کا کہنا تھا کہ گاڑی اتنی تیز رفتار تھی کہ وہ ڈرائیور کو نہیں پہچان سکا مگر یہ بات یقینی تھی کہ گاڑی کوئی عورت چلا رہی تھی۔۔۔نائمہ کی آنکھوں کے نیچے اندھیرا چھا گیا اور وہ نیم بیہوش سی منو کے پیروں میں ڈھیر ہوگئی۔۔۔

ٹرن ٹرن۔۔۔۔ٹرن۔۔۔ٹر۔۔۔۔۔جانے کب سے فون کی گھنٹی بج رہی تھی۔ کہاں ہو تم۔۔۔؟ کال کیوں نہیں سنتیں۔۔۔؟؟ کب سے کال ملا رہا ہوں۔۔۔فضل جھنجھلایا ہوا تھا۔ نائمہ کی آواز گلے ہی میں پھنس گئی وہ فضل کو بتانا چاہتی تھی اس سے کیا ظلم سرزد ہوگیا تھا مگر آنسو راستے میں حائل ہو گئے تھے۔ تم نے خبریں سنیں۔۔؟ مجھے تو معلوم ہی نہیں تھا سمیر صالح کا بیٹا ہے اور وہ بھی اکلوتا۔۔۔۔۔!! منتوں مرادوں کا۔۔۔۔۔!! ستم ظریفی یہ کہ اب انکے یہاں مزید اولاد نہیں ہوسکتی۔۔۔ذرا سی لاپرواہی نے دو گھر برباد کر کے رکھ دیئے ایسی سنگدل عورت کو قرار واقعی سزا ملنی چاہیئے جو بچوں کو سڑک پر کچل کر بھاگ نکلی۔۔۔۔۔!! فضل نے دانت کچکچائے۔ بتانا یہ تھا کہ خراب موسم کی وجہ سے سیٹ نہیں مل سکی۔ صبح میں اور صالح ساتھ پہنچ رہے ہیں تم تیار رہنا سمیر کی نمازِ جنازہ پر چلنا ہے۔ آہ تو سمیر بھی۔۔۔۔۔۔۔؟ اور سیل فون نائمہ کے ہاتھ سے چھوٹ کر فرش پر گر پڑا۔ حواس باختہ سی وہ بیٹھی کی بیٹھی رہ گئی۔ اسنے تو سوچا تھا وہ خود فضل کو سب بتا دے گی کہ وہ کس مشکل سے گزری ہے۔ صدمے نے اسے نڈھال کر کے رکھ دیا تھا۔ وہ فضل کے سینے میں منہ چھپا کر رونا چاہتی تھی مگر فضل تو خود اس عورت کو کوس رہا تھا۔۔۔۔

تمام رات دیوانی بارش بھوت پریت کی طرح کمرے کی کھڑکیوں سے سر ٹکراتی رہی۔ رات بھر نائمہ کی روح احساسِ جرم کے تازیانے کھاتی رہی۔۔۔آنیوالی صبح کا خوف گزرتی ہوئی شب سے فزوں تر ہوتا چلا گیا۔ جب اسے تلخ حقیقت کا کڑوا گھونٹ پینا ہوگا۔ کیسے وہ وجیہہ اور شمائلہ کا سامنا کر پائے گی۔ آخر وہ کب تک اپنا منہ چھپاتی پھریگی۔۔۔۔ساری رات نائمہ نے منو کو سینے سے لپٹائے آنکھوں ہی آنکھوں میں کاٹ دی۔

گھر لوٹ کر نائمہ کو یوں لگا جیسے وہ سمیر اور سلمان کو نہیں منو کو دفنا کر آئے ہوں۔۔۔۔دکھ کی اک ٹھٹھرتی ہوئی لہر سی اسے اپنی ریڑھ کی ہڈی میں دوڑتی ہوئی محسوس ہوئی اور وہ دیوانہ وار منو کے کمرے کی جانب دوڑی جہاں منو اپنی پسندیدہ کار کے ٹکڑے ٹکڑے کرنے میں کسی جنونی کی طرح مصروف تھا۔ یہ کیا کر رہے ہو بیٹا ؟ اتنی قیمتی گاڑی تم نے توڑ پھوڑ کر رکھ دی۔۔۔۔! یہ گاڑی سمیر اور سلمان کی جان سے تو قیمتی نہیں ہے نا مما! منو نے کار کو پوری شدت سے ٹھوکر ماری۔ او میرے خدا! رحم کر۔۔۔۔کہیں منو بھی تو میری طرح نفسیاتی الجھن کا شکار نہیں ہوتا جا رہا۔۔۔؟ نائمہ نے بے اختیار منو کو اپنی بانہوں میں بھر لیا مگر وہ اسکی آغوش سے پھسل کر کمرے سے باہر نکل گیا۔

گھر کا سناٹا صبر آزما ہو گیا تھا۔ سب کو چپ سی لگ گئی تھی۔ سب صدمے سے دوچار تھے کھانے کی میز پر کھانا جُوں کا تُوں لگا ہوا تھا۔ کسی نے لقمہ تک نہیں لیا تھا۔۔۔۔۔اگر وہ سفاک عورت مجھے مل جائے تو میں اسے سزا دلوانے میں ایک لمحہ ضائع نہیں کروں گا۔ فضل بے بسی سے اپنی انگلیاں چٹخانے لگا وہ نہایت طیش میں تھا۔

اتنے سنگدل نا بنو فضل! کون جانے وہ عورت بھی احساسِ جرم کا شکار ہو اور سوچتی ہو اس سے ایسا کیسے ہو گیا؟ نائمہ بے اختیار بول اٹھی۔

تبھی بھاگ گئی موقعِ واردات سے۔۔۔۔فضل کڑک کر بولا۔

کیا خبر اسکی کوئی مجبوری ہو۔۔۔۔اور کون جانے وہ کیا حالات ہوں جن سے مجبور ہو کر وہ گھر سے ایسے موسم میں باہر نکلی ہو۔۔۔۔اتنی تیز بارش میں کچھ بھی ہوسکتا تھا۔ حادثہ جانتے بوجھتے نہیں ہوتا۔ نائمہ جیسے پاتال سے بول رہی تھی۔ اک موہوم سی امید پر کہ شاید فضل کے دل میں اس عورت سے ہمدردی کی چھوٹی سی رمق پیدا ہو سکے جو نائمہ کے زخمی دل پر مرہم کا پھاہا ثابت ہو۔ نائمہ نے اپنی رائے دی۔ میں حیران ہوں تم اس عورت کے ساتھ ہمدردی کا سوچ بھی کیسے سکتی ہو! وہ تنک کر بولا۔ سنو نائمہ بیگم! وہ تو اجنبی عورت تھی اگر تم نے بھی یہ حرکت کی ہوتی تو میں زندگی بھر تمہیں معاف نہ کرتا۔ فضل نے میز پر زوردار مکا مارا اور جھٹکے سے اٹھ کر کمرے سے باہر نکل گیا۔ نائمہ زرد پڑ گئی۔ حالات سے فرار کی تمام راہیں اس پر بند ہوگئیں تھی۔ اسکی دنیا اندھیر ہوگئی تھی۔ اپنی صفائی میں کچھ کہنے کا جواز نہیں رہا تھا اور آنسو اسکے رخسار بھگونے لگے۔۔۔۔

سمیر اور سلمان کی بے وقت موت کے سوگ میں اسکول میں ایک دن کی چھٹی کر دی گئی تھی۔ وجیہہ کی حالت دیکھی نہیں جاتی تھی وہ بار بار یہی کہہ رہی تھی صبح ہی تو تم سے بات ہوئی تھی نائمہ! مجھے کیا پتہ تھا میں نے خود ہی اپنے بچے کو موت کے منہ میں دھکیل دیا۔۔۔کاش اسے بس میں نا بھیجا ہوتا۔۔۔! شہلا اور شمائلہ جھولی پھیلا پھیلا کر اس عورت کو کوس رہی تھیں جو بچوں کو کچل کر بھاگ نکلی تھی۔۔۔نائمہ کے منہ سے الفاظ نہیں نکل رہے تھے۔ رو رو کر وہ ہلکان ہوگئی تھی۔ نائمہ کی آنکھوں کے سامنے جنازے کی فلم سی چل گئی۔ صدمے نے نائمہ کو نڈھال کر دیا تھا۔ یہ خیال ہی جان لیوا تھا کہ اسکے ہاتھوں دو بچوں کی موت

واقع ہوگئی تھی۔۔۔اپنے پرایوں کی لعن تعن نے اسے ادھ موا کر کے رکھ دیا تھا۔ہرکوئی اس عورت کوکئی کئی بارسزا سناچکا تھااور وہ زندہ درگور ہوئی جارہی تھی۔

صبح ہوتے ہی طوفانِ بادو باراں بھی تھم گیا تھاجیسے یہ سب اس حادثے کوعمل میں لانے کیلئے تھا۔۔۔تڑتڑاتڑ کی آوازوں نے نائمہ کوچونکادیا۔وہ بگ ٹٹ اٹھکر بھاگی۔آوازمنو کے کمرے سے آرہی تھی۔منوکھلونا گن سے اپنی ٹوٹی ہوئی کار پرگولیاں برسا رہا تھا۔نائمہ نے گن اسکے ہاتھ سے چھین کر پرے پھینک دی۔یہ کیا کر رہے ہومنو! کیوں جیتے جی مار ڈالنا چاہتے ہو مجھے۔۔۔؟وہ چیخ اٹھی۔مما!وہ عورت گاڑی اتنی تیز کیوں چلارہی تھی۔۔۔؟اسے پتہ نہیں تھا کہ اسکی گاڑی کے نیچے آکر بچے مربھی سکتے ہیں۔۔۔۔!!منومیرے بچے!کیا پتہ وہ عورت گاڑی اسلئے تیز چلا رہی ہو کہ اسکا اپنا منو اسکول میں اکیلا بیٹھا اسکا انتظار کر رہا ہو۔۔۔اور وہ وہاں سےاس لئے بھی بھا گی ہو کہ اگر پولیس کارروائی میں پھنس گئی تواس کے منو پر کیا بیتے گی۔۔۔۔!!منومیری جان!اس عورت نے جان بوجھ کران بچوں کونہیں مارا۔ان کی موت ایسے ہی لکھی تھی۔ورنہ یہ بھی تو ہوسکتا تھا بچے بچ جاتے وہ عورت مرجاتی۔۔۔۔شایدخدا کویہ منظورنہیں تھامرے لعل!کہ اس عورت کا منوتمام عمراپنی ماں کا انتظار کرتا رہ جائے۔!شایداسی لئے اس عورت کوپرنسپل کا نمبر نہیں ملا۔ورنہ سمیراورسلمان کے ساتھ تیسرااسکا منوبھی ہوسکتا تھا۔۔۔!

گن کی آوازسنکرفضل بھی دوڑا چلا آیا تھا۔وہ تو دروازے ہی میں سن ہوکرکھڑا کا کھڑا رہ گیا تھا۔۔۔۔اللہ تعالی نے آخراسی عورت کوبچوں کی موت کا ذریعہ کیوں بنایا۔؟کسی اور کو کیوں نہیں۔۔۔؟؟فضل تم ہی بتاؤ وہ عورت کیا کرے۔۔۔۔۔؟؟؟

بقیہ: دامودرداس

''اَجی سنتے ہیں!یہ لیئن پیسے،رام اوتاراور لچھمنما سب دِلّی جاوٗت ہیں،آنہا بھی چل جائی نا''۔

دامودر چونک پڑا،چارپائی کا پایاالگ ہوگیا،وہ حیرت سے کھڑا ہوااٹھا۔

''آنہا تو ہی کہت رہین نا کہ جب بھارا کے پیسے آئی تو ہمّے چل جائب''۔

''پیسے پرآئن کہہر سے____یہ تو بتائی نا''۔

''اَجی سوال نہ ہی کارُوبیسی،بس سامان ٹھیک کر دیئن ہیں،ان کا ساتھ آج____''

''پیسے پرآئن کہہر سے____یہ تو بتائی نا پہلے''۔

دامودر نیلا کی امی کومشکوک نظروں سے گھورتا رہا۔اس کی آواز میں کرختگی بھی آگئی۔

''یہ پیسے!''بھرائی سی آواز میں اس نے کہا۔''اسکول سے نیلا کو ملارہن،کتابن کے لیے۔کل بازار جایت رہی کتابن خریدے۔ایکا ایکائی یہ خیال آئی،کتابن تو کبھی بھی آسکت،پمپنگ سیٹ سے کھیت کی پٹاوٗنی ہوجائی یا پھرآنہا اِکرا کا بھارادی دلی چل جائی،اب کھیت بھی پھرکبھواور،بس پچھمن کے سنگ____''۔

دامودر کی نگاہ پر سے شک کا پردہ ہٹا،پہلے اپنی ذہنیت پر پانی پانی ہوا،پھرغربت سے آبدیدہ۔

دامودر دہلی جانے والوں کے ساتھ چل نکلا تھا،مگر چند کلومیٹر کی مسافت کے بعداس کاارادہ بدل گیا۔

''ناہی،ناہی___ایسن گھٹیا کام ہمرے بس کا ناہی____''۔گھر لوٹ آیا،اس حال میں کہ اب انوکھے مسائل منہ پھاڑے کھڑے تھے۔

''گفتگو: دُوبدُو''

پروفیسر مظفرحنفی اپنے دَور کے میؔر ہیں نہ غالبؔ اورنہ پروفیسر صاحب کواقبالؔ کی ہمسری کا دعویٰ ہے،دعویٰ اگر ہے تواپنے دور کے انسان اوراُس پر گزرنے والی المناکی کے بیان کا جس کا اندازاچھوتا بھی ہے،انوکھا بھی اور نرالا بھی۔سوال پھراس قدر اچھوتے،انوکھے اور نرالے ادب پاروں کی ترویج وابلاغ کا ہمارے سامنے آکھڑا ہے۔اردوادب سے وابستہ انگلیوں پرشمار کردہ اہلِ قلم اس قدر علمی،ادبی اورشعری سرمائے کی امانت ودیانت کابار اٹھانے کے متحمل ہوسکیں گے؟

مذکورہ بالا چندلائنوں میں اردوزبان وادب کی نسبت جوسوالات اٹھائے گئے ہیں اُن کے مفصل اورپُرمغز جوابات سے آگاہی کے لیے''گفتگو: دُوبدُو'' حصہ اوّل کا مطالعہ لازمی ہے۔اس اہم کتاب میں ڈاکٹرمظفرحنفی سے کیے گئے گیارہ مکالمے مکمل تفصیل کے ساتھ شامل کیے گئے ہیں۔جن اصحاب کوڈاکٹرمظفر حنفی صاحب نے گفتگو کا شرف بخشا اُن کے اسمائے گرامی کچھ اس طرح ہیں۔جناب انل کمارشرما،ڈاکٹرنثاراحمدصدیقی،جناب احتشام الحسین،ڈاکٹرممتازعالم رضوی،جناب معین شاداب،ڈاکٹرراشدعزیز،ڈاکٹرمہتاب عالم،جناب ندیم صدیقی،پروفیسرمناظرعاشق ہرگانوی،ڈاکٹرکیول دھیراورگلزارجاوید۔

سیدصابراحمدنقوی

صفحات: دوسوچھپن مجلد،قیمت: دوسوپچاس روپے،دستیابی: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس،لال کنواں،دہلی،بھارت۔

''تصویر کے پار''

نجیب عمر
(کراچی)

میں اپنے ڈرائنگ روم کے جس صوفے پر بیٹھنے کا عادی ہوں۔ وہاں سے ٹی وی مناسب طریقے سے دیکھا جا سکتا ہے۔ سامنے دروازے پر بھی نظر رہتی ہے۔ کوئی آئے جائے میرے علم میں رہتا ہے۔ دائیں جانب دیوار پر ایک تصویر ٹنگی رہتی ہے۔ وہ بھی واضح طور پر دیکھی جا سکتی ہے۔

بوجوہ مجھے یہ جگہ پسند ہے۔ اگر کبھی مجبوراً جگہ بدلنی پڑے تو بے چین رہتا ہوں۔ ایسا لگتا ہے جیسے سب کچھ بدل گیا ہے۔ اگر مہمان اس جگہ پر قبضہ کر لیں تو میں بے تکلف ان سے سیٹ بدلنے کی درخواست کرتا ہوں۔ اپنی مخصوص جگہ پر بیٹھ کر ہی مجھے سکون ملتا۔

فارغ وقت میں میرے تین ہی مشغلے ہوتے، ٹی وی دیکھنا، مطالعہ کرنا یا پھر اس تصویر کو مسلسل دیکھتے رہنا۔ میرے نزدیک اس کمرے کی سب سے نمایاں چیز یہ تصویر ہے۔ جسے دیکھتے کبھی میرا جی نہیں بھرتا۔ ایک دوست نے۔۔۔تحفتاً دی تھی۔ قدردانی کے طور پر میں نے اسے ڈرائنگ روم میں سب سے نمایاں جگہ پر ٹانگ دیا۔

پہلی نظر میں مجھے تصویر نے زیادہ متاثر نہیں کیا۔ لیکن دھیرے دھیرے تصویر کی جزئیات اور مرکزی خیال کو پسند کرنے لگا۔ یہ ایک گاؤں کا منظر تھا۔ مٹی سے بنے گھر کے سامنے ایک خاتون ہاتھوں میں اناج پھٹکنے کا سوپ لیے کھڑی ہے۔ ایک طرف بیل اور گائے بندھے ہیں۔ اس کے ساتھ چارا کاٹنے کی مشین نصب ہے۔ سامنے کھلے حصے میں دو بچے بھی دیکھے جا سکتے ہیں ایک سایہ دار درخت نے صحن کے ایک حصے کو گھیر رکھا ہے۔ دور لہلہاتے کھیتوں کا منظر ہے جس کے سامنے ایک کڑیل جوان کاندھے پر گنے کا گٹھر اٹھائے گھر کی سمت چلا آ رہا ہے۔

ان تمام جزئیات کو میں نے ہزاروں مرتبہ غور سے دیکھا ہے۔ آئل پینٹ سے بنی یہ تصویر خوبصورت فطری رنگوں کا امتزاج لیے ہوئے ہے۔ برش کا ایک اسٹروک بھی اضافی نہیں لگتا۔ جیسے کسی بڑے فنکار نے اسے تخلیق کیا ہو۔

اس قسم کی تصویر شہر میں بہت پسند کی جاتی ہے چونکہ گاؤں کے مناظر سے عموماً شہر کے لوگ دور ہو چکے ہیں۔ جو چیز کمیاب ہو اس کی قدر تو لازماً ہوتی ہے۔

ایک بہت ہی فیشن ایبل ہوٹل کے ڈرائنگ ہال کے ایک کونے میں بیل گاڑی کا ایک پہیہ دیکھ کر میں حیران رہ گیا۔ جب منیجر سے اس کی بابت دریافت کیا تو اس نے کہا ہم ماضی سے رشتے کو برقرار رکھنا چاہتے ہیں۔ میں نے تعجب سے کہا یہ آپ کے لیے ماضی ہو سکتا ہے۔ ہمارے گاؤں میں آج بھی اس پہیے کی گاڑی مال برداری اور سواری کے لیے استعمال کی جاتی ہے۔ نہ جانے میری بات اس کے سمجھ میں آئی یا نہیں البتہ وہ مسکرا کر چل دیا۔

اب تصویر سے متعلق میری کیفیت میں کچھ تبدیلی آ رہی ہے۔ میں جب کمرے میں تنہا ہوتا ہوں تو تصویر میں موجود مٹیار مجھ سے بات کرنا چاہتی ہے۔ اس انوکھی سوچ کے فسوں میں میں ایسا گرفتار ہوں کہ میری خواہش ہوتی ہے کہ جب میں تصویر کی جانب مبذول ہو جاؤں تو کمرے میں کوئی اور نہ ہو۔ اس دوران میں تنہائی مجھے ایک نئے جذبے سے سرشار کرتی ہے۔

تصویر کی جانب میری غیر معمولی توجہ کو بیگم نے محسوس کیا اور ایک روز برملا کہہ دیا کہ آپ اس تصویر کو اتنے غور سے کیوں دیکھتے ہیں؟ آخر تصویر ہی تو ہے۔ ایک فنکار کا خیال جسے اس نے مرتسم کر دیا ہے۔ اس سے زیادہ تو مجھے اس میں کچھ اور نظر نہیں آتا۔

مجھے یقین تھا کہ بیگم مجھ سے کچھ اتفاق نہیں کریں گی لہٰذا میں نے اپنے جذبات ان سے چھپا لیے اور اتنا کہنے پر اکتفا کیا، ایک اچھی تصویر ہے۔ اسے دیکھتے ہوئے مجھے یکسوئی حاصل ہوتی ہے۔ میں مختلف معاملات پر غور و فکر کر لیتا ہوں اور بس۔

بیگم نے مجھے کچھ مشکوک نگاہوں سے دیکھتے ہوئے پوچھا ''یہ تصویر آپ کی زندگی میں کچھ زیادہ دخیل نہیں ہو گئی؟ آپ کی ساری توجہ اس تصویر پر رہتی ہے۔ حتیٰ کہ آپ بچوں کو بھی وقت نہیں دیتے۔ اگر آپ کا یہی حال رہا تو میں یہ تصویر یہاں سے ہٹا دوں گی''

میں نے فوراً کہا بیگم یہ غضب نہ کرنا۔ یہ تصویر اب ہمارے ڈرائنگ روم کا لازمی حصہ بن چکی ہے۔ اس کے بغیر کمرہ پھیکا پھیکا سا ہو جائے گا اور اس کی رونق جاتی رہے گی۔

بیگم نے کہا یہ صرف اسی صورت میں ممکن ہے کہ آپ تصویر کی بجائے زندہ لوگوں میں جو اس گھر کا حصہ ہیں دلچسپی لینا شروع کریں۔

میں بیگم کی تنبیہہ سے لرز گیا اور اسے یقین دلاتا رہا کہ اب وہی کچھ ہوگا جیسا وہ چاہتی ہے۔ مجھے خوف تھا کہ کہیں وہ تصویر ضائع نہ کر دے۔ اب میں نے اس کا یہ حل نکالا کہ بیوی بچوں کے سامنے تصویرہ سے کنارہ کش ہو جاتا ہوں البتہ تنہائی میں اسی انہماک سے تصویر دیکھتا رہتا۔

ایک روز میں گھر میں تنہا تھا۔ بچے سب ماں کے ساتھ نانی کے گھر گئے ہوئے تھے اور مجھے رات کو انہیں جا کر لانا تھا۔ اس طرح سارے دن کی تنہائی میسر تھی۔ اب میرے اور تصویر کے درمیان کوئی رکاوٹ نہیں تھی۔

چائے کی پیالی ہاتھ میں لے کر میں تصویر کی جانب متوجہ تھا کہ تصویر میں موجود خاتون جو ایک مٹیار لگتی تھی اسے حرکت کرتے ہوئے دیکھا۔ پہلے تو میں اسے اپنی نظروں کا دھوکا سمجھا۔ لیکن کافی دیر تک میں خاتون کو سوپ میں اناج پھٹکتے دیکھتا رہا۔ پھر اس نے میری جانب نگاہ اٹھائی۔ اس نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا

''دُور دور سے دیکھتے رہتے ہو، کبھی ہماری دنیا میں بھی آؤ۔''
میں نے قدرے خوفزدہ ہوتے ہوئے کہا ''یہ کیسے ممکن ہے؟'' اس نے ہاتھ بڑھا کر کہا لو یہ ہاتھ تھام لو۔ میں ایک معمول کی طرح اس کا ہاتھ تھام کر تصویر میں داخل ہو گیا اور خود کو اس مٹیار کے آنگن میں کھڑا پایا۔ اس نے بان سے بُنی کھاٹ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ بیٹھ جاؤ۔ خود گھر کے اندر چلی گئی، گلاس اور جگ کے ساتھ واپس آئی۔ گلاس میں لسی انڈیلتے ہوئے کہا ''تازہ لسی ہے پیو'' میں نے بڑی مشکل سے گلاس ختم کیا۔ ''لسی بہت عمدہ ہے'' میں نے کہا۔ اس نے گلاس دوبارہ بھر دیا۔ ''اور نہیں پی سکتا'' میں نے عاجزی سے کہا۔ اس نے کھلکھلا کر ہنستے ہوئے کہا ''بس ایک گلاس، ہم تو جب تک دو تین گلاس نہ پئیں سیری نہیں ہوتی۔ لیکن خیر تمہاری مرضی۔''
وہ کافی جاذب نظر تھی۔ اس کی آواز میں ایک گونج تھی، جیسے کنوئیں سے آ رہی ہو۔ اس کی ہنسی میں جھرنوں کا ترنم تھا۔ معمولی اور سادہ کپڑوں کے باوجود اس میں ایک وقار تھا جو مقابل کو احترام پر مجبور کرتا۔ میک اپ کی آلائشوں سے پاک اس کے چہرے پر تازگی تھی۔ نکلتا ہوا قد اس کی شخصیت کو کشش عطا کرتا تھا۔
میں نے اس کے رویے میں کوئی اجنبیت محسوس نہیں کی۔ جس سے مجھے قدرے حوصلہ ملا۔ میں نے صحن میں کھیلتے دو بچوں کی طرف اشارہ کر کے کہا ''تمہارے بچے بڑے پیارے ہیں۔'' اس نے نفی میں گردن ہلائی اور کہا ''یہ میرے شوہر کی پہلی بیوی کے بچے ہیں۔ اس کا طاعون میں انتقال ہو گیا تھا۔ میں تو اپنے شوہر کے چھوٹے بھائی کی منگ تھی۔ وہ بڑا سجیلا اور خوبرو جوان تھا۔ میں اس سے پیار کرتی تھی اور وہ بھی مجھے بے حد چاہتا تھا۔ میری ماں جانتی تھی لہٰذا جب میری ساس نے رشتہ ڈالا تو میرے گھر والوں نے قبول کر لیا اور منگنی ہو گئی۔
مراد کو گھڑ سواری کا بڑا شوق تھا۔ اس نے ایک گھوڑی پال رکھی تھی۔ اکثر اس پر دور دور تک سیر کو نکل جاتا۔ وہ کئی مرتبہ مجھے بھی اپنے ساتھ بٹھا لیتا۔ میں خوف کھاتی تو کہتا ''نیلم میرے ہوتے تمہیں ڈر کیسا؟''
لیکن ایک دن وہ گھوڑی سے گرا۔ اس کے سر پر چوٹ آئی اور وہ جاں بر نہ ہو سکا۔ میں بہت روئی میرے دکھ کو سمجھنے والا کوئی نہیں تھا۔ لوگ کہتے منگنی تھی کوئی شادی تو نہیں ہوئی، کیوں روتی ہو میں انہیں کیا بتاتی میری تو دنیا اجڑ گئی۔ کیا انسان کے اختیار میں ہے کہ دل کے سنجوگ کو بھول جائے۔
خاندان کے بڑوں نے فیصلہ دے دیا اور مجھے مراد کے بڑے بھائی سے بیاہ دیا گیا۔ میں نے دل پر پتھر رکھ لیا جب مراد نہیں تو پھر کوئی بھی ہو کیا فرق پڑتا ہے۔ اب میں اس کے اور اس کے بچوں کی خدمت کرتی رہتی ہوں۔ میرا کوئی بچہ نہیں میں اب بھی مراد کو اپنی یادوں میں زندہ رکھے ہوئے ہوں۔ وہ میرے خیالوں سے نکلتا ہی نہیں۔
مراد کا بھائی اچھی طرح جانتا ہے کہ میں خوش نہیں ہوں۔ لیکن اسے کوئی پروا نہیں۔ اس کا کام چل رہا ہے اس کے بچے پل رہے ہیں۔ اس کا گھر بسا ہوا ہے اسے کیا اگر میری دنیا اجڑ چکی ہے۔
میں نے پوچھا ''تمہارا شوہر کہاں ہے؟'' اس نے بتایا بس آتا ہی ہوگا۔ یہ سامنے ہمارے کھیت ہیں۔ آج کل فصل تیاری پر ہے اس کی زیادہ دیکھ بھال کرنا پڑتی ہے۔ وہ تمہیں کچھ نہیں کہے گا۔
کیوں؟ ایک اجنبی کو اپنے گھر دیکھ کر وہ یہ بھی نہیں جاننا چاہے گا کہ میں کون ہوں؟
میں جانتی تھی تم ایسا ضرور سوچو گے۔ لیکن تمہیں معلوم نہیں کہ صرف ہم دونوں ایک دوسرے کو دیکھ اور سن سکتے ہیں۔ تمہیں کوئی اور نہیں دیکھ سکتا۔
''ایسا کیوں؟'' میں نے حیرت کا اظہار کیا۔
''ہاں ایسا ہی ہے'' اس نے شوخی سے کہا ''اوپر والے کی مرضی۔ تم ایک اور حقیقت سے لاعلم ہو۔ تم میری مرضی کے بغیر یہاں سے جا نہیں سکتے۔ لیکن تم پریشان نہ ہو میں روکوں گی نہیں۔ میں جانتی ہوں تمہاری بیوی اور بچے ہیں۔ میں روز دیکھتی ہوں۔ تمہارے گھر پیار و محبت ہے، یقین و اعتماد ہے۔ تم ایک دوسرے کو دیکھ دیکھ کر جیتے ہو۔ میں تمہاری خوشیاں تم سے چھیننا نہیں چاہتی۔
''دیکھو میں بھی تمہاری شخصیت سے متاثر ہوں۔ تم سے ہمدردی رکھتا ہوں۔ میرے لیے باعث مسرت ہے اگر میں تمہارے کسی کام آ سکوں۔''
''نہیں تم اتنے بہادر نہیں ہو۔ تم اپنی دنیا چھوڑ کر ہمیشہ ہمیشہ کے لیے میری دنیا میں نہیں آ سکتے۔ میں سمجھتی ہوں تمہاری مجبوری ہے''
اس نے میرا ہاتھ تھام کر کہا ''آؤ میں تمہیں چھوڑ آؤں'' اس کے چہرے پر اداسی تھی۔ تھوڑی دیر قبل اس کے چہرے پر جو بشاشت آئی تھی اب وہ معدوم ہو رہی تھی۔''
''میں یہ کہے بنا رہ نہیں سکتا کہ تمہاری جدائی مجھ پر بھی شاق گزرے گی۔''
''جدائی کیسی میں تمہارے گھر کی دیوار پر ہمہ وقت موجود رہتی ہوں تم مجھے ہر وقت دیکھ سکتے ہو''
لیکن ایک ضروری بات میں نے ابھی تک نہیں بتائی کہ تم میرے مراد کے ہم شکل ہو۔ ایسے ہم شکل کہ تمہیں دیکھ کر میں تصویر میں زندہ ہو گئی۔ محبت ایک عظیم جذبہ ہے۔ ہمیں اس کی طاقت کا اندازہ نہیں۔ یہ قدم قدم پر معجزے برپا کر سکتی ہے۔ میری تصویر میں تمہارا آنا بھی معجزہ ہے۔ میری سچی محبت کا معجزہ۔ دراصل خدا محبت ہے محبت خدا۔
جاؤ مراد جاؤ۔ تمہیں زندگی کی سچی خوشیاں نصیب ہوں میں تمہارے لیے دکھ کا کارن نہیں بن سکتی۔ اس ابھاگن کی دعا لیتے جاؤ۔
اور میں دوبارہ اپنے ڈرائنگ روم کے مخصوص صوفے پر بیٹھا اس تصویر کو دیکھے جا رہا ہوں۔ اب یہ تصویر میرے لیے جیتی جاگتی دنیا ہے۔ وہاں نیلم ہے میں جس کا مراد نہ بن سکا۔

گھٹن

ڈاکٹر شیما ربانی
(کراچی)

آج نجانے کیوں بہت عرصے بعد میری کیفیت ایک بار پھر وہی ہو رہی تھی یعنی ایک انجانی گھٹن کا شدید احساس ہو رہا تھا، میں نے کام کرتے کرتے قلم رکھ دیا اور گہری لمبی سانس لینے کی کوشش کرنے لگا چند لمحوں بعد مجھے محسوس ہوا کہ اس گھٹن کا تعلق کمرے میں موجود ہوا میں کمی یا نظامِ تنفس سے نہیں ہے بلکہ یہ گھٹن میں اپنے دماغ میں محسوس کر رہا ہوں۔

'اُف! اب مجھ سے کام نہیں ہو پائے گا۔' میں نے سوچا اور کام چھوڑ کر اٹھ کھڑا ہوا مجھے لگا کہ میرے لئے تبدیلی بیحد ضروری ہوگئی ہے چاہے کتنی معمولی ہی کیوں نہ ہو۔ میں نے آفس سے باہر آ کر اپنے چپراسی کو مخاطب کیا 'بابا! میرا آفس بند کر دینا میں جا رہا ہوں اگر کوئی ضروری کام ہو تو کریم صاحب سے کہنا مجھے گھر پر فون کر لیں'۔ ہدایات دیتے ہوئے میں آفس کی بلڈنگ سے باہر چلا آیا۔

شام ہو رہی تھی اور آج میں خلافِ معمول جلدی گھر جا رہا تھا، وہاں پہنچ کر میں بقیہ وقت میں کیا کرونگا یہ میں نے ابھی نہیں سوچا تھا۔ گھر آنے کے بعد بھی میری وہی کیفیت جاری تھی یعنی بے چینی اور گھٹن۔ 'یہ کیا ہو رہا ہے مجھے؟' میں نے گھبرا کر اپنے آپ سے سوال کیا حالانکہ میرے کمرے میں میرے آرام اور دلچسپی کی تمام اشیاء موجود تھیں مگر ایک بے چینی مجھے گھیرے ہوئے تھی۔

'کسی دوست کو گھر بلا لیتا ہوں'۔ میں نے اس کیفیت سے نکلنے کے لئے خود کو ایک تجویز دی مگر پھر خود ہی اس کو رد کر دیا کہ باتیں کرنے کا بھی دل نہیں چاہ رہا تھا۔ ایک بار پھر اپنی توجہ ٹی وی کی جانب مرکوز کرنے کی کوشش شروع کر دی۔

میں ایک خوشحال کاروباری گھرانے سے تعلق رکھنے والا شخص ہوں اور اپنی زندگی سے کافی مطمئن بھی، میرا خاندان آبائی علاقے میں ہی رہائش پذیر ہے جبکہ میں اپنے کاروبار کے سلسلے میں شہر میں رہتا ہوں۔ میں نے سوچا کہ شاید یہ بے چینی اس لئے ہو کہ اپنے خاندان سے ملنے کی خواہش ہو رہی ہو! میں نے ایک بار پھر اپنی کیفیت کا سرا تلاش کرنے کی کوشش کی۔ مگر میرے دل نے اس پر حیرت کا اظہار کیا کہ ابھی ایک ہفتہ قبل ہی تو میں سب سے مل کر آیا ہوں۔ میری کیفیت میں تنہائی کا احساس ہرگز نہ تھا بس گھٹن تھی۔

میں مسلسل اس کے بارے میں سوچ رہا تھا 'کہیں ایسا تو نہیں کہ میں اپنی معمول کی زندگی سے اُکتا گیا ہوں'۔ میری خود کلامی جاری تھی، لیکن یہ خیال بھی رد ہو گیا کیونکہ پچھلے دنوں ہی میں دو ہفتے کی چھٹیاں گزار کر آیا ہوں۔

'عجیب بات ہے پھر یہ بے چینی کس وجہ سے ہے!' میری حیرت اپنی جگہ قائم تھی۔

رات کے بارہ بج رہے تھے لہٰذا میں سونے کا ارادہ کر کے ٹی وی بند کر کے اپنے کمرے میں آ گیا، آج گھر میں بھی خلافِ معمول خاموشی تھی کیونکہ میرا ملازم منظور دو دن کی چھٹی پر گاؤں گیا ہوا تھا۔

رات کا نجانے کونسا پہر تھا کہ میری آنکھ کھل گئی 'کیا وقت ہوا ہے' میں نے اپنے سائیڈ لیمپ کو روشن کیا تا کہ گھڑی پر وقت دیکھ سکوں، تین بجے تھے۔ میں نے لیمپ بند کر کے دوبارہ سونے کی غرض سے کروٹ بدلی اور آنکھیں بند کر لیں۔ مجھے اچانک کمرے میں ہلکی سے روشنی کا احساس ہوا، میں نے آنکھیں کھو لیں تو محسوس ہوا کہ کمرے کو ہلکی سی روشنی نے منور کر رکھا ہے۔

یہ روشنی میرے پیچھے سے آ رہی تھی، میں نے نہایت احتیاط سے کروٹ بدلی تو میری نظر کمرے میں بنے ہوئے روشن دان پر پڑی جہاں سے یہ روشنی آ رہی تھی۔ میں کچھ دیر تو لیٹا رہا مگر پھر میں بستر سے اُٹھ کھڑا ہوا، آہستہ آہستہ چلتے ہوئے کھڑکی کے پاس پہنچ گیا اور ایک جھٹکے سے کھڑکی کھول لی اور سامنے پھیلے منظر کو دیکھ کر حیران رہ گیا۔

میرے سامنے یوکلپٹس کے درخت کی شاخیں ہلکی ہوا کے جھونکوں کے ساتھ ساتھ جھوم رہی تھیں، اور درخت کی پھُننگی سے کچھ ہی بلندی پر دس تاریخ کا چاند مجھے دیکھ رہا تھا، اور اس کی نرم دودھیا چاندنی میرے لان کو منور کر رہی تھی۔ یہ ایک مکمل منظر تھا۔ میں اس لمحے کہ مکمل سکوت کو ٹکٹکی باندھے دیکھتا رہا، اچانک ہوا کا ایک جھونکا کھڑکی میں آ کر مجھ سے ٹکرایا جس سے محویت ٹوٹ گئی اور میں نے دوبارہ ایک بھرپور نظر اس منظر پر ڈالی اور کھڑکی کھلی چھوڑ کر ہلکا سا پردہ ڈال کر میں اپنے بستر پر آ لیٹا۔ میرے کمرے میں اب بھی وہی مدہم سی روشنی موجود تھی مگر اب یہ مجھے چونکا نہیں رہی تھی میں نے کروٹ بدلی اور آنکھیں بند کر لیں۔

اچانک مجھے محسوس ہوا کہ میں اندر تک بالکل پرسکون ہوں اور میری کئی دنوں سے قائم اضطرابی کیفیت اب میرے اندر کہیں بھی موجود نہیں ہے۔

'وہ گھٹن بھی اب محسوس نہیں ہو رہی ایسا لگ رہا ہے جیسے میں کھُل کر سانس لے سکتا ہوں'۔ میں نے اپنی کیفیت کا جائزہ لیا، میرے اندر اب مکمل سیرابی کی کیفیت تھی جیسے شدید پیاس میں ٹھنڈا میٹھا پانی پی لیا ہو۔

'یہ کیسی کمی تھی؟ اور نجانے کیسے پوری ہوگئی ہے؟' میں اس غیر معمولی واقعہ کے بارے میں سوچ رہا تھا جو ابھی چند لمحوں پہلے میرے احساس پر گزرا تھا۔ عجیب بات ہے ہمارے وجود کے اندر کتنی غیر مرئی اشیاء کے خانے بنے ہوتے ہیں جن کے خالی پن کو دوبارہ بھر دینے کا فریضہ قدرت خود سر انجام دیتی ہے۔ آج کل بھی میرے اندر شاید اس منظر کی کمی ہوگئی تھی جو آج کی رات اس مکمل منظر نے پوری کر دی ہے۔

مجھے یاد آیا کہ نجانے کتنے عرصے بعد آج میں نے آسمان کی جانب نظر اُٹھائی تھی۔

میں نے ایک بار پھر پرسکون اطمینان اور سرشاری کی کیفیت میں نیند کی غرض سے آنکھیں بند کر لیں۔

''گلشنِ وطن''

جاویدزیدی (نیویارک)

اُس سے گفتگو کر کے دیر تک دہن مہکے
جس طرح محبت میں شاخِ گل بدن مہکے

اُس گلی میں ہو جانا پیراہن کو چُھو آنا
اے صبا ہمارے بھی دل کا یہ چمن مہکے

ایسے آفتابوں کو رکھ دیا زمینوں میں
جن کی خوشبوئے فن سے خاک میں کفن مہکے

دہشتوں کے جنگل کو جھونک دو سمندر میں
پھر سے کاش اپنا بھی گلشنِ وطن مہکے

لمس جان و دل اُس کا خوشبوؤں کی منزل ہے
وہ پہن کے جب نکلے سارا پیراہن مہکے

○

نورزمان ناوک (تلہ گنگ)

طے ہوا اعتدال لہجے میں
اب رہیں گے جمال لہجے میں

چھو رہی ہے مری سماعت سے
اک صدا عرضِ حال لہجے میں

تا بہ منزل رہی رفیق مری
گردِ راہ بھی دھمال لہجے میں

حسنِ اظہار کے کئی پہلو
کھلتے دیکھے نڈھال لہجے میں

میرے اندر سسک رہا ہے ابھی
حرفِ پرسہ ملال لہجے میں

مضطرب پیرہن ہے ہر لمحہ
وقت ہے کس زوال لہجے میں

پالنا سن رہا تھا ممتا سے
ایک لوری جمال لہجے میں

کِھل رہا تھا بڑے تکبّر سے
شجرہ اک ابتذال لہجے میں

اب تو ناوکؔ نہیں رہے اپنے
کچھ قوی بھی فعال لہجے میں

○

نوید سروش (میرپورخاص)

اک نئی دنیا بسائی خاک پر
پھر نئی شمع جلائی خاک پر

ذہن میں کیا کیا خیال آتے رہے
ہم نے اک صورت بنائی خاک پر

تیر دل پر بے وفائی کے لگے
پیار کی دولت نہ پائی خاک پر

سامنا مجھ کو تو ناکامی کا تھا
راہ یہ کس نے دکھائی خاک پر

گلستاں کیوں صورتِ صحرا ہوئے
کب تھی ایسی بدنمائی خاک پر

زاویے سوچوں کے بدلے ہیں سروشؔ
کس کی ہے جلوہ نمائی خاک پر

○

پروفیسر زہیر کنجاہی

(راولپنڈی)

تُم یہاں آ کے میرا چمن دیکھنا — زخم در زخم شاخِ بدن دیکھنا
میں نے پھولوں میں اپنا لہو بھر دیا — تُم مجھے دیکھنا میرا فن دیکھنا
مجھ کو کانٹوں پہ چلنا پڑا ہے اگر — میری ہمّت ہے تُم یہ چلن دیکھنا
تیری خواہش ہے دیکھوں تری ہر ادا — میں نے چاہا ترا بانکپن دیکھنا
یہ تمنّا ہے گلیوں میں گھوموں پھروں — آرزو ہے نگارِ وطن دیکھنا
یہ نظر ہے نئے آسماں کے لیے — مجھ کو پڑتا ہے چرخِ کہن دیکھنا
یہ زہیر الم آشنا نے کہا — تُم ذرا آ کے میرا چمن دیکھنا

○

حفیظ انجم کریم نگری

(بھارت)

پرندہ پیڑ پر سہما ہوا ہے!! — شکاری تیر جو سادھا ہوا ہے!!!
میں کھل کر سانس لینے لگ گیا ہوں — مرا غم سے جو سمجھوتا ہوا ہے
جواں ہونے دے پھر معلوم ہوگا! — میاں! خوش ہے اُسے لڑکا ہوا ہے
یہاں پانی کی قیمت کیا بتاؤں — لہو لیکن بہت سستا ہوا ہے
یہ سُنتی ہے نہ کہتی ہے زباں سے — تمہاری بے گھری کو کیا ہوا ہے
یہ سورج ہے ضرورت ہے اِسے بھی — تلاشِ رزق میں نکلا ہوا ہے
پہن کر روح تیری ہے مہکتی؟ — یہ پیراہن مرا اُترا ہوا ہے
تو ہے اِک پل میں تولہ پل میں ماشا — طبیعت کو یہ تیری کیا ہوا ہے
لباسِ فاخری پہنا ہوا ہوں — یہ میرا دل مگر بیٹھا ہوا ہے
اب اس کی پارسائی ختم سمجھو — بڑوں کے روبرو گویا ہوا ہے
میں اُس کا ذہن انجم کیا بتاؤں — کبھی کوڑا ہوا کچرا ہوا ہے!!!

○

شجاع الدین شاہد

(ممبئی، بھارت)

یوں غمِ دوراں میں اُلجھے ہر خوشی کھوتے رہے — پل دو پل کو ہنس دئے اور پھر روتے۔۔۔رہے
درمیانی لوگ تھے کرتے کس کس سے گلہ — ہر زمانے میں ہمیں یہ تجربے ہوتے رہے
کچھ نہ ہم حالات کے ماروں کی پوچھو کیفیت — خواب پلکوں پہ سجا کے رات بھر سوتے رہے
زندگی کے حادثے تھے جان لیوا اس قدر — حوصلہ پاتے رہے ہم حوصلہ کھوتے رہے
بارشِ اشکوں کی رہی ہے شاہد ہمارے ساتھ ساتھ — ہم زمینِ دل میں کانٹوں کی چبھن بوتے رہے

○

نعیم الدین نظر

(میر پور خاص)

بام و در کی وسعتوں میں کھو گیا — یعنی گھر کی وسعتوں میں کھو گیا
اپنے رب کی عظمتوں کو بھول کر — مال و زر کی وسعتوں میں کھو گیا
رہ گذاروں کی تھکن اوڑھے ہوئے — اک شجر کی وسعتوں میں کھو گیا
اک قدم چلنا جہاں دشوار تھا — اس نگر کی وسعتوں میں کھو گیا
جس کی یادوں سے دیے غم کے بجھے — اس بشر کی وسعتوں میں کھو گیا
منزلوں سے توڑ کر رشتے تمام — پھر سفر کی وسعتوں میں کھو گیا
عکس اپنا ڈھونڈتے ہوئے نظرؔ — چشمِ تر کی وسعتوں میں کھو گیا

○

تصور اقبال

(اٹک)

کبھی جب بسترِ راحت سے سو کر وہ صنم اُٹھے — غزل لکھنے کو اک شاعر کا اُس لمحے قلم اُٹھے
نہیں ایسا نہیں ہے اپنی مرضی سے قدم اُٹھے — پکارا جس گھڑی تم نے تو ہم بھی دم بدم اُٹھے
محبت کے سمندر میں ہوئے ہم غوطہ زن ایسے — جو ساحل پر کبھی ڈوبے تو گہرائی سے ہم اُٹھے
مرے دل کے کسی کونے میں اب بھی ہے نہاں کوئی — بغاوت کا نجانے کس گھڑی پھر یہ علم اٹھے
کہا تھا ایک دن اُس نے مرے گھر اب نہیں آنا — وہ دن ہے پھر ہمارے بھی نہ اُس جانب قدم اُٹھے
ابھی تو میرے دل میں سینکڑوں ارمان باقی تھے — نہ کچھ پوچھو تصورؔ اُن کی محفل سے جو ہم اُٹھے

○

سید نصرت بخاری

(اٹک)

خدمتِ صاحب و سرکار سے کیا ہوتا ہے — مسند و جبہ و دستار سے کیا ہوتا ہے
چیر کر دل تو مخاطب کا ذرا دیکھو تو — صاحبو! لغزشِ گفتار سے کیا ہوتا ہے
تنگیِ قلب و نظر پہ بھی توجہ صاحب! — وسعتِ کوچہ و بازار سے کیا ہوتا ہے
یہ تو انساں کی تسلی کے لیے ہوتی ہے — کوئی دشمن ہے تو دیوار سے کیا ہوتا ہے
حوصلہ کھینچ کے ناؤ کو کنارے لایا — ورنہ طوفان میں پتوار سے کیا ہوتا ہے
جان جاتی ہے تو ملتی ہے شہادت نصرتؔ — صرف نظارۂ تلوار سے کیا ہوتا ہے

○

شگفتہ نازلی (لاہور)

کیسے کہیں کہ اب تو کوئی بات بھی نہیں
پھر اس پہ مُستزاد وہ حالات بھی نہیں

کرتے تو ہیں دُعائیں، جانے ہوں گی کب قبول
شاید کہ پہلے سی وہ عبادات بھی نہیں

سادہ سے ہی لباس میں، سب سے جُدا لگی
پہنے ہوئے تھی، ریشم وبانات بھی نہیں

رستے اُداس، پیڑ چُپ، طائر بھی تھے خموش
بہتی جہاں تھیں نہریں، واں باغات بھی نہیں

اب کون جاتا ہے کسی کا حال پوچھنے
لوگوں میں تو وہ گزری علامات بھی نہیں

گرتے کو تھام لے، کسی ہی موڑ پہ کوئی
ایسے تو اب رہے کہیں جذبات بھی نہیں

ہر اِک کے جانچنے کے ہیں اطوار بھی جُدا
مابین سب کے ملتی مساوات بھی نہیں

رُوکھے مزاج ایسے ہیں کہ کچھ نہ پوچھیے
کوئی کسی طرح کا اِلتفات بھی نہیں

ہم کو سوائے اپنے کچھ بھی سُوجھتا نہیں
دُوجوں کے واسطے تو ترجیحات بھی نہیں!

سیفی سرونجی (بھارت)

تم سے جب بھی کوئی سودا ہوتا
ہم کو ہر حال میں گھاٹا ہوتا

میں زمانے میں نہ رسوا ہوتا
ماں ترا کہنا جو مانا ہوتا

خوب ملتی تمہیں عزت شہرت
دل کتابوں میں لگایا ہوتا

سوچتے سب ہیں کہ ایسا ہوتا
گھر میں بیٹی نہیں بیٹا ہوتا

اجنبی شہر میں کس سے ملتے
پھر یقیناً کوئی دھوکا ہوتا

جنگ ہوتی نہ کبھی ہم میں نفاق
دل سے دل کا کوئی رشتہ ہوتا

کر رہے تھے جو انا کی باتیں
آئینہ اُن کو دکھایا ہوتا

آسماں چھونے چلے ہو سیفی
اپنی اوقات کو سمجھا ہوتا

رومانہ رومی (کراچی)

ہے مکاں اور لامکاں خاموش
آج کیوں ہے یہ آسماں خاموش

نقش چہرے کے ہو گئے دھندلے
لگ رہے ہیں یہ جسم وجاں خاموش

کس سے پوچھوں بتا پتا تیرا
منزلیں، راستے، نشاں خاموش

کچھ تو بتلاؤ رازِ خاموشی
کیوں فلک پر ہے کہکشاں خاموش

جھوم کر آئی تھی بہار، یہاں
رہ سکی نہ وہاں خزاں خاموش

قہقہے جم گئے خلاؤں میں
آج ہے بزمِ دوستاں خاموش

ہم بھی یوں لگ رہے ہیں اے رومیؔ!
جیسے ہوتے ہیں بے زباں خاموش

○

ماہر اجمیری

(میرپورخاص)

وہ جو میرے لیے تسکیں دہِ جاں ٹھہرا ہے
چند لمحے بھی مرے پاس کہاں ٹھہرا ہے

کل یہی شخص مسیحا تھا تمہارا یارو
آج جس پر تمہیں قاتل کا گماں ٹھہرا ہے

اپنے دامن سے وہ ہر داغ مٹا دیتا ہے
اُس کے دامن پہ کہاں کوئی نشاں ٹھہرا ہے

اب تو اس شہر کے حالات بدل دے یارب
ہر طرف مسئلۂ امن و اماں ٹھہرا ہے

تم نے دیکھا ہو تو مجھ کو بھی بتا دو یارو
قافلہ اہلِ محبت کا کہاں ٹھہرا ہے

حبسِ بے جا میں ہے ہر شخص یہاں کا ماہر
جب سے اس شہرِ محبت میں دھواں ٹھہرا ہے

○

ابراہیم عدیل

(جھنگ)

اُن کی نظر میں ایک ہدف آ کے رہ گیا
خطرہ تمام میری طرف آ کے رہ گیا

تاجِ شہی میں تھا نہ گلوئے عروس میں
کس دشت میں وہ جانِ صدف آ کے رہ گیا

تا حشر پھر کسی کو میسّر نہیں ہوا
اک خاندان میں وہ شرف آ کے رہ گیا

لکھا وہ نام میں نے تو اک حشر اُٹھ گیا
کون و مکاں میں شورِ حذف آ کے رہ گیا

تتلی سلگتے پھول کو بس دیکھتی رہی
ہونٹوں پہ اس کے کوئی حلف آ کے رہ گیا

میرے اک اعتراف نے پانسہ پلٹ دیا
شعلہ مزاج تیغ بہ کف آ کے رہ گیا

اچھے گھروں کے کتنے کشادہ ہیں در عدیلؔ
ہر شخص ہی مدینہ نجف آ کے رہ گیا

○

ابرار حسین اکبر

(جھنگ)

لکھ گیا کون لہو نال کہانی اپنی
دے گیا حق دا علم دنیا تے نشانی اپنی

کتنا بے درد ہے نفرت دا اجو کا موسم
بھل گئی ریت محبت دی پرانی اپنی

میرے دشمن میرا کردار قتل کیتا اے
میں ای پاگل ساں نئیں ذات سنجانی اپنی

گھر تاں ہک خواب سی تعبیر نہیں ہو سکیا
ایویں فٹ پاتھ تے پئی عمر وہانی اپنی

زندگی جرم توں پہلے وی سزا دیندی اے
لاش پیندی کدی آپ نوں چانی اپنی

ہن تاں باروداں دی بوچھار چفیرے کھلری
موتیا ہے نہ کوئی رات دی رانی اپنی

میرے احساس دی دولت وی لُٹی گئی اکبرؔ
چپ ہے صدیاں توں جویں سوچ بلانی اپنی

○

چند سیپیاں سمندروں سے

(سفرنامۂ جنوبی افریقہ سے انتخاب)

پروین شیر (کینیڈا)

قسط.....۴

دیارِ تشدد (سوآ زی لینڈ)

وین سوآ زی لینڈ (Swaziland) کی سرحد کی طرف بڑھ رہی تھی۔ پپیتے اور گنے کے لہلہاتے کھیتوں کے درمیان۔ 25 فٹ سے زیادہ اونچے پپیتے کے سینکڑوں درخت تھے۔۔۔ جنہیں دوا دے کر قد چھوٹا کیا جاتا ہے تا کہ پھل آسانی سے توڑا جا سکے۔ صبح کی ہواؤں میں ایک خوشبو رچی ہوئی تھی۔ نرم سنہری کرنیں آسمان سے اُتر کر ندی کو چوم رہی تھیں۔

سوآ زی لینڈ جو Southern Hemiphere کا سب سے چھوٹا ملک ہے قریب آتا جا رہا تھا۔ جہاں آج بھی ایک بادشاہ کی حکومت ہے۔ سیّاح اس ملک کے متعلق جاننے کے خواہاں تھے۔ اس لیے کینن نے مائیک اپنے ہاتھوں میں لے لیا تھا۔ وین میں سب ہمہ تن گوش تھے۔ ''یہاں کے بادشاہ کا نام مسواتی 3 ہے اور اس کی ماں Ndlovakazi ہے جس کے معنی ''She elephant'' (مادہ ہاتھی) کے ہیں۔ اس بادشاہ نے ملک کی حالت خراب کر رکھی ہے۔ غریب تر بنا کر خود ساری دولت سے عیش کرتا ہے۔ اٹھارہ سال کی عمر کے بعد ہی کوئی بادشاہ بن سکتا ہے۔ ابھی مسواتی 3 کی عمر اکتالیس سال ہے اور اس کی چودہ بیویاں ہیں۔ یہ ہر سال شادی کرتا ہے۔ سینکڑوں غیر شادی شدہ نوعمر لڑکیاں ہر سال ایک روایتی رقص کرتی ہیں جن کی عمر سات سال سے اٹھارہ سال ہوتی ہے۔ اس رقص کا نام Umhlenga ہے یعنی Reed Dance۔۔۔ یہ ایک اہم تہوار ہے۔ حسین رنگوں کا تہوار جو بادشاہ اور اس کی ماں کے اعزاز میں ہوتا ہے۔ یہ لڑکیاں آٹھ دنوں تک رقص کرتی ہیں۔۔۔ وہ بھی Topless رقص کے بعد ان لڑکیوں کی مدارات میں مویشیوں کا گوشت پکا کر ان کی دعوت کی جاتی ہے گھر واپس جانے سے پہلے۔

یہ لڑکیاں چار میٹر لانبا نرسل کا بنڈل تھام کر رقص کرتی ہیں۔ یہ نرسل بادشاہ کی ماں کو تحفہ دیتی ہیں جس سے محل میں ہوا کے زور کو روکنے کے لیے دیواریں بنتی ہیں۔ اس رقص کا مقصد ہے ان کی نسوانیت اور عفیفہ ہونے کا جشن منانا۔ ہر لڑکی کی یہی تمنا ہوتی ہے کہ بادشاہ کی نظرِ عنایت اس پر ہو اور وہ ملکہ بننے کے لیے چن لی جائے۔ شان کی زندگی مل جائے غربت سے نجات مل جائے۔

بادشاہ جسے چاہے چن لیتا ہے۔ لیکن اُس لڑکی کو شادی سے قبل حاملہ ہونا ضروری ہے کیونکہ وہ ثبوت پیش کر سکے کہ وہ وارث پیدا کرنے کے قابل ہے بھی یا نہیں۔ شادی کے بعد جب وہ ملکہ بن جاتی ہے تو بادشاہ اسے ایک BMW کار اور ایک محل دیتا ہے جب کہ پورا ملک غربت کی دلدل میں پھنسا ہوا ہے۔ سوآ زی لینڈ میں Polygamy جائز ہے۔ ان کے خیال میں اس سے قومی اکائی قائم رہتی ہے۔ کچھ لڑکیاں اس کے خلاف ہیں کیونکہ اپنا شوہر دوسری عورتوں سے بانٹنا نہیں چاہتیں۔ لیکن ماں باپ خوش ہوتے ہیں کہ ان کی بیٹی ملکہ بن جائے گی۔ ایک لڑکی نے بغاوت کی اور شادی سے انکار کر دیا تھا۔ کورٹ میں مقدمہ ہوا لیکن لڑکی ہار گئی۔ کیونکہ اسے تو ہارنا ہی تھا بہر حال۔ بادشاہ مسواتی 3 اپنے پچیس بچوں اور چودہ بیویوں کے ساتھ عیاشی میں مبتلا ہے۔ پانچ سو ہزار ڈالر کی باسٹھ قیمتی گاڑیوں کا مالک ہے۔ اپنی بیویوں کے لیے پندرہ ملین ڈالر کے محلات بنوائے ہیں۔ مسواتی 3 (پیدائش ۱۹/اپریل ۱۹۶۸ء) کے خلاف بغاوت شروع ہو گئی ہے کہ وہ اپنی ذاتی خواہشات کو ترجیح دے کر اپنے ملک کو تباہ کر رہا ہے غربت میں ڈبو کر۔ اب تو ساری دنیا اور میڈیا بادشاہ کے خلاف ہیں۔ ملک میں آگہی نے سر اٹھا لیا ہے لیکن بادشاہ اپنی طاقت ہاتھ سے نہ دینے پر اڑا ہوا ہے۔ اس کے پاس اس کے ذاتی ساٹھ ملین ڈالر ہیں جب کہ اس کے ملک کے باشندے ایک دن میں صرف ایک ڈالر کماتے ہیں۔ کسی طرح زندگی گھسیٹتے ہیں۔ یہ دنیا کا سب سے کم سن بادشاہ ہے اور مالا مال ہے۔ جب کہ سوآ زی لینڈ کے اسپتالوں میں ضروری دوائیاں بھی میسر نہیں ہیں اور دنیا میں سب سے زیادہ چھوت کی بیماری HIV اور AIDS یہیں ہیں۔ تقریباً تیراسی فیصد۔۔۔ دنیا میں سب سے مختصر زندگی (Life expectancy) یہیں ہے صرف انچاس سال۔۔۔ چوالیس سال قبل اس ملک نے انگریزوں سے آزادی حاصل کی تھی اور آج تک بادشاہ کے تشدد کے غلام ہیں۔ آج یہاں کے باشندے غربت کی آگ میں جھلس رہے ہیں۔''

کینن کے لہجے میں تلخیاں رچی ہوئی تھیں۔ آواز میں ارتعاش تھا۔۔۔ کہہ رہا تھا وہ۔۔۔ ''یہ ظالم بادشاہ جب بارہ سال کا تھا تو اس کا باپ جس کا نام سوب ہوزا 2 (Sobhuza 2) تھا چل بسا تھا۔ مسواتی 3 کو چھ سال تخت و تاج پانے کے لیے انتظار کرنا پڑا تھا۔ ۱۹۸۶ء تک۔ اب اس کے ظلم سے لوگ تنگ آ گئے ہیں۔ چھٹکارا پانے کی کوشش میں ہیں۔ کسی بھی سوآ زی شہری سے پوچھا جائے کہ تمہارا بادشاہ کیسا ہے، کیا تم اسے پسند کرتے ہو؟ اس کا جواب ہمیشہ مثبت ہوگا۔ وہ کہے گا کہ وہ اپنے بادشاہ کو بہت پسند کرتا ہے۔ ورنہ اسے جیل بھیج دیا جائے گا۔ مسواتی 3 کے باپ (سوب ہوزا 2) کے پاس تقریباً پانچ سو اولادیں تھیں اپنی بیویوں سے۔''

وین بہت چھوٹے سے شہر ''میلا لانی'' میں رک گئی تھی کچھ دیر کے لیے۔ اس شہر نے وطن کی یاد دلا کر بے چین کر دیا تھا۔ یہاں تازہ امرود اور مختلف پھل جو صرف وطن میں ملتے ہیں ٹھیلے گاڑیوں پر فروخت ہو رہے تھے۔ یہ سماں

نورتھ امریکہ میں دیکھنا کہاں نصیب تھا۔ اپنے دیس کے لذیذ، خوش رنگ اور خوب صورت پھل۔۔۔ٹھیلوں پر۔۔۔کچھ دیر یہاں دم لے کر وین چل پڑی تھی اور جلد ہی سوآزی لینڈ کی سرحد آ گئی تھی۔ یہاں رک کر سبھوں کو ویزا لینا تھا۔ خستہ دیواروں کے بہت چھوٹے سے کمرے میں ویزا دیا جا رہا تھا۔ یہ ماحول وطن کے چھوٹے سے شہر کا سا تھا۔ کینن اپنے سیاحوں کے پاسپورٹس لے کر قطار میں کھڑا تھا۔ ویزا کی مہر لگوانے کے لیے سخت گرمی میں۔۔۔وہ دور کھڑی یہ سب کچھ دیکھ کر سوچ میں ڈوب گئی تھی کہ ایک قدم کے فاصلے پر دوسرا ملک تھا۔ یہ سرحدیں زمین کے خوبصورت جسم پر خراشیں ہیں۔ ان خراشوں کے جال میں زمین پھنسی ہوئی ہے۔ سرحد کے اس پار داخلے کے لیے کتنی کارروائیاں ہیں۔ زمین بے چین ہے لیکن خراش ڈالنے والوں کو زمین کے دکھ سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔

ویزہ مل جانے پر سیاحوں کی ٹولی سرحد کے اس پار آ گئی تھی۔ دوسرے ملک میں چھوٹی سی سلطنت کے بے حد امیر بادشاہ اور بے حد غریب باشندوں کے ملک میں۔۔۔ یہاں ہر طرف جھاڑیاں اور پہاڑ ہیں۔ یہاں کا سکہ۔۔۔ ساؤتھ افریقہ کی طرح Rand نہیں ہے۔ اس لیے تبدیلی کی ضرورت تھی۔ سکے کا نام Lilangeni ہے۔

چھوٹے سے ملک سوآزی لینڈ کے شمال کی طرف پہاڑوں کے سلسلے نظر آ رہے تھے اور جنوب پہاڑوں سے بالکل خالی۔ وین لوگوگوسن ہوٹل (Lugogo Sun Hotel) پہنچ گئی تھی۔ دھوپ نرم ہو گئی تھی کیونکہ تیسرا پہر تھا پروین کے گروپ کے امریکی اور جرمن سیاح اپنے اپنے کمروں میں آرام کرنے چلے گئے لیکن وہ ایک ایک پل کو قیمتی گردان کر آرام نہیں کرنا چاہتی تھی۔ وہ فراز اور وارث کے ساتھ ہوٹل کی میزبان سے میپ لے کر اور معلومات حاصل کر کے باہر نکل گئی تھی کینن کی ہدایت تھی اندھیرا ہونے سے قبل ہوٹل واپس آ جانا چاہیے۔ ہوٹل سے کچھ دور۔۔۔سڑک کے کنارے میلوں تک قطاروں میں چھوٹی چھوٹی دوکانیں تھیں۔ ٹین کی چھتوں والی، جو زنگ آلود تھے۔ دست کاری کی دوکانیں خوبصورت رنگ اوڑھے ہوئے کھڑی تھیں۔ لکڑی کے مجسمے ہر طرف نمایاں تھے۔ ہر تخلیق سے اُس ملک کی تہذیب آشکارا تھی۔ دوکانوں میں زیادہ تر عورتیں تھیں جو اپنے ہنر سجائے ہوئے تھیں اور بے تحاشہ قیمت کر رہی تھیں۔ ان کی اس بے چینی اور بے بسی سے کچھ خریدار بھرپور فائدے اٹھا رہے تھے۔ یہ سماں دیکھ کر اس کے ذہن میں سوالات کی کئی گتھیاں تھیں جو سلجھتی نہ تھیں۔ فراز کو غیر ضروری سامان خریدتے ہوئے دیکھ کر وہ حیران تھی۔ لیکن پھر سمجھ چکی تھی کہ وہ ایسا کیوں کر رہا تھا۔ اس نیک دل، انسانیت سے بھرپور لڑکے کی عظمت دیکھ کر وہ خود نازاں تھی کہ وہ اس عظیم ہستی کو دنیا میں لانے کا ذریعہ تھی۔

ایک خوش مزاج دوکان دار عورت نے پروین کو مخاطب کیا تھا۔ اپنی دوکان میں بلا رہی تھی۔ یہاں بھی وطن یاد آ گیا تھا۔ کیونکہ ہر دوکان دار پکار کر اپنی طرف بلا رہا تھا۔ وہ اُس عورت کی طرف جب بڑھی تھی تو اُس عورت کے چہرے پر خوشی کے کتنے ہی رنگ آ گئے تھے۔ پروین اس سے باتیں کرنے لگی تھی۔ وہ عورت پروین کو اپنے ملک کی داستان سنانے لگی تھی کہ۔۔۔''سوآزی لینڈ کا سب سے اہم تہوار ہے Incwala یہ پورے چاند کے بعد چوتھے دن ہوتا ہے۔ جب سال کا سب سے لانبا دن ہوتا ہے۔ Incwala کے معنی ''پہلے پھل کا تہوار'' کے ہیں۔ بادشاہ سب سے پہلے اُگے ہوئے پھل کو چکھتا ہے اور رقص کرتا ہے۔ سوآزی لینڈ میں آج بھی Stone age کے نشانات موجود ہیں۔ پچیس ہزار قبل مسیح سے انیسویں صدی تک کے پتھروں پر کی گئی مصوری ہے۔ جس میں جانور، انسان، شکار، لڑائی اور رقص کے مناظر موجود ہیں۔ یہاں کی زبان سواتی (Swati) ہے لیکن انگلش بھی ہے۔ یہاں کاشت کاری میروآنا (Marijuana) کی ہوتی ہے۔ یہاں کا المیہ یہ ہے کہ انگریزوں نے ۱۹۰۲ء سے ۱۹۶۸ء تک حکومت کی اور اب بے رحم بادشاہ کی حکومت ہے۔ Media کو کوئی آزادی حاصل نہیں ہے اور۔۔۔باشندوں کو بھی بولنے کی آزادی نہیں۔ سب پر پہرے ہیں کیونکہ بادشاہ کی عیاشی اور ناانصافی کے بے پردہ ہو جانے کا خطرہ ہے''

وہ اس کھلی ہوا کے بازار میں بکھرے ہوئے رنگوں سے اور اس دوکان دار کی دلچسپ باتوں سے محظوظ ہو رہی تھی۔ خوشگوار ہواؤں میں رنگ برنگے کپڑے لہرا رہے تھے۔ جھونپڑی نما دوکانیں کچی۔۔۔گرد آلود زمین پر ایستادہ تھیں۔ سرخ مٹی کی ڈھول پر۔۔۔ چھوٹے بڑے لکڑی اور شیشے کے مجسمے اور کرافٹ کی چیزوں قطاروں میں سجی ہوئی تھیں۔ میلوں تک قطاروں میں پھیلا ہوا کھلی ہوا میں یہ بازار خوبصورت Ezulwini- Valley میں تھا۔ اُس دوکان دار نے اپنی ٹوٹی پھوٹی انگلش میں بتایا تھا کہ بادشاہ اسی وادی میں اپنے عالی شاہ محل میں رہتا ہے اپنی ماں کے ساتھ۔۔۔

اس حسین وادی کو جنت کی وادی بھی کہتے ہیں اور یہ صرف دوسو کلومیٹر کا رقبہ رکھتی ہے۔ سوآزی لینڈ کا دارالسلطنت مبابانے (Mbabane) بھی اسی وادی میں ہے۔'' پروین نے اس خوش مزاج دوکان دار عورت سے دو خوبصورت لکڑی کے مجسمے خریدے تھے جو مقامی عورتوں کے تھے۔ شام اپنے آنے کا اعلان کر رہی تھی۔۔۔اس لیے تیز قدموں سے واپس ہوٹل جانا ہی تھا۔

کینن نے کہا تھا پہاڑوں کی گود میں اس ننھے منے ملک کی آبادی صرف دس ملین ہے جس کے قریب ایک پہاڑ ایسا ہے جس کی شکل بالکل مگر مچھ کی طرح ہے۔

شیشے کا جہاں

سیاحوں کو لے کر اب وین سوآزی لینڈ کی بہت مشہور شیشے کی فیکٹری کی طرف رواں تھی۔

بقول کینن، سوآزی لینڈ میں تینتالیس ہزار سال قبل پرانی دنیا کی سب سے قدیم لوہے کی کان ہے۔ راستے میں چھوٹا سا شہر Pigss Peak ملا تھا جہاں عورتیں ہر طرف باسکٹ بُن رہی تھیں۔۔۔ وہاں کی ملکہ انہیں مالی مدد

سے نوازتی رہتی ہے تاکہ ان کے بچے اسکول جاسکیں۔ کچھ دیر میں ایک اور چھوٹا شہر آ گیا تھا جس کا نام Manzini تھا۔۔۔ کینن کہہ رہا تھا۔۔۔''اس ملک میں بادشاہ کی جب موت واقع ہوتی ہے تو اسے بٹھا کر دفن کیا جاتا ہے عزت دینے کی خاطر۔۔۔ بادشاہ کا کوئی راز جان لینے کی سزا بے حد سخت ہے۔ اس طرح کے مجرم کا سر باہر رکھ کر جسم ریت کے اندر دفن کر دیا جاتا ہے اور سامنے کھانا رکھ کر تڑپایا جاتا ہے۔ بادشاہ بننے کے لیے شیر مارنا ضروری ہے لیکن دلچسپ بات یہ ہے کہ مارنے سے پہلے شیر کو بے ہوش کر دیا جاتا ہے۔ تاکہ وہ آسانی سے مر سکے۔ بادشاہ کی پہچان شیر ہے جو سختی اور بہادری کی علامت ہے، بادشاہ کی ماں کی پہچان ہاتھی ہے۔۔۔ جو نرم خوئی کا نشان ہے۔ سوآزی لینڈ میں بھی جرم نام کی چیز بہت کم ہے۔ زیادہ سے زیادہ جیب کٹ جاتی ہے اور بس۔ قتل کبھی نہیں ہوتا۔ زندگی کی بہت عزت اور قیمت ہے۔ یہاں بادشاہ بنتا ملکہ ماں (Queen mother) پر منحصر کرتا ہے۔ اُسے ایک ہی بیٹا پیدا کرنا ہوتا ہے۔ اگر دو ہو گئے تو دونوں ایک دوسرے کو ختم کر دیتے ہیں۔ یہی روایت ہے اگر لڑکی پیدا ہو تو لڑکا پیدا کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ اگر بادشاہ کی موت پہلے ہو جائے تو اس کی ماں ملکہ بن کر حکومت کرتی ہے۔ اس ملک میں بزرگوں کی بہت عزت ہے۔'' کینن کی کومینٹری سنتے ہوئے وقت کا پتہ نہیں چلتا تھا۔ جلد ہی Ngwenya Glass Factory آ گئی تھی۔ یہاں ۱۹۷۹ء میں سوئیڈن سے دو لوگ آئے تھے اور یہ کارخانہ بنایا تھا۔ شیشے کے Hand Blown سامان بنانے کا۔ یہاں کے باشندوں کو اس کی تربیت دی تھی۔ آج یہ ان کا اپنا بزنس ہے۔ سوآزی لینڈ کے قریب جو مگرمچھ کی شکل کا پہاڑ ہے یہ شیشے کی فیکٹری کا شہر Ngwenya اُس مگرمچھ کے پیر کا حصہ ہے۔ اسی لیے اس کا نام نگونیا ہے۔ جس کے معنی مگرمچھ کے ہیں۔ فیکٹری کے اندر اوپر بالکنی سے نیچے شعلوں کے درمیان لوگوں کو دیکھ کر۔۔۔ جو شیشوں کو شعلوں سے نرم کر کے انہیں Hand Blow کر کے اک نئی شکل، نیا تشخص عطا کر رہے تھے۔۔۔ وہ سوچ رہی تھی۔ سخت پتھر کو پانی کی نرم انگلیاں تراش دیت ہیں اور یہاں بھی سختی کو کس طرح گرمی اپنی آنچ سے نرم اور لچک دار بنا رہی تھی۔ جیسے محبت کی گرمی بھی آہنی دل کو اسی طرح نرم بنا کر جو شکل چاہے دے سکتی ہے۔ نرمی تو سختی سے زیادہ طاقتور ہوتی ہے۔ دور بالکنی پر نیچے سے آتی ہوئی آگ کی تپش میں بے حد شدت تھی وہاں کھڑا رہنا محال تھا لیکن وہ کھڑی ہوئی دیکھ رہی تھی۔ شیشوں کو نئی زندگی نئے چہرے دینے والے فنکاروں کو جو اپنی تخلیقیت میں اتنے کھو گئے تھے کہ آگ کی تکلیف وہ شدت انہیں روک نہیں پا رہی تھی۔ یا وہ اس لیے برداشت کر رہے تھے کہ شاید یہ ان کی بقا کا سہارا تھا۔ کینن کے مطابق یہ شیشے سڑکوں اور گلیوں سے چن کر لائے جاتے ہیں۔

موم کی دنیا

خوبصورت Ezulwini Valley میں سوآزی لینڈ کی دنیا میں مشہور موم بتی کی فیکٹری ہے۔ جہاں پہنچ کر محسوس ہوا تھا جیسے یہ موم کا جہاں ہو۔ ہر طرف عورتیں اور مرد اپنی فنکاری میں مصروف تھے۔ ہر طرف موم کسی اور شکل میں ڈھل رہے تھے۔ افریقن حیوانات کی شکل کی موم بتیاں ہاتھوں سے منٹوں میں تیار ہو رہی تھیں۔ دیکھتے ہی دیکھتے موم کا ٹکڑا نئی شکل پا رہا تھا۔ موم بتی بنانے والوں کے ہاتھوں میں جیسے جادو تھا۔ ہزاروں چھوٹی بڑی رنگ برنگی موم بتیاں افریقن جانور بنی بجی ہوئی تھیں جو برائے فروخت تھیں۔

تین وسیع کمروں میں انسانی انگلیاں مشین بنی ہوئی تھیں۔ سیاح جس جانور کو چاہتے اس کی شکل کی موم بتی بنوا رہے تھے جو صرف پانچ منٹ میں تیار ہو جاتی تھی۔ وہ موم بتی کی زندگی کے متعلق سوچ رہی تھی۔ یہ روشنی دینے کے لیے جان دے دیتی ہیں۔ ماں کی طرح۔۔۔ جو ساری عمر اپنے گھر میں خوشیوں کا اُجالا قائم رکھنے کے لیے خود کو فنا کر دیتی ہے۔ موم بتی کی طرح جلتے جلتے خود پگھل جاتی ہے۔ اپنا وجود کھو دیتی ہے۔ موم بتیاں اور مائیں ایک جیسی ہوتی ہیں بے غرض صرف دینے والی۔

ٹھہرے ہوئے وقت کا جہاں (Kingdom of the Zulu)

سیاحوں کا قیام خوبصورت Protea Hotel Umfolozi River میں تھا۔ کچھ سیاح سامنے حسین باغ کی گود میں تیراکی میں مصروف تھے۔ کچھ اپنے کمروں میں آرام کر رہے تھے اور۔۔۔ پروین ذولو گاؤں دیکھے بغیر کینیڈا واپس جانا نہیں چاہتی تھی۔ کیونکہ وہ حقیقی افریقین قبیلوں کی زندگی کے انداز دیکھنا چاہتی تھی۔ یہ دوپہر سیاحوں کا آزاد وقت تھا۔ یعنی گروپ کے بغیر۔ کینن کی رہبری کے بغیر جس کو جہاں جانا تھا جو کرنا تھا کر سکتا تھا۔ ہوٹل کی مددگار میزبان نے فون کر کے کسی گائیڈ کا انتظام کر دیا تھا۔ وہ بیس منٹ میں اپنی جیپ لے کر آ گیا تھا۔ اس کا نام اسٹین (Stan) تھا۔ یہ شخص بھی کینن کی طرح نرم گفتار اور نہایت خوش مزاج تھا۔

ذولو گاؤں جیسے کوئی اور ہی سیارہ تھا یا پھر وہ (Stone age) پتھر کا زمانہ لگتا تھا۔ قدرت کی گود میں رہنے والے باشندے ترقی یافتہ دنیا سے بالکل الگ تھے۔۔۔ گاؤں کے اندر جانے کے لیے لکڑی کا ایک خاص دروازہ تھا۔ اندر جانے سے پہلے آواز دے کر اجازت لینی تھی۔ اندر سے جواب آنے پر ہی داخل ہو سکتے تھے۔ گائیڈ اسٹین نے اپنی زبان زولو میں کچھ کہا تھا اور جواب بھی اُسی زبان میں اندر سے آیا تھا۔ لکڑی کے بنے ہوئے ایک کمپاؤنڈ کے اندر گول پھوس کے بنے ہوئے جھونپڑے تھے۔ مرد جسم کے اوپری حصے کی طرف عریاں تھے۔۔۔ ایک کمپاؤنڈ میں تقریباً بیس جھونپڑے تھے۔ کچھ عورتیں درخت کی چھاؤں میں بیٹھی ہوئی موتیوں کے ہار اور دوسرے زیورات بنا رہی تھیں۔ کچھ عورتیں اوکھلی میں مکئی کوٹ رہی تھیں۔ ایک جھونپڑا جلا ہوا تھا۔ اسٹین نے بتایا کھانا پکاتے وقت آگ لگ گئی تھی۔ اس میں رہنے والے اپنے ہم سائے کے جھونپڑے میں رہ رہے تھے اور اپنا نیا جھونپڑا بنا رہے تھے۔ یہ جھونپڑے شہد کی

مکھیوں کے چھتے کی شکل میں تھے جو اندر صرف چودہ فٹ کے تھے۔
کمپاؤنڈ میں داخل ہوتے ہی دروازے کے قریب ایک نوجوان لڑکی کا جھونپڑا تھا۔اسٹین کے مطابق اس کی وجہ یہ تھی کہ اگر دوسرے قبیلے والے حملہ کریں تو لڑکی کو کمزور جان کر قتل نہیں کریں گے اور واپس چلے جائیں گے۔نانی اور دادی کے جھونپڑے الگ تھلگ اور بڑے تھے۔ایک مرد کی کئی بیویاں تھیں۔سب الگ جھونپڑوں میں تھیں۔اسٹین کہہ رہا تھا ''شوہر جب کسی بیوی کے پاس رات گزارنے جاتا ہے تو دروازے پر لاٹھی سے آواز دیتا ہے۔ بیوی آواز سن کر پنجوں کے بل چل کر اُس کے قریب آتی ہے۔میاں بیوی الگ الگ جھونپڑوں میں رہتے ہیں۔اگر کسی کو اولاد نہیں ہوتی تو لڑکے کی ماں اپنے مرے ہوئے رشتہ داروں سے باتیں کر کے فیصلہ کرتی ہے کہ خرابی اُس کے بیٹے میں ہے یا بہو میں۔ پھر مٹی میں دونوں کا قارورہ بیج کے ساتھ رکھتی ہے جس کا پودا جلد نکل آتا ہے وہ صحیح ہوتا ہے۔ بیوی کا پودا نہیں اُگتا تو شوہر دوسری شادی کر لیتا ہے۔اگر شوہر کا پودا نہیں اُگتا تو اُس کے غائبانے میں اس کا بھائی اس کی بیوی کو حاملہ کرتا ہے۔ یہ بات شوہر سے راز میں رکھی جاتی ہے۔'' اتنی عجیب داستان سن کر اسے محسوس ہوا تھا جیسے یہ لوگ Alien ہوں۔ یہ گاؤں اس زمین پر نہیں کسی اور ہی سیارے پر ہو۔ وہ ششدر کھڑی اسٹین کی باتیں سن رہی تھی جسے یقین کر لینا آسان نہ تھا۔ ذولو گاؤں میں سب قدرت کی پناہوں میں رہ رہے تھے۔بجلی کی جگہ آگ جلاتے تھے۔اسٹین کی اجازت سے وارث، پروین اور فراز ایک جھونپڑے کے اندر داخل ہوئے تھے۔ جھونپڑے کا دروازہ ایک گول سوراخ تھا جس سے جھک کر ہی اندر جانا ممکن تھا۔ ایک وقت میں ایک ہی شخص کے اندر جانے کی گنجائش تھی۔اندر پھوس کا بستر تھا اور لکڑی کا تکیہ تھا۔ یہ جھونپڑا اس گاؤں کے معالج کا تھا۔ وہ نصف برہنہ اندر بیٹھا ہوا جڑی بوٹیوں سے دوا تیار کر رہا تھا۔ سامنے ایک لالٹین رکھی ہوئی تھی۔ اسٹین کی ہدایت کے مطابق فراز اور پروین نے اس آدمی کو مسکرا کر ساؤبونا (Sawubona) یعنی ہیلو کہا تھا تو اس نے بھی مسکرا کر جواب دیا تھا۔ان کی یہ ذولو زبان تھی۔اسٹین نے چند ذولو الفاظ یاد کروا دیے تھے۔

اُس نے یہ کہا تھا کہ گاؤں کے سب ڈاکٹر جنگل سے جڑی بوٹیاں لاتے ہیں دوا بنانے کے لیے۔ باہر نکلتے وقت بھی اسٹین کی ہدایت تھی کہ ڈاکٹر کو شکریہ کہنا چاہیے۔ وارث فراز اور پروین نے ذولو زبان کا یہ لفظ۔۔۔ نگیابونگا (Ngiyabonga) یعنی شکریہ کہا تھا۔۔۔ اور پھر سلاسا گے یعنی خدا حافظ۔ باہر کچھ عورتیں گھاس سے چٹائی بُن رہی تھیں۔۔۔ پروین سے ایک عورت اپنی ذولو زبان میں گفتگو کر رہی تھی۔ اسٹین انگریزی میں ترجمہ کر رہا تھا وہ کہہ رہی تھی ''عورتیں یہاں مختلف رنگوں کے موتیوں کے ہار بنا کر اپنے محبوب کو دیا کرتی ہیں جو محبت کی نشانی ہے'' سب جھونپڑے گول ہوتے ہیں اس لیے بارش کا پانی اندر نہیں جا سکتا ہے کیونکہ چھت بھی گول ہے ڈھلوان والی۔۔۔ ایک گاؤں میں ایک خاندان رہتا ہے جس میں سترہ افراد ہوتے ہیں۔

گاؤں کا ایک بڑا دروازہ ہوتا ہے جس سے صرف مہمان اندر آتے ہیں اور پشت کی طرف چھوٹا دروازہ جس سے گاؤں میں رہنے والے آتے جاتے ہیں۔ ذولو قبیلے کے بچوں کے اسکول الگ ہوتے ہیں کیونکہ وہ تعلیم میں بہت پیچھے ہیں۔

یکا یک ڈھول کی آواز آ رہی تھی۔تقریباً بیس مرد اور عورتیں رقص کرتے ہوئے آ رہے تھے۔ اسٹین نے بتایا تھا جب بھی سیاح اس گاؤں میں آتے ہیں یہ لوگ اپنا قبائلی رقص سیاحوں کے لیے کرتے ہیں تاکہ پیسے کما سکیں۔ بیس منٹ تک اُس قبیلے کا چیف اپنے گروپ کے ساتھ ناچتا اور گاتا رہا تھا۔ بالکل ہی مختلف دنیا تھی۔ مختلف زبان، منفرد انداز، درخت کے ٹوٹے ہوئے تنے پر وہ بیٹھی ہوئی یہ دیکھ رہی تھی اور اُن کی سادہ زندگی کو ترقی یافتہ لوگوں کی پیچیدہ زندگی سے موازنہ کر رہی تھی جن کی الجھی ہوئی زندگی کے دھاگوں کا سرا ہی نہیں ملتا۔ تلاش کرتے کرتے زندگی تمام ہو جاتی ہے۔ الجھنوں میں الجھ الجھ کر۔ زندگی کو آسان بنانے کے لیے جتنی ایجادات ہیں زندگی اتنی ہی مشکل ہوتی جاتی ہے۔ چوہوں کی دوڑ میں سب کی سانسیں پھولتی رہتی ہیں۔ خوب سے خوب تر ہونے کی ہوس میں اور یہ ذولو گاؤں۔۔۔ قناعت کی دنیا۔۔۔ وقت یہاں تھم گیا تھا۔۔۔ اُسے نیویارک کا Black Out یاد آ گیا تھا۔ جب زندگی کا سارا نظام درہم برہم ہو گیا تھا۔ جیسے قیامت آ گئی تھی۔ اگر بجلی نہ ہو تو وہاں زندگی اپاہج ہو جاتی ہے۔ سب کارخانے زندگی کے رک جاتے ہیں اور یہ لوگ کتنے آزاد تھے۔
پروین سوچ رہی تھی سائنس کی ترقی سے فائدے ہیں یا نقصان؟ ٹیکنالوجی کی غلام زندگی کتنی بے بس ہو گئی ہے۔

سیاحوں کا قافلہ وین میں سوآزی لینڈ کے شہر مبابانے (Mbabane) جا رہا تھا۔ یہ شہر دارالسلطنت ہے اس ملک کا۔ اُس کی نظریں باہر گنے اور مکئی کی لہلہاتی دنیا میں کھوئی ہوئی تھیں۔ جو وہاں کے باشندوں کے جینے کا اہم ذریعہ ہیں۔ کہیں کہیں سڑکوں کے کنارے عورتیں اور بچے پتھروں سے بنے ہوئے کرافٹس سجائے ہوئے بیٹھے تھے کہ شاید کوئی خرید لے انہیں۔ یہ سوآزی لینڈ کی خاص چیزیں تھیں جو اور کہیں نہیں ملتیں۔ یہ فنکاری صرف یہیں کی خاصیت ہے۔ مبابانے میں کچھ دیر ٹھہرنا تھا۔ اس شہر میں سوآزی لینڈ کے خوش حال لوگ رہتے ہیں۔ یہاں ہر طرف رنگین مارکٹ تھے جو یہاں کی خاص پہچان یعنی ہاتھ سے بُنی ہوئی باسکٹ، موتیوں کے سامان سے چمک رہے تھے۔ پروین معصوم بچوں کو دیکھ کر دل میں عجیب سی خلش محسوس کر رہی تھی جو اُمید بھری نظروں سے سیاحوں کو تک رہے تھے۔۔۔ فراز نے اُن سے کئی سامان خرید لیے تھے۔ پروین نے بھی باسکٹ اور موتیوں کے ہار خرید لیے تھے۔ اُن بچوں کی آنکھوں کی چمک دیکھ کر ایسا لگا تھا جیسے اُن بچوں نے کوئی ملک فتح کر لیا ہو بادشاہ بن کر۔۔۔ اور ان کی آنکھوں میں خوشیوں کے ہیروں کی چمک کا ذریعہ صرف چند سکے تھے۔
دن ڈھل رہا تھا اور وین سیاحوں کو سمیٹے ہوئے شہر سینٹ لوسیا (St

Lucia) پہنچ گئی تھی۔ کینن نے بتایا تھا کہ ۱۵۵۴ء میں اس شہر کا نام ''سونے کی ریت کی ندی'' تھا۔۔۔ ہر رات ہوٹل کے لاوَنج میں کینن اگلے دن کا پورا پروگرام سیاحوں کو بتادیا کرتا تھا۔ دوسرے دن بہت سویرے اٹھنا تھا۔ Cruise پر سینٹ لوسیا جھیل جانا تھا۔ پو پھٹ رہی تھی۔ خوشگوار ہوائیں اور سنہری کرنیں چہار سو رقصاں تھیں۔ سینٹ لوسیا جھیل کی لہریں نغمہ گر تھیں۔ کروز سیاحوں کو لے کر اس کے سینے پر رواں تھا۔ قدرت کی گود میں۔۔۔ وہ سرشار تھی۔ عجب نشہ تھا۔ عجیب حسین دنیا تھی پانیوں کے سینے پر۔ عجیب احساس تھا جس کا اظہار ناممکن تھا۔ پچاسی کلومیٹر کی سینٹ لوسیا جھیل میں ہزاروں مگر مچھ، ہپو (Hippo)، پرندے اور دوسرے آبی جانور نظر آ رہے تھے اپنی دنیا میں مگن۔

کینن اور یوپا کے ساتھ یہ آخری دن تھا۔ وین میں سیاحوں کو لیے ہوئے یوپا ڈربن ایئر پورٹ کی طرف جا رہا تھا۔ بوڑھے، فربہ، چڑچڑے اور متعصب امریکی نے پھر کینن سے بدسلوکی کی تھی اور وہ اس کی زیادتی کو خاموشی سے برداشت کر گیا تھا۔ اُس امریکن سیاح کو بینک مشین جانا تھا۔ اُس کے لیے کینن نے راستے میں وین روک دی تھی لیکن وہ بینک مشین ہی خراب تھی۔ اس میں کینن کا کوئی قصور نہ تھا پھر بھی وہ امریکی، سفید سیاح، سیاہ کینن پر برس پڑا تھا۔ اس کے لہجے سے تعصب کی بو آ رہی تھی اور نظروں سے حقارت ٹپک رہی تھی۔ پروین کو وہ ایک وحشی درندہ نظر آ رہا تھا۔ فراز کا چہرہ غم وغصے سے سرخ تھا۔ وارث سکتے میں تھے۔ ایک متمول ملک کے باتہذیب اور تعلیم یافتہ شخص کے اندر چھپا ہوا جانور صاف نظر آ رہا تھا اور اُسے اپنی یہ نظم یاد آ رہی تھی۔۔۔

ٹرڈمل (Treadmill)

یہ ہمارے قدم
مستقل چل رہے ہیں ازل سے مگر
ہیں وہیں کے وہیں
ظاہری ایک جنبش ہے بس
فرق اتنا ہے پہلے درختوں کی چھالوں سے، پتوں سے
ڈھکتے تھے تن
اب یہ ریشم کی پوشاک پہنے ہوئے
اور قبائے تمدن میں ہر شاخ حیواں کو
خوں ریز دانتوں کو، پنجوں کو
دُم کو چھپائے ہوئے، تیز رفتار سے
زندگی کی ٹرڈمل پہ ہیں گامزن
ابن آدم ازل سے اسی
نقطۂ ابتدا پر کھڑے بھی ہیں اور
دوڑ میں بھی یہ مصروف ہیں۔۔۔!

ڈاکٹر سید تقی عابدی کا اعزاز

ڈاکٹر اطہر سلطانہ صدر شعبہ اردو کی اطلاع کے بموجب تلنگانہ یونیورسٹی کے وائس چانسلر کے خصوصی حکم کے مطابق ڈاکٹر سید تقی عابدی حال مقیم کینیڈا کو شعبہ اردو تلنگانہ یونیورسٹی کا ''وزیٹنگ پروفیسر'' مقرر کیا گیا ہے۔ ڈاکٹر سید تقی عابدی ایک ممتاز محقق، نقاد، مایا ناز ادیب، شاعر، دانشور اور ماہر تعلیم کی حیثیت سے عالمی شہرت کے حامل ایسے انسان ہیں جن کا شمار اردو ادب کی نہایت بلند قامت شخصیات میں کیا جاتا ہے۔ ڈاکٹر صاحب کی اب تک پینتالیس سے زیادہ تحقیق، تنقید، تاریخ اور شاعری کی کتب منظر عام پر آ چکی ہیں۔ برصغیر کی بہت سی یونیورسٹیوں میں آپ کی تصانیف کے علاوہ توسیعی لیکچرس خطابات ومذاکرات سے استفادہ کیا جاتا ہے۔ علمی، ادبی وتحقیقی کام کے سلسلے میں ڈاکٹر سید تقی عابدی کی مثال اُس روشن ستارے کی مانند ہے جس کا ثانی ملنا مشکل بھی ہے اور محال بھی۔ برصغیر، مشرقِ وسطیٰ، برطانیہ، کینیڈا، امریکہ غرض اردو کی تمام بستیوں میں ڈاکٹر سید تقی عابدی اور اُن کے کارنامے امتیازی مقام کے حامل ہیں۔

تلنگانہ یونیورسٹی کے تمام شعبہ جات میں شعبہ اردو پہلا شعبہ ہے جس کو یہ اعزاز حاصل ہے کہ یونیورسٹی انتظامیہ کی جانب سے پہلا ''انٹرنیشنل وزیٹنگ پروفیسر'' مقرر کیا گیا ہے۔ ڈاکٹر صاحب محترم نے یہ ذمہ داری بغیر کسی معاوضے کے قبول کی ہے اور اسی طرز پر آپ گزشتہ کئی سال سے مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی کے ''وزیٹنگ فیلو'' بھی چلے آ رہے ہیں۔

○

شموئل احمد کا جہانِ فکشن

محمد غالب نشتر
(رانچی، بھارت)

شموئل احمد کا تعلق اردو افسانہ نگاری کے اس عہد سے ہے جب جدیدیت کا رجحان طلوع ہو رہا تھا اور اپنی شعاعیں اردو دنیا پر مسلّط کرنے کے درپے تھا۔ یہ وہی عہد ہے جب علامت و تجرید کو بہ طورِ فیشن برتا جا رہا تھا اور قاری کا رشتہ افسانے سے ٹوٹ رہا تھا۔ شموئل احمد نے ایسے ہی عہد میں افسانہ نویسی کی ابتدا کی ۔ان کی دور اندیشی کہیے یا مصلحت پسندی، انھوں نے کسی تحریک یا رجحان کا تتبع نہیں کیا بل کہ اپنی راہ خود نکالی۔ اس سے ان کو کتنا فائدہ یا نقصان ہوا، یہ الگ مسئلہ اور ادب کے الگ باب کا متقاضی ہے۔ سرِ دست یہ وضاحت ضروری ہے کہ شموئل احمد کا پہلا افسانہ ''چاند کا داغ'' وہاب اشرفی کی ادارت میں نکلنے والا رسالہ ''صنم'' پٹنہ کے شمارہ نومبر۔دسمبر ۱۹۶۲ء میں چھپا۔ سر زمینِ بہار کی مخصوص فضا میں سانس لیتا ہوا یہ افسانہ اس لیے بھی اہم ہے کہ وہاں کے مخصوص الفاظ کو بہ طورِ رعایت اس افسانے میں برتا گیا تھا۔ انھی الفاظ میں ایک لفظ ''لوندا'' کا استعمال انہوں نے'' ٹکڑا'' کے معنی میں کیا تھا جس کا ذکر احمد یوسف نے ''بہار اردو لغت'' میں کیا۔ اس کے بعد شموئل احمد کے افسانے مختلف رسائل کی زینت بنتے رہے لیکن اس معاملے میں انہوں نے احتیاط سے کام لیا۔ یہی وجہ ہے کہ ان کا انتخاب موزوں ہوتا ہے ۔طبیعت کی بے نیازی اور کچھ پیشہ کی مجبوری ایسی رہی کہ انہوں نے تیرہ برس کی خاموشی اختیار کر لی۔ یہی وجہ ہے کہ ان کا پہلا افسانوی مجموعہ '' بگولے'' ۱۹۸۸ء میں قدرے تاخیر سے منظرِ عام پر آسکا جس میں فقط چودہ افسانے شامل ہیں۔ بگولے کے بعد تا ہنوز اُن کے تین اور افسانوی مجموعے اشاعت سے ہم کنار ہو چکے ہیں۔ دوسرا مجموعہ ''سنگھاردان'' ۱۹۹۶ء میں، تیسرا مجموعہ ''القمبوس کی گردن'' ۲۰۰۲ء میں اور آخری مجموعہ ''عنکبوت'' ۲۰۱۰ء میں منظر عام پر آیا ہے۔ چاروں مجموعوں میں کل افسانوں کی تعداد ستائیس تک پہنچتی ہے ۔کچھ مجموعوں میں سابقہ مجموعہ کے نمائندہ افسانے بھی شامل ہیں۔ مثلاً ''عنکبوت'' میں ''القمبوس کی گردن'' کے سابقہ سات افسانے شامل ہیں۔

شموئل احمد کی چالیس سالہ افسانوی زندگی کا بہ نظرِ غائر مطالعہ کیا جائے تو اندازہ ہوگا کہ ان کے افسانے کسی ایک نہج پر مرکوز نہیں ہیں بل کہ دنیا جہان کے مسائل، سیاسی و سماجی حالات اور اسی طرح کے دوسرے مسائل کی بھرپور عکاسی کی گئی ہے۔ یہاں ان کے افسانوں کو چار خانوں میں بانٹا جا سکتا ہے گویا اس صنف کے کوزے میں سمندر کو سمیٹ دیا ہو۔ ان کے پہلی قسم کے افسانوں کا تعلق سیاسی حوالے سے ہے جن میں انہوں نے بالواسطہ اور بلاواسطہ دونوں طریقوں سے طنز کا نشانہ بنایا ہے ۔ان کے ابتدائی دور کے افسانے سیاست پر طنز کی ردا میں لپٹے ہوئے نظر آتے ہیں۔ اس حوالے سے وہ اپنی بات کہنے میں کام یاب ہیں اور کہیں بھی جذباتی ہوتے نظر نہیں آتے جب کہ سیاست ایک ایسا مکروہ شعبہ ہے جس پر خامہ فرسائی کرتے ہوئے بہت سے فن کار جذبات کے رو میں بہہ جاتے ہیں اور افسانویت مجروح ہو جاتی ہے ۔شموئل احمد نے جب افسانہ نگاری کی ابتدا کی تو سیاسی حالات اور اس کے نتیجے میں زبوں حالی کا ذکر شدید طور پر کیا۔ ''چھگمانس''، ''ٹیبل''، ''قصبہ کا المیہ''، ''مرگھٹ''، ''قصبہ کی دوسری کہانی'' اور ''باگمتی جب ہنستی ہے'' جیسی کہانیاں اسی زمرے میں آتی ہیں۔ ان کہانیوں میں کہیں سیاسی حالات کا بے باکانہ نقشا کھینچا گیا ہے تو کہیں سیاست کی رسّہ کشی کا بیان ، کہیں ایک ہی سیاست داں دوسرے کو زیر کرنے کی تدابیر پر غور و خوض کر رہا ہے تو کوئی فساد برپا کر کے اپنا اقتدار قائم کرنے کے درپے ہے ۔مجموعی طور پر ایک سیاست داں جسے ملک کی ترقی کے لیے کوشاں ہونا چاہیے، وہ قصباتی فضا کو مکدّر کیے ہوئے ہے۔ ''قصبہ کا المیہ''، ''قصبے کی دوسری کہانی'' اور ''مرگھٹ'' میں یہی فضا اپنے پر پھیلائے ہوئے ہے جس سے بنی نوعِ انسان خوف زدہ ہے اور ایک دوسرے سے یہی سوال کر رہا ہے کہ آیا مرنے والا اس کا رشتہ دار تو نہیں؟ اگر نہیں ہے تو کیا معلوم اگلی باری اسی کی ہو اور اُسے احساس تک نہ ہو۔ ان افسانوں کا تانا بانا اسی فضا میں بُنا گیا ہے کہ آدمی دہشت کے عالم میں سانس لینے پر مجبور ہے اور کچھ مفاد پرست لوگ یہ دہشت زدہ ماحول بنائے ہوئے ہیں کہ ان کی روزی روٹی کا انتظام اسی پر منحصر ہے۔ ''قصبہ کی دوسری کہانی'' میں ایک شخص یہ ارادہ کرتا ہے کہ وہ جب بھی اپنے قصبے کی باگ ڈور سنبھالے گا، سب سے پہلے امن بحال کرے گا، لوگوں کے دلوں سے خوف و دہشت کو نکال باہر پھینکے گا لیکن جب وہ عملی میدان میں قدم رکھتا ہے تب اسے یہ احساس ہوتا ہے کہ پورا سسٹم ہی کرپٹ ہے۔ وہ افسوس کا اظہار کرتا ہے لیکن اس کے پاس اس کے علاوہ کوئی چارہ نہیں ہے سوائے اس کے کہ وہ بھی اسی ماحول میں ڈھل جائے اور اپنے آپ کو اس کے حوالے کر دے۔ جو شخص وقت اور حالات کی نزاکت کو سمجھتے ہوئے اس ماحول میں ایڈجسٹ نہیں کرتا، وہ ہمیشہ خسارے میں رہتا ہے اور یہ اصول اُس خلیفہ کو اچھی طرح معلوم ہے۔

سیاست پر طنز کی واضح مثالیں افسانہ ''ٹیبل'' اور ''چھگمانس'' میں بھی ہیں۔ ''ٹیبل'' میں تو سرکاری معاملات میں رشوت خوری کے گرم بازار کو موضوع بحث بنایا گیا ہے تو ''چھگمانس'' میں کانگریس اور اس کے سابق حکم راں راجیو گاندھی پر براہ راست طنز ہے۔ افسانے کے عنوان کی بات کریں تو چھگمانس (چھگ + مانُس) کا مطلب ہی ہوتا ہے Sub Human یعنی وہ انسان جو ارتقا کی نچلی سیڑھی پر کھڑا ہو اور جس شخص کا کوئی وجود نہ ہو۔ اس افسانے میں بھاگل پور فساد کا وہ کریہہ منظر پیش کیا گیا ہے جس میں سیاسی جماعتوں کا دخل کلی طور پر تھا۔ سیاست ایسا غلیظ لفظ ہے جس سے ہر ذی شعور شخص پریشان ہے اور ان

کی زبان سے سیاست دانوں کے نام سن کرگالیاں ہی نکلتی ہیں۔پھر بھی سماج کے کچھ ایسے اشخاص ہوتے ہیں جوان کے دام میں آجاتے ہیں اورایسی غلطیاں سرزد ہوجاتی ہیں جن کاخمیازہ انہیں تاحیات بھگتنا پڑتا ہے۔

افسانہ''باگمتی جب ہنستی ہے''میں سیلاب کے بعد ہونے والے نقصانات اورلوگوں کی زندگی متاثر ہونے جیسی کیفیت کو بنیادی حوالہ بنایا ہے۔ انسانیت یہ کہتی ہے کہ ایسے لوگوں کی ممکنہ حد تک مدد کی جائے اورانہیں تمام طرح کی سہولیات مہیّا کرائی جائیں لیکن ایسے حالات میں بھی سیاست داں حضرات لوٹ گھسوٹ سے بازنہیں آتے اوراگر قصبے کا جذباتی نوجوان اس بات کی مزاحمت کرتا ہے تو اسے کچھ تھوڑا بہت دے کرخوش کردیتے اوران کی زبان ہمیشہ کے لیے بندکردیتے ہیں۔''ہریا'' گاؤں کا کڑیل جوان ہے۔اس کے بدن میں گرم خون گردش کررہا ہے۔اس کے جذبات کو سمجھتے ہوئے کامتا پرشاد جی اُسے بلواتے ہیں اورمیٹھی باتوں سے اس کا دل جیت لیتے ہیں اور یہ کہتے ہیں:

''ہری بابو......آپ جیسے سجگ نوجوان کی دیش کو ضرورت ہے''۔

''ہری بابو......''

ہریاکے کانوں میں ہری بابو کالفظ عجیب کیفیت پیدا کررہا ہے۔ جیسے کامتا پرشاد جی دیسی مشین میں ولایتی پرزے لگارہے ہوں۔

''ہری بابو۔تھوڑی بہت چوری تو یہ لوگ کرتے ہی ہیں......''

کامتا پرشاد مسکراکر کہتے ہیں۔

ہریاچپ ہے۔اب کیا کہے؟ وہ ہریاسے ہری بابو بن گیا ہے۔

''ویسے بی۔ڈی۔او آدمی اچھا ہے۔آپ کی بھی مدد کرے گا''۔

ہریاحیران ہے کہ یہ سب کیا ہورہا ہے وہ اپنے ہی اندر سمندر کی موج میں غوطہ زن ہے کہ کیاوہ بھی دوسرے عیار ومکار لوگوں میں شامل ہوجائے گا یاسابقہ دنوں کی طرح اپنی اصلیت پرقائم رہے گا لیکن حالات ایسے بن گئے ہیں کہ''ہریا'' کے لیے اپنی شناخت بچانا بھی مشکل ہورہا ہے بالآخروہ ''ہری بابو'' کی شکل میں دوبارانمودار ہوتا ہے ۔ہری بابو کو قصبے میں پہچان تو مل گئی ہے لیکن اسے اپنے ضمیر کا سودا کرنا پڑا ہے۔اس افسانے میں چھگمانس،کامتا پرشاد کی شکل میں موجود ہے۔

سیاسی حوالوں کی بات کریں تو یہ مناسب ہوگا کہ سردست شموئل کے ان افسانوں کا ذکر بھی کردیا جائے جن میں فسادات کو موضوع بنا کر افسانے کا بیانیہ Narration ملحوظ نظر رکھا گیا ہے۔ان کے دوسرے حصے کا تعلق انہی افسانوں سے ہے جوفسادات کے پس منظر میں رقم کیے گئے ہیں۔خاص طور پر ان افسانوں میں اقلیت کے مسائل کو موضوع بحث بنا کر یہ بات کہی گئی ہے کہ ہندوستان جیسے جمہوری ملک میں ہی ایسے فساد کیوں برپا ہوتے ہیں۔ یہاں شموئل احمد قاری کے ذہن پرایک سوال قائم کرتے ہیں۔ ظاہر ہے اس سوال کا جواب تو ہے لیکن کوئی حل نہیں۔''بہرام کا گھر''اور''بدلتے رنگ''جیسے کا موضوع فساد ہی ہے جوان کے دوسرے مجموعے''سنگھاردان''میں شامل ہیں۔

''بہرام کا گھر''تو Falsh Back کی تکنیک میں ہیں جن کا راوی خود مصنف ہے جو واحد غائب کا صیغہ استعمال کرکے پیڑ اور بہرام کے دوست کی کہانی سناتا ہے۔اقتباسات سے اندازہ ہوتا ہے آگ ہندوؤں نے بھڑکائی ہے اور مسلمانوں کواس کی سزا بھگتنی پڑی ہے۔ان کا قصور صرف اورصرف یہ ہے کہ وہ مسلمان ہیں۔فسادات میں مارے جانے والے لوگوں کی اکثریت وہ ہوتی ہے جوفقط نام نہاد مسلمان ہیں،ان کو بنیادی چیزوں سے بھی کوئی دل چسپی نہیں ہوتی بل کہ اگر نام ہٹادیے جائیں تو کوئی ہندو مسلم کا فرق محسوس نہیں کرسکے گا۔لیکن جب صورتِ حال سنگین ہوتی ہے تو گیہوں کے ساتھ گھُن بھی پس جاتے ہیں۔ بہرام کا گھر امن،سکون اورمحبت کا گہوارہ ہے اسی لیے بڑھیا آخروقت تک بہرام کا گھر دیکھنا چاہتی ہے۔ بڑھیا یہ اندازہ لگانا چاہتی ہے کہ تشدد اورعدم تشدد میں کتنا فاصلہ رہ گیا تھا۔اگر وہ بہرام کے گھر تک پہنچ جاتا تو وہ بچ سکتا تھا۔

افسانہ''بدلتے رنگ''کا منظرنامہ دوسرے فسادات پر لکھے گئے افسانوں سے مختلف اس طور پر ہے کہ اس کا زمان ومکان رکمنی بائی کا کوٹھا ہے اورشہر میں جب بھی دنگا ہوتا ہے تو سلیمان وہی کوٹھا پکڑتا ہے،اس کے ساتھ وہسکی پیتا اوردنگائیوں کوموٹی موٹی گالیاں دیتا ہے۔رکمنی بائی جواُس سے میٹھی میٹھی باتیں کرتی ہے اور پولیس کو''بھڑوی کی جنی'' کہتی ہے۔سلیمان کو مذہب سے کوئی دل چسپی نہیں ہے۔اس کی اپنی Philosphy ہے۔وہ یہی کہتا ہے کہ مذہب آدمی کونہیں جوڑتا ہے جب کہ سلیمان آدمی کو جوڑنے کی بات کرتا تھا۔اس کی بیوی کوان باتوں سے کوفت ہوتی۔جب وہ سلیمان سے ایمان ویقین کی باتیں کرتی تو اُسے یہ حسرت ہوتی کہ کاش !کوئی ایسا آدمی ملے جومذہب کارونانہ روئے بل کہ آدمی کی بات کرے۔لے دے کے رنڈیاں ہی تھیں جوذات پات کے جھمیلے سے آزاد تھیں......سلیمان کو ان کی یہ ادا پسند تھی اسی لیے جب کہیں دنگا ہوتا تو سلیمان......

شہر میں یکا یک دنگے کے آثار نمایاں ہوتے ہیں تو سلیمان کوٹھے کی طرف چل پڑتا ہے لیکن آج وہ محسوس کرتا ہے کہ اس کے سمجھنے میں غلطی ہوگئی ہے۔رکمنی بائی کے دروازے رتن کھڑا ہے۔وہ عاجزی کررہا ہے کہ پلیز مجھے اندر آنے دو،یہی تو ایک جائے امان ہے۔اگر تم نے مجھے پناہ نہیں دی تو میں کہاں جاؤں گا۔کسی طرح سے وہ اندر جانے میں کام یاب ہوجاتا ہے اور یہ راز کھلتا ہے کہ پنچایت نے یہی فیصلہ کیا ہے کہ......ملاحظہ ہو یہ اقتباس:

''اوردفعتاً سلیمان کومحسوس ہوا کہ وہ واقعی کٹوا ہے......اپنے مذہب اورفرقے سے کٹا ہوا...... وہ لاکھ خود کو ان باتوں سے بے نیاز سمجھے لیکن وہ ہے کٹوا......اورسلیمان کوعدم تحفظ کا ایک عجیب سا احساس ہوا......اس نے جلتی ہوئی آنکھوں سے رکمنی بائی کی طرف دیکھا۔وہ اسی طرح ہنس رہی تھی......اور سلیمان کا دل غم سے بھر گیا۔وہ یکا یک اس کی طرف مڑا اوراس کے بازوؤں میں اپنی انگلیاں گڑائیں......رکمنی بائی درد سے کلبلائی......

سلیمان نے بازوؤں کا شکنجہ اور سخت کیا......

رکمنی بائی پھر کلبلائی۔

دفعتاً اس کو محسوس ہوا جیسے رکمنی بائی طوائف نہیں ایک فرقہ ہے......

اور وہ اس سے ہم بستر نہیں ہے......وہ اس کا ریپ کر رہا ہے......

سلیمان کے ہونٹوں پر ایک زہر آلود مسکراہٹ رینگ گئی''۔

اس کے کچھ دیر بعد رکمنی بائی باتھ روم میں گئی سلیمان کو اپنا دم گھٹتا سا محسوس ہوا۔ وہ بستر سے اٹھا اور رکمنی با کی ساڑی کو جلدی جلدی اپنے بیگ میں ٹھونسا۔ ایسا کرتے ہوئے اسے طمانیت کا احساس ہوا گویا رنڈی کو، جس کی شناخت ہی ننگا پن ہے، ہمیشہ کے لیے ننگا کر دیا اور ''بھڑوی'' کہہ کر آہستہ سے مسکرایا اور اپنے مکان کی طرف چل پڑا۔

شموئل احمد کے زیادہ تر افسانے بیانیہ Narratology تکنیک کی عمدہ مثالیں ہیں۔ انہوں نے اردو افسانے کے اس عہد میں بھی کہانی کے جوہر کو ملحوظ رکھا جب ہمارے افسانہ نگار جدیدیت کے رو میں بہہ کر بہ طور فیشن تجریدی اور پلاٹ لیس کہانیاں لکھ رہے تھے۔ البتہ جنھوں نے فقط علامات کا استعمال کیا اور کہانی کے جوہر کو بھی ملحوظ رکھا، ان کا فن پارہ تہہ دار ہو گیا۔ شموئل احمد کی ابتدائی کہانیوں کو علامتی تو نہیں البتہ نیم علامتی کہہ سکتے ہیں۔ ایسا ہرگز نہیں ہے کہ انہوں نے علامات Symbols کا استعمال کر کے اقتباسات کو گنجلک بنایا ہے، بل کہ ان کے نیم علامتی افسانوں پر نظر ڈالیں تو خوشی ہوتی ہے کہ ایک فن کار زندگی کے حقائق کو دو زاویوں سے اتنے خوب صورت انداز میں کیسے پیش کر سکتا ہے۔ ''سبز رنگوں والا پیغمبر''، ''ٹوٹی دشاؤں کا آدمی''، ''آخری سیڑھی کا مسافر'' اور ''عکس سیریز'' کی کہانیاں اس کی عمدہ مثالیں ہیں۔ یہ تمام افسانے پہلے مجموعے ''بگولے'' میں شامل ہیں جن کا زمانہ ۱۹۷۴ء سے قبل کا ہے۔ یہ وہ زمانہ ہے جب فن کار کی خواہش ہوتی تھی کہ وہ علامتی و تجریدی افسانے لکھ کر قاری کے دل پر اپنی علمیت کی دھاک بٹھا سکے اور اگر وہ اس طرح کے افسانے نہ لکھے تو وہ حاشیے میں چلے جائیں گے۔ ماحول کے ساتھ ڈھلتے ہوئے شموئل احمد نے بھی نیم علامتی کہانیاں لکھیں لیکن اسے تجرید، اہمال اور اشکال سے ہمیشہ بچائے رکھا۔ اس ضمن میں ان کا اہم افسانہ ''عکس تین'' ہے۔ اس میں ایک عورت کی نفسیات کا خوب صورت تجزیہ کیا گیا ہے جو خود لذتی کا شکار ہے۔ اسی لیے اس کردار کا بس اپنی انگلی پر نہیں ہے۔ ''آتشیں لمحہ'' کا تذکرہ اس افسانے میں اور کئی دوسرے افسانوں میں جگہ جگہ پر آیا ہے۔ یہ شموئل احمد کی اپنی وضع کردہ اصطلاح ہے۔ ان سے قبل اور معاصرین میں اس لفظ کو اتنی خوب صورتی سے کسی نے نہیں استعمال کیا ہے۔ ملاحظہ ہو یہ اقتباس:

''وہ کچھ دیر بارش کے قطروں کا یہ کھیل دیکھتی رہی تھی اور پھر اس نے یکا یک یہ محسوس کیا تھا کہ اس کی انگلیاں اب اپنا روپ بدلنا چاہتی ہیں۔ تب ہی وہ کھڑکی کے پاس سے ہٹ آئی تھی اور پلنگ پر لیٹ گئی تھی۔ پھر ٹھنڈی ہواؤں کا ایک جھونکا کمرے میں آیا تھا اور کھڑکی کے پٹ آپس میں ٹکرائے تھے۔ تب اس نے تکیہ سر سے نیچے ہٹا لیا تھا اور کروٹ سے لیٹ گئی تھی۔ پھر تکیہ کو اس نے سینے پر رکھ کر آہستہ سے دبایا تھا اور آنکھیں بند کر لی تھیں۔ پھر ہوا کا ایک تیز جھونکا کمرے میں آیا تھا اور اس نے محسوس کیا تھا کہ انگلیوں پر اب اس کا بس نہیں ہے۔ وہ بہر حال......اس کی انگلیاں اس کے بس سے باہر ہو گئی تھیں اور پھر نیچے اترنے لگی تھی......''

اس کے بعد وہ سونے کی ناکام کوشش کرنے لگی تبھی عورتوں نے اسے بتایا کہ اس کے گھر میں آگ لگ گئی ہے اور اس کی بہن بھی گھر میں ہی ہے تب اس نے اپنے دل کو منالیا تھا کہ وہ پڑوس میں کھیلنے گئی ہوا اور اس نے یہ عہد بھی نہیں کیا تھا کہ اگر اس کی بہن بچ گئی تو وہ آئندہ اپنی انگلیوں کو سانپ بننے نہیں دے گی۔ یہ تمام کام انسان تنہائی میں کرتا ہے جب کوئی اس کا غم بانٹنے والا نہ ہو لیکن وہ اور بھی تنہا ہو گئی ہے اور کفِ افسوس ملنے کے علاوہ کوئی چارہ نہیں ہے۔

اب ضروری معلوم ہوتا ہے کہ شموئل احمد کے اُن افسانوں کا تذکرہ کیا جائے جن کے حوالے سے ان کی شناخت ہے کیوں کہ ان افسانوں کا تعلق ہمارے اردگرد معاشرے میں پھیلی برائی سے ہے اور یہ حقیقت تو سب پر عیاں ہے کہ دنیا میں جتنے بھی فسادات ہوتے ہیں جتنی بھی خوں ریزیاں ہوتی ہیں، ان سب کا تعلق بھوک سے ہے۔ بھوک ایک جبلّت اور زندگی کا ناگزیر حصہ ہے جس سے ہر شخص نبرد آزما ہوتا ہے۔ یہاں یہ بات وضاحت طلب ہے کہ بھوک کی دو قسمیں ہو سکتی ہیں یا ہوتی ہیں۔ ایک کا تعلق پیٹ سے ہے تو دوسرے کا پیٹھ سے۔ جب دونوں طرح کی بھوک شدت اختیار کر جائے تو انسان صحیح وغلط، حرام وحلال اور مثبت ومنفی پہلوؤں کو نظر انداز کر کے، بھوک کی اس آگ میں کود پڑتا ہے۔ جنس کی بھوک زیادہ خطرناک ہے۔ کوئی شخص جب اس جرم کا ارتکاب کر لے تو پورے معاشرے میں وہ معتوب سمجھا جاتا ہے اور اس کا اثر معاشرہ کے ہر ذی شعور پر پڑتا ہے۔ شموئل احمد کے افسانوں کا بنیادی حوالہ جنس ہی ہے جسے حوالہ بنا کر وہ معاشرہ کی کھوکھلی ریاکاری پر نظر ڈالتے ہیں۔ ان کے بیش تر افسانوں میں جنس کی کارفرمائی نظر آتی ہے'' بگولے''، ''سنگھاردان''، ''ظہار''، ''جھاگ''، ''برف میں آگ''، ''عنکبوت''، ''منرل واٹر'' اور کئی دوسرے افسانے اس کی واضح مثالیں ہیں۔

اردو ادب میں کوئی فن کار جنس کو حوالے کے طور پر استعمال کرتا ہے تو سب سے پہلے اس پر منٹو کی نقالی کا الزام لگتا ہے اور اس کا ادب ثانوی حیثیت اختیار کر جاتا ہے۔ یہاں پر منٹو سے شموئل احمد کا موازنہ مقصود نہیں بل کہ صرف یہ بتانا ہے کہ منٹو کی کہانیاں ایک خاص طبقے کے اردگرد ہی گھومتی ہے جب کہ شموئل احمد نے عام انسانی زندگی میں رونما ہونے والے واقعات کو جو جگہ دی ہے۔ جنس ایک ایسا موضوع ہے کہ قاری متن کے نشیب وفراز میں الجھ کر رہ جاتا ہے اور فن پارہ کی تہہ تک پہنچنے کی زحمت گوارا نہیں کرتا۔ اس لیے ان افسانوں کی تفہیم کے لیے باصلاح قاری کی ضرورت ہوتی ہے جو اس کی تہہ تک پہنچ سکے۔ ایک فن کار کا یہ کمال ہے کہ وہ قاری کی ذہنیت کا خاص طور پر خیال رکھے اور اس کے

ذہن کو بھٹکنے نہ دے۔اتنا اختیار تو ایک فن کار کو ہے ہی۔البتہ انداز الگ ہوسکتا ہے اور مسائل بھی مختلف ہوسکتے ہیں۔ایسا بھی ضروری نہیں کہ فن کار کی تمام چیزیں ایک قاری کو پسند آ ہی جائیں۔

شموئل احمد کے افسانوں میں'' بگولے''ایک ایسا افسانہ ہے جس میں لتیکا رانی اپنی جنسی خواہش کو مٹانے کے لیے کسی بھی مرد کا شکار کرسکتی ہے اور اپنی سہیلیوں سے موازنہ بھی کرتی ہے۔اسے یہ چیز بہت اذیت دیتی ہے کہ اس کی سہیلی کا محبوب اس کا کیوں نہیں ہوسکتا ہے۔جس کے لیے وہ مال ومتاع لٹانے کے لیے پوری طرح سے تیار ہے لیکن اس کام کے لیے بھی سلیقے کی قائل ہے۔کوئی مرد پیار و محبت سے ہر چیز حاصل کرسکتا ہے شرط یہ ہے کہ جلد بازی سے کام نہ لے کیوں کہ وہ محض جنسی آسودگی کے لیے ہی رسم وراہ بڑھاتی ہے۔اس دفعہ جس لڑکے کو اپنے دام میں پھنسایا ہے وہ نادان ہے،اس معاملے میں صفر ہے اور جلد باز بھی۔لتیکا یوں تو فاحشہ ہے لیکن اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ کوئی اسے فاحشہ سمجھے یا رنڈی کی طرح برتاؤ کرے۔یہ عورت کے اَنا کی کہانی ہے اور کل کے لونڈے نے اس کی اَنا پر وار کیا ہے اور یہی وجہ ہے کہ لتیکا رانی اسے باہر بھگا دیتی ہے۔افسانہ''جھاگ''میں یہ اشارہ ہے کہ رشتے مرجھا جاتے ہیں،مرتے نہیں ہیں۔راوی کا پرانا پیار،جسے وہ طالب علمی کے زمانے سے ہی پسند کرتا ہے،اچانک راستے میں مل جاتی ہے اور باتوں باتوں میں راوی اسے گھر آنے کی دعوت بھی دے دیتا ہے۔جس کے بعد راوی کو سخت ندامت ہوتی ہے کہ اس نے بیوی کا اعتبار کھو دیا ہے۔افسانہ''سنگھاردان''میں ایک لوٹی ہوئی ذات جسے ہم طوائف کہتے ہیں،کو افسانے کا موضوع بنا کر یہ بتایا گیا ہے کہ فساد میں رنڈیاں بھی لوٹی گئی تھیں اور برجموہن کو نسیم جان کا سنگھاردان ہاتھ لگا تھا۔جسے زبردستی اس نے حاصل کیا تھا جب کہ نسیم جان کا یہ موروثی سنگھاردان تھا۔سنگھاردان سے نسیم جان کو برجموہن نے اس کی وراثت سے محروم کر دیا ہے۔یہ افسانہ وراثت سے محرومی کا نوحہ ہے اسی لیے وہ بہت گڑگڑائی تھی مگر برجموہن نے دھکے دے کر الگ کر دیا تھا اور وہ سہم گئی تھی۔برجموہن کے گھر میں بیوی اور بیٹیوں نے سنگھاردان کو کافی پسند کیا لیکن کچھ ہی دنوں بعد برجموہن نے محسوس کیا کہ سب کے رنگ ڈھنگ بدلنے لگے ہیں۔بیٹیاں اب چھت پہ تانک جھانک کیا کرتی ہیں اور عجیب عجیب حرکتیں بھی کرنے لگی ہیں۔کئی بار تو برجموہن خود شرمندہ ہو گیا تھا۔اس کے علاوہ برجموہن نے اپنی بیوی کے منہ سے''اوئی دیا''اور''ہائے راجا''جیسے الفاظ آج سے پہلے کبھی نہیں سنے تھے۔آخر میں سنگھاردان نے برجموہن پر بھی اپنا نقش چھوڑ ہی دیا اور برجموہن نے آنکھوں میں سرمہ لگایا۔کلائی پر گجرا لپیٹا اور گلے میں لال رومال باندھ کر نیچے اتر گیا اور سیڑھیوں کے قریب دیوار سے لگ کر بیڑی کے لمبے لمبے کش لینے لگا۔اس ضمن میں طارق چھتاری کا یہ قول زیادہ موزوں معلوم ہوتا ہے۔ان کے بہ قول:

''میرے لحاظ سے شموئل احمد اپنے مقصد میں پوری طرح کام یاب ہیں۔برجموہن نے سنگھاردان لوٹا تھا مگر شموئل احمد نے اردو کے قارئین کو سنگھاردان تحفے میں دیا ہے۔ایک خوب صورت تحفہ۔اور لوٹی ہوئی چیز کے اخلاق پر برے اثرات مرتب ہوسکتے ہیں تحفے میں ملی ہوئی شے کے نہیں''۔

افسانہ''منرل واٹر''کا بنیادی موضوع کنزیومر کلچر کی کہانی،دو طبقوں کے مابین تصادم اور ان کے سوچنے کا انداز ہے۔ایک عام حیثیت کا کلرک جسے منیجر کی جگہ دلی تک کا سفر کرنا ہے اور اسے سفر کا زیادہ تجربہ بھی نہیں ہے۔وہ بھی راجدھانی ایکس پریس سے جس میں بورژوا طبقے کے لوگ سفر کر رہے ہوں گے۔اسے یہ سوچ کر گھبراہٹ ہوئی کہ اس کے پاس تو پہننے کے لیے کپڑے بھی نہیں ہیں۔خیر وہ سفر کے لیے آمادہ ہو جاتا ہے لیکن پورے سفر وہ بورژوا طبقے سے اپنا موازنہ کرتا رہا ہوتا ہے۔اتفاق کی بات یہ کہ اس کے سامنے والی سیٹ پر ایک خاتون بیٹھی ہے جو بورژوا طبقے کی نمائندہ مثال ہے۔اب کلرک اپنا اور اپنے اردگرد کے ماحول کا موازنہ اس عورت سے کرنے لگا ہے۔اس عورت کو دیکھ کر ٹی وی پر دیکھے گئے ایڈ یاد آنے لگے کہ ٹی وی میں ایک عورت لرل صابن کا اشتہار کرتے ہوئے کس ادا سے اپنے بال لہراتی ہے۔رات ہو چلی ہے اور تذبذب کا شکار ہے جو رات کا کھانا کھا کر سونے کی تیاری کرنے لگا ہے۔سامنے والی عورت سے اس کی کوئی بات نہیں ہوئی ہے لیکن رات کے سناٹے میں وہ محسوس کرتا ہے کہ وہ بورژوا عورت اس کے پہلو میں ہے اور وہ بوس وکنار میں مشغول ہے۔خاتون اس پر جھکی ہوئی ہے اور اس نے اپنے بازو پھیلا دیے ہیں اور وہ جیسے سکتے میں آ گیا ہے۔ملاحظہ ہو یہ اقتباس:

''اس عالم میں اس نے بار بار آنکھیں کھول کر خاتون کی طرف دیکھا۔اس کو جیسے یقین نہیں تھا کہ ایک بورژوا حسینہ کا تن سیمیں اس کی بانہوں میں مچل رہا ہے۔

اور ایسا ہی تھا...... بورژوا خاتون کا مرمریں جسم اس کی بانہوں میں تھا،لب و رخسار کے لمس جادو جگا رہے تھے۔ہر لمحہ اس کا استعجاب بڑھ رہا تھا۔یہ لمحہ خود قدرت نے انھیں عطا کیا تھا۔یہ خالص فطری ملن تھا جس میں ارادے کو کوئی دخل نہیں تھا،دونوں انجان تھے''۔

اس طرح کلرک نے محسوس کیا کہ کیبن کے فرش پر سوٹ کیس کا فرق بے معنی ہو گیا ہے۔یہ افسانہ بورژوا اور پرولتاری طبقے کے درمیان فرق کو سمجھنے کا عمدہ نمونہ ہے۔انسان ازلی طور پر ایک ہے لیکن ہمارا سماج ان کے مابین تفریق پیدا کرتا ہے۔

افسانہ''عنکبوت''جدید تکنیک سے پھیلی برائیوں کی طرف واضح اشارہ کرتا ہے۔ایک طرف تکنالوجی کے فوائد ہیں تو دوسری طرف نقصانات بھی۔نوجوان طبقہ اس میں اتنا ملوث ہے کہ وہ سرتا پا ڈوبا ہوا ہے۔افسانہ ''عنکبوت''سائبر کی دنیا سے تعلق رکھتا ہے جہاں سچ اور جھوٹ گڈمڈ ہوتے ہیں اور جنھیں ایک دوسرے سے الگ بھی نہیں رکھا جاسکتا ہے۔سائبر ورلڈ میں پیدا شدہ رشتے کی مثال اس مکڑے کے جالے کی طرح ہے جس کا کوئی مستقل وجود نہیں اور اس کی بنیادی وجہ وہی فریب ہے جس میں ایک شخص کا وجود وہاں وہ نہیں

ہے جو حقیقی دنیا میں ہے یا ہوسکتا ہے۔کیوں کہ یہی صارفی کلچر کا تقاضا ہے۔محمد صلاح الدین انصاری کو بھی چند دنوں سے یہی چسکا لگا ہے کہ وہ حقیقی دنیا سے نظریں چرا کر سائبر سیکس سے لطف اندوز ہوسکے۔یہی وجہ ہے کہ وہ کیفے جاتا ہے لیکن وہاں فری محسوس نہیں کرتا ہے۔خاص طور پر پورن سائٹس سے لطف اندوز ہونا وہاں ذرا مشکل ہے اسی لیے گھر پر ہی کمپیوٹر اور نٹ کا استعمال کرنے لگا ہے لیکن یہاں اس کی بیوی نجمہ اس کام میں دخل اندازی کرنے لگی۔وہ بڑے اشتیاق سے اسکرین کو گھورا کرتی ہے تو صلاح الدین نے دوبارا کیفے کا ہی سہارا لیا ہے تا کہ سکون سے چیٹ کر سکے۔چیٹنگ روم میں داخل ہو کر خود کو ریلیکس محسوس کرے۔مادھری سکیسینہ اس کی فرسٹ سائبر لو LoveCyber ہے جس سے وہ کافی مانوس ہو چکا ہے۔اس کے ساتھ چیٹ کرتے ہوئے وہ یوں محسوس کرتا ہے گویا ایک بستر میں ہم آغوش ہوں۔اسی اثنا نجمہ کے بھی پَر نکلنے شروع ہو گئے ہیں اور اس نے بھی بیوٹی ان چین کے نام سے فیک آئی ڈی بنائی ہے جس کا انکشاف سیکس چیٹنگ کے بعد ہوتا ہے۔راز کھلنے کے بعد اس کے لب سل گئے ہیں جسم کانپنے لگا ہے اور سکتہ طاری ہو گیا ہے۔نجمہ کے جھنجھوڑنے کے بعد وہ اچانک نیند سے جاگتا ہے اور نشے کی حالت میں نجمہ سے یوں مخاطب ہوتا ہے:

''ہائے! بیوٹی ان چین......!اور نجمہ کا چہرہ کالا پڑ گیا۔

''ٹائیگر ووڈ ہیئر''۔وہ چیتے کی چال سے اس کی طرف بڑھا۔وہ گھبرا کے پیچھے ہٹی۔

''کم آن ڈارلنگ! آئی وِل اِن چین یو......!''اس نے نجمہ کا ہاتھ پکڑنا چاہا لیکن اس نے ہاتھ چھڑا لیا۔

''یہ آپ کو کیا ہو گیا ہے؟''

''ہولڈ مائی ڈِک......!''

نجمہ خوف سے کانپنے لگی۔

''فیل اِٹ''۔وہ چیخا۔

''اَن زپ یور برا''۔نجمہ کا گریبان پکڑ کر اس نے زور سے اپنی طرف کھینچا۔بلوز کے بٹن ٹوٹ گئے۔نجمہ کی چھاتیاں جھولنے لگیں......اس نے زور کا قہقہہ لگایا''۔

شموئل احمد نے یہاں صرف ایک پہلو کو دیکھنے کی کوشش کی ہے اور انہیں اس بات کا شدت سے احساس ہے کہ سائبر کلچر سیکس کلچر ہے جہاں تیسری دنیا کا آدمی پانی میں نمک کی طرح گل رہا ہے......ہر کوئی اپنے لیے ایک اندامِ نہانی ڈھونڈتا ہوا......!

اس ضمن میں ان کے آخری اور اہم افسانے کا ذکر نہایت ضروری ہے جس کا تعلق موجودہ سماج سے ہے جسے ہم گلوبل ایج بھی کہہ سکتے ہیں۔اس دور میں انسان نے جتنی بھی ترقی کر لی ہو لیکن انسانی رشتوں کی شکست وریخت کا مسئلہ سب سے زیادہ خطرے میں ہے۔قرابت داری کا پاس ولحاظ ہے نہ رشتوں کے ختم ہونے کا احساس۔اس زمرے میں ان رشتوں کے اقدار بھی پامال ہو گئے ہیں جن کی بنیاد تیقن پہ ہے۔افسانہ ''مصری کی ڈلی'' اسی زبوں حالی کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ہمارا معاشرہ کچھ تو مغربی تہذیب کے اثر سے تنزل کا شکار ہے اور کچھ اپنی ہی خامیاں ہیں اور ان خامیوں نے پوسٹ کولونیئل ایج میں اپنے پَر زیادہ ہی پھیلا رکھے ہیں۔

اس افسانے میں عثمان اور راشدہ ایک رشتے میں بندھے تو ہیں لیکن عثمان کا تعلق برج محل سے ہے اور راشدہ پر ستارہ زہرہ کا اثر ہے۔اسی لیے عثمان شریف طبیعت کا مالک ہے اور راشدہ چلبلی۔ایک ایسا شوہر جو بیوی کے علاوہ دوسری عورتوں کی طرف جھانکتا بھی نہیں۔ویسے تو ہر انسان کے اندر جانوروں کی خصلت ہوتی ہے،وہ خصلت عثمان میں بھی ہے۔وہ شیر یا بھیڑیا تو ہرگز نہیں البتہ خرگوش اور مینا ضرور ہے۔اس کے برخلاف راشدہ چنچل اور پھکڑ ہے۔اسے ہرفن مولا مردوں سے زیادہ دلچسپی ہے جو چھچھورے پن سے محبت کا اظہار کرے اور دوسرے شغل بھی فرمائے۔راشدہ کے اندر شیر اور بھیڑیے والی خصلتیں بھی ہیں۔ان تمام رازوں کا انکشاف عثمان پر اس وقت ہوتا ہے جب ان کے پڑوس میں الطاف نام کا نوجوان نیا نیا وارد ہوتا ہے۔وہ کھڑکی پر کھڑا ہو کر تانک جھانک کرتا اور سگریٹ پیتا ہے تو یہ عادتیں راشدہ پسند کرتی ہے۔دھیرے دھیرے قرابت بڑھتی ہے اور سارے حدود وقوانین کو توڑ کر وہ ایک دوسرے میں ضم ہو جاتے ہیں۔عثمان ان حرکات وسکنات کو اپنی آنکھوں سے دیکھتا بھی ہے لیکن وہ کچھ نہیں کر سکتا۔عورت تریا چرتر کی عمدہ مثال ہے جس کا انکشاف اس وقت ہوتا ہے جب راشدہ ایک غیر محرم الطاف کے ساتھ رات گزارتی ہے اور الطاف کے پوچھنے پر کہ وہ شوہر کو کیا منہ دکھائے گی،کھل کھلا کر ہنس پڑتی ہے۔یعنی اس کے لیے یہ کام معمولی ہے اور اپنے شوہر کو بآسانی جھانسا دے سکتی ہے۔

اس نکتے کو شموئل احمد نے یوں بیان کیا ہے کہ پہلی مرتبہ جب عثمان کے گلے میں مچھلی کا کانٹا پھنستا ہے تو اس کی بیوی خود چاول کا نوالہ بنا کر اسے دیتی ہے تا کہ چاول کے ساتھ کانٹا بھی نکل جائے لیکن جب دوسری بار یہ ہوتا ہے تو عثمان خود سے نوالہ بنا کر گلے سے کانٹا نکالنے پر مجبور ہیں۔اس کا یہ فعل اس بات کی طرف اشارہ کر رہا ہے کہ وہ اب ایسی زندگی پر قناعت کرنے والا ہے جب کہ الطاف صاحب اسی کے بیڈ روم میں آرام فرما رہے ہیں۔

مندرجہ بالا افسانوں کی روشنی میں یہ بات وثوق سے کہی جا سکتی ہے کہ شموئل احمد کا بیانیہ Narration نہایت مربوط ہے اور جہاں وہ جنس کی بات کرتے ہیں تو ایسے موقع پر ان کا کوئی ثانی نہیں۔کرداروں کی نفسیات، منظر کشی اور واقعہ نگاری میں ان کا جواب نہیں۔اس کے علاوہ نجوم کے حوالے سے ان کے افسانوں ''القمبوس کی گردن''،''چھگمانس''،''مصری کی ڈلی'' کو کسی بھی طرح نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔

بگل والا

نند کشور وکرم

(دہلی، بھارت)

مَیں نے کامریڈ غنی جنہیں پنجاب کے سوشلسٹ باباغنی کے نام سے مخاطب کرتے تھے، کبھی نہیں دیکھا لیکن مَیں نے اُن کے بارے میں اتنا سُنا اور پڑھا ہے کہ انہیں کبھی فراموش نہیں کر سکا اور آج بھی جبکہ انہیں اس دنیا سے رخصت ہوئے کئی دہے بیت چکے ہیں، اُن کی جیتی جاگتی تصویر میری نگاہوں کے سامنے گھومتی رہتی ہے اور ایسا محسوس ہوتا ہے کہ وہ ابھی ابھی کہیں سے نمودار ہو کر صور اسرافیل کی طرح اپنا بگل بجا کر برصغیر کے عوام میں بیداری کی ایک نئی روح پھونک دیں گے۔

تحریکِ آزادی کے اس مردِ مجاہد نے اُس دَور میں جب ہم برطانوی سامراج کی زنجیرِ غلامی میں بُری طرح جکڑے ہوئے تھے اور برصغیر کے لاکھوں نوجوانانِ وطن دیش کی آزادی کے لئے ہر طرح کی جان و مال کی قربانیاں دے رہے تھے، ملک و قوم کی ایک ایسے انوکھے انداز سے خدمت انجام دی تھی کہ انہیں یاد کرتے ہوئے آج بھی ہمارا سر عزت و احترام سے جھک جاتا ہے۔

باباغنی پکے سماج وادی تھے اور حصولِ آزادیِ وطن اُن کا نصب العین تھا۔ وہ کوئی رہنما یا قائد نہیں بلکہ ایک عام کارکن تھے جن کے نام سے پنجاب کے عوام ہی نہیں رہنما بھی اچھی طرح روشناس تھے اور لاہور میں تو اُس دَور کا شاید ہی کوئی شخص ہوگا جس نے انہیں شہر کے کسی علاقے میں بگل بجا کر کسی جلسے یا جلوس کے انعقاد کا اعلان کرتے یا دیواروں پر پوسٹر چسپاں کرتے ہوئے نہ دیکھا ہو۔

وہ ایک ایسی شخصیت تھے جو بِنا بگل ادھوری معلوم ہوتی تھی۔ وہ اُس کے بغیر ایک پل بھی نہیں رہ سکتے تھے کیونکہ وہ اسی ہتھیار کی مدد سے برطانوی سرکار کے خلاف آزادی کی جنگ لڑ رہے تھے اور یہ بگل ہمیشہ اُن کی زندگی کا ایک حصہ رہا۔ جب بھی شہر میں برطانوی سرکار کے خلاف کوئی جلسہ یا جلوس منعقد ہوتا تو وہ اپنا بگل بجا بجا کر گلیوں اور بازاروں میں اس کے انعقاد کے وقت اور مقام کا اعلان کرتے پھرتے تا کہ اہلِ شہر کو اس کے بارے میں خبر ہو جائے اور وہ زیادہ سے زیادہ تعداد میں وقتِ مقررہ پر وہاں پہنچ سکیں۔

اُن کے اس بگل کو پولیس والے بڑا خطرناک ہتھیار تصور کرتے تھے۔ اور وہ نہیں چاہتے تھے کہ وہ بگل بجا بجا کر گلی گلی مجاہدینِ آزادی کے جلسے اور جلوسوں کے انعقاد کا اعلان کرتے پھریں۔ اس لئے کئی بار وہ انہیں اس طرح اعلان کرنے سے باز رکھنے کے لئے اُن سے یہ بگل چھین لیتے تھے۔ مگر باباغنی کو بھلا بگلوں کی کیا کمی تھی۔ وہ جس بھی واقف کار کے پاس جا کر نئے بگل کی فرمائش کرتے وہ انہیں نئے بگل کے لئے پیسے فراہم کر دیتا اور وہ دوسرے دن پھر اُسی طمطراق سے بگل بجا کر جلسے جلوسوں کا اعلان کرتے پھرتے۔

ایک بار لاہور میں مظاہرین کے ایک ہجوم کو آگے بڑھنے سے روکنے کے لئے پولیس پوری کوشش کر رہی تھی اور اُن کا سربراہ پولیس افسر گھوڑے پر سوار مظاہرین کو روکنے کے واسطے اُن پر ہنٹر برسا رہا تھا کہ اتنے میں اچانک باباغنی نے کہیں سے نمودار ہو کر اتنے زور سے بگل بجایا کہ پولیس افسر گھوڑے سے چاروں شانے چت زمین پر گر پڑا اور ہر طرف قہقہوں کی آواز گونجنے لگی۔ تب پولیس نے غصے میں آ کر انہیں بگل بجانے کے جُرم میں گرفتار کر لیا اور ساتھ ہی اُن کا بگل بھی چھین لیا۔

باباغنی کی ابتدائی زندگی کے بارے میں کوئی کچھ نہیں جانتا۔ کسی کو معلوم نہیں کہ وہ کہاں کے رہنے والے تھے۔ اُن کے والدین کون تھے؟ وہ کس خاندان سے تعلق رکھتے تھے کیونکہ جب کبھی وہ گرفتار ہوتے اور اُن سے اس سلسلے میں پوچھ تاچھ کی جاتی تو وہ ہمیشہ بندھے ٹکے جواب دیتے۔

جب اُن سے سوال کیا جاتا ـ تمہارا نام کیا ہے؟ تو وہ جواب دیتے۔ ''عبدالغنی'' اس کے بعد پولیس والے پوچھتے۔ ''تمہارے باپ کا کیا نام ہے؟ تو وہ کہتے۔ ''قادر پنڈت'' تب تیسرا سوال کیا جاتا۔ ''تمہاری ذات کیا ہے؟'' اس پر انہوں نے کبھی اپنی ذات سید شیخ یا انصاری وغیرہ نہیں بتائی بلکہ اُن کا جواب ہوتا ''ہندوستانی'' اور تمہاری جائے رہائش؟'' تو وہ جواب دیتے۔ ''بریڈلا ہال لاہور۔''

بریڈلاء ہال سے آج کی نسل شاید واقف نہ ہو اور ہو بھی کیسے سکتی ہے کیونکہ آج اس مرکزِ آزادی کو ایک کولڈ اسٹوریج میں تبدیل کر دیا گیا ہے جبکہ تقسیم ملک سے پہلے لاہور میں یہ جدوجہدِ آزادی کا بہت بڑا مرکز تھا۔ اور یہاں جلسے اور کانفرنسیں منعقد ہوا کرتی تھیں۔ ایک وسیع میدان میں متعدد کمروں پر مشتمل اس عمارت میں ایک کمرہ انقلابیوں کے لئے بھی وقف تھا۔ ملک کے مختلف حصوں سے آنے والے مجاہدینِ آزادی اگر چاہیں تو یہاں قیام بھی کر سکتے تھے۔ باباغنی جن کا یہاں مستقل قیام تھا، پارٹی کے لنگر کے انچارج تھے اور پارٹی کے اراکین کو کھانا فراہم کرنا اُن کے فرائض میں شامل تھا۔

کہا جاتا ہے کہ ایک بار بریڈلا ہال میں صوبائی سوشلسٹ پارٹی کی ایگزیکٹو کی میٹنگ ہو رہی تھی لیکن پارٹی کے پاس اتنا پیسہ نہ تھا کہ تمام مندوبین کے لئے کھانے کا اہتمام کیا جا سکے۔ تب بابا سے استدعا کی گئی کہ وہ کسی طرح سے سب کے لئے کھانا فراہم کریں۔ بابا نے سُنا تو کچھ دیر سوچتے رہے اور اس کے بعد قریب ہی واقع ''داتا گنج بخش'' چلے گئے اور وہاں کے امام صاحب کو اپنے کامریڈ بھائیوں کی مجبوری سے آگاہ کیا۔ امام صاحب نے صورتِ حال

کا اندازہ کرتے ہوئے فوراً اُن کی مدد کے لئے بھکاریوں کے واسطے تیار کئے گئے کھانے میں سے بہت سی چپاتیاں اور بڑی مقدار میں گوشت اُن کے حوالے کر دیا اور اس طرح انہوں نے اپنے کامریڈ ساتھیوں کو کھانا فراہم کیا۔

بگل بجا کر جلسوں کے انعقاد کا اعلان کرنا تو اُن کا نصب العین تھا۔ ویسے اُن کا پیشہ لاہور شہر کے گلی کوچوں میں پوسٹر چپکانا تھا۔ پارٹی کے پوسٹر چپکانا اس کے علاوہ تھا جنہیں چپکاتے ہوئے کئی بار وہ پولیس کے ہتھے بھی چڑھ گئے اور انہیں کئی انسانیت سوز اذیتیں بھی برداشت کرنی پڑیں لیکن پھر بھی انہوں نے پولیس کو کبھی کچھ نہیں بتایا۔ وہ بڑی ہوشیاری سے یہ کام انجام دیتے تھے۔ جب کبھی وہ پولیس کو دیکھ لیتے تو اُلٹا پوسٹر چپکانا شروع کر دیتے۔ جیسے کہ انہیں معلوم ہی نہ ہو کہ پوسٹر میں کیا لکھا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ ایک بار پارٹی کا خفیہ اخبار ''لال ڈھنڈورہ'' چپکاتے ہوئے وہ رنگے ہاتھوں پکڑے گئے۔ پولیس والوں نے تھانے لے جا کر انہیں بڑی اذیتیں دیں اور اُن کے جسم کے مخصوص حصے کا ایک ایک بال تک اکھاڑنے کا غیر انسانی فعل کیا۔ مگر اس کے باوجود بھی پولیس اُن سے کچھ نہ اگلوا پائی۔ وہ یہی کہتے رہے کہ وہ ایک ان پڑھ آدمی ہیں اور انہیں معلوم نہیں کہ ان پوسٹروں میں کیا لکھا ہے۔ انہیں تو یہ پوسٹر ایک نوجوان نے دئے تھے اور ساتھ ہی چپکانے کی اُجرت بھی۔

ایک بار ایک قوم پرست مولوی صاحب گھبرائے ہوئے اُن کے پاس آئے اور کہا کہ ''بابا! محلے کے کچھ مسلم لیگی انہیں بہت پریشان کرتے ہیں اور انہیں جان سے مار دینے کی دھمکی دیتے ہیں۔ اس لئے اُن کے خوف سے انہوں نے اپنے بیوی بچوں کو لاہور سے باہر بھیج دیا ہے اور اپنی جان بچانے کے لئے اِدھر اُدھر چھپ رہے ہیں۔ یہ روداد سنانے کے بعد مولوی صاحب نے بابا غنی سے اس سلسلے میں مدد کرنے کی استدعا کی۔ مولوی صاحب کی پریشانی کا حال سُن کر وہ کچھ دیر اس مسئلے کا حل سوچتے رہے اور پھر انہوں نے مولوی صاحب کو مشورہ دیا کہ اس خطرے سے چھٹکارہ پانے کے لئے وہ اُن کے ہمراہ چلیں اور وہاں دوسرے ساتھیوں کے ساتھ ستیہ گرہ کر کے اپنے آپ کو گرفتاری کے لئے پیش کر دیں۔ اس طرح جیل جانے سے ایک تو اُن کی زندگی خطرے سے محفوظ ہو جائے گی دوسرے مفت میں بڑھیا کھانا بھی ملے گا۔

بابا تحریکِ آزادی میں حصہ لینے کے لئے ہمیشہ تیار رہتے تھے۔ یہاں تک کہ وہ رات کو بھی چارپائی پر بوٹ پہن کر سویا کرتے تھے کہ نہ جانے کب فرض کی انجام دہی کے لئے بُلاوا آ جائے۔ وہ آزادی کی ہر تحریک میں پیش پیش رہے اور متعدد بار جیل گئے حتیٰ کہ پاکستان بننے کے بعد بھی انہیں قید و بند کی صعوبتیں برداشت کرنی پڑیں۔ کہا جاتا ہے کہ وہ پچیس بار جیل گئے جو پاکستان میں کسی سیاسی آدمی کے جیل جانے کا غالباً ریکارڈ ہے۔ جیل جانے کی اُن کی سلور جوبلی پر کچھ دوستوں نے انہیں مبارکباد دی اور مذاق میں کہا ''بابا اب تو آپ بھی لیڈر بن گئے ہیں''۔ تو وہ کچھ تاؤ میں آ کر بولے ''لیڈر اور میں؟ کیا بکواس ہے؟''

اور پھر بولے بھلا میں کیسے لیڈر بن سکتا ہوں کیونکہ لیڈر بننے کے لئے تین 'بی' (B) یعنی ''بنگلہ''، ''بیگم'' اور ''بیوک'' کی ضرورت ہوتی ہے اور ان تینوں میں سے میرے پاس تو ایک بھی نہیں۔

اگست ۱۹۴۷ء میں جب برصغیر آزاد ہوا تو وہ ٹوٹ کر رہ گئے۔ انہیں اس پر اطمینان نہیں ہوا کیونکہ ملک تقسیم ہو کر دو ٹکڑوں میں بٹ گیا تھا اور اُن کے بیشتر ساتھی ہجرت کر کے لاہور سے چلے گئے تھے۔ اور وہ بریڈلاء ہال میں یکہ و تنہا رہ گئے تھے۔ کوئی پرسان حال نہ تھا لیکن انہوں نے نئے حکمرانوں کے ساتھ زندگی بھر مفاہمت نہ کی اور قید و بند کی زندگی گزارتے رہے۔

آج بابا ہم میں نہیں ہیں لیکن برِصغیر کی موجودہ صورتِ حال میں اُن کی یاد بار بار آتی ہے کیونکہ اُن ایسے بے غرض اور مخلص مجاہدین آزادی ہی صورِ اسرافیل کی طرح اپنا بگل بجا کر یہاں کے عوام کی خوشحالی و ترقی کے ساتھ ساتھ دونوں ممالک کے درمیان دوستی اور بھائی چارے کا ماحول پیدا کرنے میں ایک رابطے کے پُل کا کام کر سکتے ہیں جس کی آج کے بحرانی دور میں ہمیں اشد ضرورت ہے۔

'' سقراط کا بندی گھر''

خواجہ خضر جی!

ستیہ پال آنند
(امریکہ)

خواجہ خضر جی، میں نے کب پوچھا تھا آپ سے
چشمۂ حیواں کا رستہ؟
آبِ حیات کو پی کر میں
لافانی ہونے کا داعی کبھی نہیں تھا
بے مصرف، بے مقصد لمبی عمر کا آخر کیا حاصل ہے؟

خواجہ خضر جی!
میں اسکندر ملکِ سخن کا
نکلا ہوا ہوں
ایسے زہر کی کھوج میں جس کو
پی کر میں رہتی دنیا تک
انسانی تاریخ کے صفحوں میں لافانی ہو جاؤں گا
مجھ کو تو سقراط کے بندی گھر کا رستہ دکھلایئے!

❍

طبع زاد ہائیکو

منظر ایوبی
(کراچی)

واہ رے ٹیلی فون
میں ٹھٹھہ وہ سکھر میں
دونوں ترے ممنون

تھر! تیری دھرتی
جس دن بھی کایا پلٹی
سونا اگلے گی

بیچ کلفٹن کے
جو جو نظارے دیکھے
بتلائیں کیسے؟

ہاں ہم نے دیکھی
سچی جیسی لُو میں بھی
یاروں کی مستی

کا ہے کی چنتا
خون جلے گا، گر سوچا
کس سے کیا رشتہ؟

مان ان کا احسان
مائیں جنھوں نے کی قربان
حق پر اپنی جان

❍

منظرنامہ

یوگیندر بہل تشنہ (کینیڈا)

(ایک عام آدمی کی زندگی سے متاثر ہوکر)

وطن سے دُور کچھ لوگ جسے سمجھے ہیں جنّت
کرتا ہوں آشکار اُن پر، اُس جنت کی حقیقت
رہتی ہے بدستور سایہ فگن قرضے کی لعنت
مست خرام چلتی رہتی ہے ٹیکس پہ ٹیکس کی حکمت
ڈاک ٹکٹ پر بھی نہیں چُوکتے ٹیکس لگانے سے یہاں
رہتی ہے ہر شے پہ رونق افروز کسی بھی شکل کی صورت
حد ہی سے گزر جاتے ہیں، جب کاٹتے ہیں پچاس فیصد
ہوتی ہے جب ادا بونس کی رقم عنایت
مزید اُس پر بھی لگتا ہے سال ہونے پہ انکم ٹیکس
عام آدمی کے لیے ہے یہی جنّت کی محبت
جینا بھی نہیں ارزاں، مرنا بھی کہاں ہے ارزاں
تابوت زمین دوز کی بھی رکھی ہے بڑی قیمت
بیمار ہونے پر آرام کرنے کے لیے چاہیے جُرات
کھاؤ گے کیا بھوک کہ بِن کام کہاں ملتی ہے اُجرت

ق

یہاں گھنٹوں کے در پر بیش و کم ہے ہر شخص ملازم
مشرق کی طرح ملتی ہے کہاں ہر شخص کو ملازمت
رہنے نہیں دیتے کچھ بھی ''کھیسے[1]'' میں میرے دوست
ماہانہ کٹتی ہے یہاں کار اِنشورنس کی آڑھت
صورتِ نادیدہ بھرتا ہے مارٹ گیج کی قسطیں
جاں توڑ کئے جاتا ہے! دام سے نکلنے کی صورت
مقروض جیا، مقروض مرا، ہمراز نہ ساتھی
اس باغِ رضواں میں تشنہ، دل آرام بہت یاں حوروں کی صورت

○

[1] جیب

محرومیت

ڈاکٹر جمال نقوی
(کراچی)

جب کھانا کھانے بیٹھتا ہوں
ہر روٹی میں
بھوکا چہرہ
سالن میں
گوشت غریبوں کا
پانی میں
پیاسی تصویریں
کچھ ایسے ابھرنے لگتی ہیں
میں بھوکا ہی اٹھ جاتا ہوں
اور سوچوں میں کھو جاتا ہوں

○

شہر کا شہر ہو گیا ہے اُداس
(سانحۂ آرمی پبلک سکول)

قیصر نجفی (کراچی)

میں نہیں ایک وقفِ حزن و یاس
غم سے ہر شخص کھو چکا ہے حواس

زندگی کی رتوں سے کہہ دو ہمیں
موسمِ مرگ آ گیا ہے راس

وا رہی چشمِ پاسبانِ چمن
اور لہو ہو گئی گلوں کی باس

آہ پیوند خاک بھی نہ ہوئے
پہنا کرتے تھے جو گلوں کا لباس

ہر قدم پر لہو لہو دیکھے
رہ نور دانِ جادۂ احساس

لوٹ لے اے غنیم جاں یہ بھی
دولت غم ہی رہ گئی ہے پاس

آنگنوں کے چراغ بجھ جائیں
ہے یہ فرمانِ بادِ خوف و ہراس

غم کی ایسی چلی ہے اب کے ہوا
شہر کا شہر ہو گیا ہے اداس

○

سوئمبر

ڈاکٹر سید رضی محمد
(میر پور خاص)

یہ لمحہ سچ کا لمحہ ہے
محبت کرنے والوں کو یہ لمحہ جھیلنا ہوگا
یہ ساعت دکھ کی ساعت ہے
اسے تقدیر کی بازی سمجھ کر کھیلنا ہوگا
یہ ایسی راہ ہے، جس میں
تساہل راہ میں آ جائے تو رستہ نہیں ملتا
اگر آئینہ مل جائے بھی تو چہرہ نہیں ملتا
کتابِ دل میں اس الجھن کا حل لکھا نہیں ملتا

تمہیں میں اپنا جزوِ دل سمجھتا تھا
تمہارے ہاتھ میں کل ہار ہوگا اور طلب گاروں کی صف
آرائیاں ہوں گی
کل اپنی عرضیاں آنکھوں میں لے کر جمع ہوں گے سب
بدن کے ولولے ہر حرکت مو سے عیاں ہوں گے

وہاں پر میں نہیں ہوں گا
تمہاری آنکھ کا اس لمحے منظر، میں نہیں ہوں گا
تمہارے ہاتھ کے پھولوں کا محور، میں نہیں ہوں گا
جہاں اپنے پرائے ہوں برابر، میں نہیں ہوں گا
تمنائی اکٹھے ہوں جہاں پر، میں نہیں ہوں گا
نہیں ہوں گا وہاں پر زندگی بھر میں نہیں ہوں گا

○

دل کی دنیا

ڈاکٹر ریاض احمد
(پشاور)

تیرے آنے سے دِل بہل جائے
بات دل کی زباں پہ آ جائے

دل کی دنیا بسی تیرے دم سے
تو جو روٹھے تو دم نکل جائے

تیری چاہت میں ہم رہے گرداں
دل تیرا جانے کب پگھل جائے

تیری فرقت میں دِل اُداس رہے
تیری قربت میں دل سنبھل جائے

پیش کر دی وفا سرِ محفل
تو نہ مانے تو دل دہل جائے

تیری باتیں وہ پیار کے جذبات
انکی یادوں سے دل مچل جائے

ان اداؤں سے یوں نہ دیکھ مجھے
من کی دنیا نہ پھر بدل جائے

ان سے مت رکھ ریاضؔ اُمیدِ وفا
دلبری ان کی گو بدل جائے

○

دوہے

کاوش پرتا پگڑھی
(بھارت)

سکھی بتا کچھ تو مجھے، کیا کیا ہوگی بات
پگلی سر پر آ گئی، پیا ملن کی رات

مدھر ملن کی آس میں، بھاگا میں دن رات
بھاگ کہاں بلوان تھا، بنتی کیوں کچھ بات

اچرج ہے کس بات کا، یہ تو ہے بازار
ہر شے بکتی ہے یہاں، کھلی چھپی سرکار

دنیا پتھر ہو گئی، امیر تو بھی مون
آگ لگی ہے ہر طرف، شور مچائے کون

اندھا ہے ہر راستہ، پگ پگ آدم خور
گھر سے نکلوں کس طرح، جاؤں بھی کس اور

بن منگوائے آ گیا، کھانے کا سامان
آج ہمارے گھر کوئی، آئے گا مہمان

جنم جنم کا ساتھ ہے، ایسا تھا وشواس
لیکن اپنے قول کا، تمہیں نہیں کچھ پاس

بوٹی لے کر آ گئے، پون پتر ہنومانؔ
بوٹی کو لیش مل گیا، خوش ہیں کرپا ندھان

اردو کے دوہے لیے، کیسی اڑی پتنگ
آسمان بھی ہو گیا، اب کتنا خوش رنگ

○

قطعات

سورندر سنگھ بھٹی
(چندی گڑھ، بھارت)

عشق سے کر روشنی پیدا نظر کے واسطے
زندگی بے نُور ہے نُورِ محبت کے بغیر
چُومتی ہے کامیابی پاؤں اہلِ عزم کے
کچھ نہیں مِلتا جہاں میں عزم وہمّت کے بغیر

گداگر اور سادُھو سنت ہیں بھگوان دُنیا میں
بڑی مشکل سے ملتا ہے کوئی انسان دنیا میں
زمانہ بے مُروّت ہے توقع کیجیے کِس کی
ہوس ہے کامراں، بالکل نہیں اِیمان دنیا میں

حسرتِ دیدار تھی چاروں طرف
جلوتِ دِل دار تھی چاروں طرف
بُو نہ تھی دل میں ہوس کی جب تلک
نِکہتِ گُل زار تھی چاروں طرف

دِل میں ہو جلوہ نُمائی کی لگن
اِشتیاقِ دید پیدا کیجیے
داغِ دل سے انتظارِ یار میں
حسنِ ماہِ عید پیدا کیجیے

○

MONSOON SPECIALS

Sariyu Passi

(Chandi Gharh, India)

The heavy drizzling showers,
I was in my dreams for hours .
The sparkling rain drops were falling ,
My dreamworld was calling ,
Water on the roads splashed,
The thunders and the storms flashed.
Cool windy days and the cold nights ,
The dark horrors and the scary sights.
The lazy times,
Some crazy rhymes.
The water crystals on the petals of rose,
When sun shines the crystals glows.
The days of leaning back and listening to sound clips,
On my lap a plate full of potato chips.
When sleeping and dreaming needs no reason,
That's known as the rainy season.

○

Lahore Declaration

Abdal Bela

A one-day national conference on Punjab, Punjabi and Punjabi Language & Culture was held in Lahore in PILAC on 6th February, 2015 under the auspices of World Punjabi Congress. It was attended by a large number of writers, scholars, intellectuals and artists from Lahore and all over Punjab. Lahore declaration from unanimously issued by the participants which is as follows:

1) The government of Punjab as well as the federal government has always shown regrettable negligence for the promotion of Punjabi language and culture. Despite the efforts of WPC directed towards the recognition of Punjabi language at the primary level, the Punjab government has not taken any steps. It was, therefore, demanded by the conference delegates to make Punjabi language as a compulsory subject at the primary level.

2) There is a dire need of establishing first ever Punjabi University in Lahore as repeatedly demanded by WPC. The Punjab government has not shown any cooperation in this respect which is deplorable. It was therefore demanded in the conference to establish a Punjabi University in Lahore.

3) Over 10,000 M.A Punjabi degree holders are unemployed and they have suffered for years at the hands of anti-Punjabi bureaucracy and the criminal neglect of Punjab government.

4) The gathering vehemently condemned various TV channels to ignore Punjabi language and show Punjabi culture in a derogatory way.

5) Punjabi newspapers and journals are denied the proper quota of advertisements by the federal and provincial information departments.

6) The financial assistance to the Punjabi literary bodies is negligible and needs to be enhanced atleast 10 times.

7) There is a need to promote cultural affinity among the provinces that important universities of the four provinces should teach the languages of all the provinces.

8) The curriculum at the college and particularly Master degree level of Punjabi language is faulty, reactionary and bereft of contemporary Punjabi writings. A mafia of non-Punjabi writers or retrogressive Punjabi writers are preparing the textbooks at the college level. At the university level, the curriculum has got to be changed radically because it denies regrettably the true essence of Punjabi heritage, culture and contemporary writings which are essentially forward-looking. It was suggested that a high-level committee at the Punjab level and university level should look into the outdated syllabi and affect radical changes commensurate with the sensibility of progressive Punjabi writings. WPC should be consulted in changing the curricula at different levels.

9) All languages in Pakistan should be declared the national languages of Pakistan. Those national assembly members who voted against the language bill in the house should be condemned. They lack wisdom, vision and historical perspectives.

10) There is a great need to use the social media and the internet and online facilities for the promotion of Punjabi language and culture. Similarly, the English translations of contemporary Punjabi writings should be circulated on the internet.

11) The attitude of publishers is condemnable in respect of publication of Punjabi books. It was urged that they should give more facilities and financial impetus to Punjabi writers.

12) Punjabi film is on decline and proper steps should be taken by the federal government to give financial impetus and other concessions to the filmdom.

13) The propaganda for the division of Punjab by different political parties who are anti-Punjabi language, anti-Punjabi culture smacks of their prejudice against Punjab. It is a demand of feudals, conspirators and chauvinists.

14) There is a tendency on the part of our Punjabi writers that they are mired in the usage of archaic words and they prefer the purist tendencies. Punjabi language has to have new visions, new diction, modern idioms, metaphors and similes and sensibility. If Punjabi is to be popularized and make it acceptable to those resisting it, the Punjabi language should be such which can be easily understood by all shades of society. The tendency to project Punjabi fundamentalism has to be discouraged. The outdated, hackneyed expressions should be replaced by new vocabulary which is not retrogressive because Punjabi language and culture's revivalism is not the need of the hour because it will do harm to the popularization of Punjabi language and culture at all levels.

ایک صدی کا قصہ
ساحر لدھیانوی

دیپک کنول (ممبئی، بھارت)

وہ نام سے ہی ساحر نہیں تھا بلکہ وہ سچ مچ کا جادوگر تھا۔ وہ جس حسینہ پر اپنی ساحرانہ نگاہ ڈالتا تھا تو وہ جان و دل ہار بیٹھتی تھی۔ اس سحر طراز کا اصلی نام عبدالحی تھا 8 مارچ 1921 کو عبدالحی کریم پورہ لدھیانے کے ایک متمول گجر زمیندار گھرانے میں پیدا ہوا۔ اُنکے دادا کا نام فتح محمد اور باپ کا نام فضل محمد تھا۔ انکی ماں کا نام سردار بیگم تھا جو کہ کشمیر نژاد تھیں۔ سردار بیگم کے اپنے شوہر کے ساتھ ازدواجی تعلقات ایک عرصے سے کشیدہ چل رہے تھے۔ 1934 میں سردار بیگم کے سر پر اس وقت بجلی گری جب اُنکے شوہر نے دوسری عورت کو اپنے عقد میں لیا۔ اُس وقت ساحر صاحب کی عمر محض تیرہ برس تھی۔ سردار بیگم نے اپنے شوہر سے مہر یا نان نفقہ کا دعوی نہیں کیا اُسنے اپنے شوہر کے فیصلے کا انتظار کئے بنا خود جا کر اُس سے خلع لے لیا اور وہ سب کچھ چھوڑ چھاڑ کے اپنے بچے کو ساتھ لے کر زندگی کی کٹھن اور پُرخار راہوں کی اور نکل گئی۔ فضل محمد نے بیٹے کی تفویض کو لے کر سردار بیگم کے خلاف عدالت میں کیس ٹھونک دیا۔ سردار بیگم کی مالی حالت کافی خستہ تھی پھر بھی وہ آخری دم تک لڑتی رہی۔ اُسکا شوہر کیس ہار گیا۔ وہ اس ہار سے تلملا اُٹھا۔ اُسنے بیٹے کو اُٹھانے کے لئے اوچھے حربے استعمال کئے۔ وہ اتنا جلبلایا ہوا تھا کہ اپنی مطلقہ بیوی کو نیچا دکھانے کے لئے اپنے بیٹے کی جان لینے سے بھی دریغ نہیں کرتا۔ یہ سردار بیگم تھی جو ڈھال بن کر اپنے بچے کی حفاظت کرتی رہی کیونکہ اُسے فضل محمد کے ارادوں کی بھنک لگ چکی تھی۔ وہ اپنے بیٹے کو ایک پل کے لئے بھی اپنی نگاہوں سے دور نہیں ہونے دیتی تھی۔ جہاں وہ نہیں پہونچ پاتی وہاں وہ اپنے کسی رشتہ دار کو اپنے بچے کی نگرانی پر مامور کر دیتی تھیں تا کہ اُس کا باپ اپنے ناپاک ارادوں میں کامیاب نہ ہو سکے۔

ساحر نے میٹرک تک کی پڑھائی خالصہ ہائی اسکول لدھیانے سے پوری کی۔ وہ ایک محنتی لڑکا تھا۔ اُسنے اُردو اور فارسی مولانا فریاض ہریانوی سے سیکھی۔ میٹرک پاس کرنے کے بعد ساحر نے ستیش چندر دھون کالج میں داخلہ لیا۔ یہیں پر ساحر نے اپنی ادبی صلاحیتوں کا مظاہرہ کیا۔ اُنہوں نے ایسی شعلہ بار تقریریں لکھیں جنہوں نے کالج میں ہلچل مچا دی۔ ساتھ ہی وہ شاعری پر بھی طبع آزمائی کرنے لگے۔ بہت جلد وہ اپنی نظموں اور غزلوں کی وجہ سے کالج میں مقبول ہونے لگے۔ ایک سال کے بعد اُنہیں کالج سے بے دخل کر دیا گیا۔ وجہ یہ تھی کہ اُنہیں پرنسپل کے لان میں ایک لڑکی کے ساتھ رومانس کرتے ہوئے پایا گیا تھا۔ کچھ لوگوں کا کہنا ہے کہ وہ لڑکی امرتا پریتم تھیں مگر یہ سچ نہیں ہے۔ امرتا پریتم بٹوارے کے بعد ساحر کو دلی میں ملیں وہ کبھی لدھیانے میں رہی نہیں۔ وہ کوئی اور لڑکی تھی۔ کچھ لوگوں کا کہنا ہے کہ وہ ایک سکھ لڑکی تھی جس کا نام ایشور کور تھا جس پر ساحر کا جادو چل گیا تھا۔

کہا جاتا ہے کہ ساحر ایک جگہ ٹک کر رہتے نہیں تھے۔ 1943 میں کالج سے نکالے جانے کے بعد وہ لاہور چلے گئے جہاں اُنہوں نے دیال سنگھ کالج میں داخلہ لیا۔ اسی کالج میں اُنہیں ''سٹوڈنٹس فیڈریشن'' کا صدر منتخب کیا گیا۔ یہیں پر اُنہوں نے اپنا پہلا شعری مجموعہ ''تلخیاں'' پورا کیا۔ دو سال تک وہ کسی پبلشر کی تلاش میں مارے مارے پھرتے رہے۔ بالآخر 1945 میں اُنہیں ایک پبلشر ملا جس نے اُنکی کتاب چھاپ لی۔ ''تلخیاں'' نے پورے ملک میں دھوم مچا دی۔ خاص طور سے دانشور طبقے نے اس نونہال شاعر کے کلام کی بھرپور پزیرائی کی۔ مزے کی بات یہ ہے کہ ساحر صاحب تب کالج کے طالب علم تھے۔ گریجویشن پوری کرنے کے بعد اُنہیں چار ادبی پرچوں کا مدیر بننے کا موقع نصیب ہوا۔ یہ پرچے تھے۔ ''ادب لطیف'' ''شاہکار'' ''پریت لڑی'' اور ''سویرا''۔ یہ پرچے ساحر صاحب کی ادارت میں بیحد کامیاب رہے۔ اسی بیچ وہ ''Progressive writers Association'' کے ممبر بنے۔ اُنکے مارکسی نظریات اور ''سویرا'' میں چھپنے والی اُنکی شعلہ بار تحریروں نے اُنہیں آفت میں ڈال دیا۔ حکومت پاکستان نے اُنکے خلاف وارنٹ گرفتاری جاری کر دیا۔ وہ گرفتاری سے بچنے کے لئے لاہور سے فرار ہو کر دلی چلے آئے۔ دلی سے اُنہوں نے مایا نگری بمبئی کا رخ کیا۔ وہ یہ سوچ کر آئے تھے کہ بمبئی کی فلم نگری اُنہیں ہاتھوں ہاتھ لے گی مگر ہوا اسکے اُلٹ۔ اُنہیں کسی نے کام نہیں دیا۔ وہ ایک موسیقار سے دوسرے موسیقار کے گھر کے چکر لگاتے رہے مگر کسی نے بھی اُنہیں پوچھا تک نہیں۔ اسی بیچ ملک کا بٹوارہ ہوا۔ اُنکی والدہ جو لاہور میں تھیں اُنہیں یہ خبر ملی کہ اُنکی والدہ لاپتہ ہو چکی ہیں۔ وہ اپنی ماں سے بے انتہا پیار کرتے تھے۔ یہ خبر سنتے ہی ساحر بمبئی چھوڑ کر لاہور کے لئے روانہ ہوئے۔ وہاں پہونچ کر اُنہیں پتا چلا کہ اُنکی والدہ اُنکے دوست شورش کشمیری کے گھر میں بخیر و سلامت ہیں۔ کچھ روز پاکستان میں گزارنے کے بعد اُنہوں نے یہ فیصلہ لیا کہ وہ پاکستان میں ہی بس جائیں گے۔ خواجہ احمد عباس کو جب یہ خبر ملی تو اُنہیں بڑا افسوس ہوا۔ اُنہوں نے ساحر کے نام ایک کھلا خط لکھا اور اسے اخبار میں اپنے مشہور کالم میں چھاپ دیا۔ اس خط میں عباس صاحب نے سیکولرازم اور ترقی پسندی کا واسطہ دیکر اُن تمام ادیبوں کو ہندوستان واپس آنے کی اپیل کی تھی جو پاکستان میں بس جانا چاہتے تھے۔ اس خط کا دوسرے ادیبوں پر اثر ہوا کہ نہیں ہوا یہ تو معلوم نہیں مگر ساحر پر اس اپیل کا بڑا گہرا اثر ہوا اور وہ اپنی والدہ کو لے کر واپس چلے آئے۔ دلی میں دو تین مہینے گزارنے کے بعد وہ بمبئی کے لئے روانہ ہوئے۔

دوسری بار جب وہ بمبئی آگئے تو وہ اندھیری کی اُسی بلڈنگ میں رہنے

لگے جہاں کرشن چندر اور گلزار مقیم تھے۔ بمبئی آ کر وہ کام تلاش کرنے لگے۔ اس بار قسمت نے اُنکا ساتھ دیا۔ اُنہیں ایک فلم میں گانے لکھنے کا موقع ملا۔ اس فلم کا نام تھا ''آزادی کی راہ پر''۔ اس فلم کے لئے اُنہوں نے چار گانے لکھے۔ یہ فلم باکس آفس پر ناکام رہی اسلئے ساحر کو کوئی کامیابی نہیں ملی۔ ایک بار پھر قسمت نے دغا دی۔ دو سال تک وہ جدوجہد کرتے رہے لیکن کوئی خاطر خواہ کامیابی نہیں ملی۔ اسی بیچ وہ ایس ڈی برمن کے رابطے میں آ گئے۔ یہ وہ دور تھا جب برمن دا کی طوطی بولتی تھی۔ برمن دا جوہر شناس تھے۔ اُنہیں اس نوجواں شاعر میں جودت نظر آئی۔ اُنہوں نے اُن سے فلم ''نوجوان'' کے لئے گانے لکھوائے۔ ان گانوں نے ساحر کی زندگی ہی بدل کر رکھ دی۔ اسی فلم کا یہ گانا۔ ٹھنڈی ہوائیں، لہرا کے آئیں نے ملک بھر میں دھوم مچادی تھی۔ برمن دا کی سحر آگیں موسیقی نے ساحر کے گیتوں کو جاوداں کر دیا تھا۔ آج بھی جب ہم یہ گانا سنتے ہیں تو ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے واقعی ٹھنڈی ہوا کا ایک جھونکا ہمیں چھو کر گزر گیا جس نے روح کے تاروں کو جھنجھنا کر رکھ دیا ہو۔ اسی سال اُنکی ایک اور فلم نے باکس آفس پر تہلکہ مچا دیا۔ اس فلم کا نام ''بازی'' تھا۔ کہا جاتا ہے کہ برمن دا نے ساحر کی ایک غزل ''تدبیر سے بگڑی ہوئی تقدیر بنا دے'' چنی۔ یہ گانا گیتا بالی پر فلمبند کیا گیا تھا۔ گیتا بالی اس فلم میں ایک جپسی لڑکی کا کردار ادا کر رہی تھی۔ برمن دا نے ماحول اور کردار کے حساب سے اس فلم کی دھن بنالی۔ جب ساحر نے گانے کی دھن سنی تو وہ ناراض ہو کے چلے گئے۔ اُنہیں لگا کہ برمن دا نے اُنکی اچھی خاصی غزل کا کباڑہ کر دیا ہے۔ شوٹنگ مکمل ہوئی اور گانے کو ایڈٹ کر کے ساحر صاحب کو جب دکھایا گیا تو ساحر گانا دیکھ کر نہ صرف دنگ رہ گئے بلکہ وہ برمن دا کی ذہانت اور قابلیت کے بھی قائل ہو گئے۔ برمن دا نے سچویشن کے حساب سے جس طرح کی دھن بنائی تھی وہ واقعی بے مثال تھی۔

ساحر نے برمن دا کے ساتھ کئی فلمیں کیں۔ جیسے ''جال''، ''سزا''، ''دیوداس''، ''منیم جی''، ''فنٹوش''، ''ٹیکسی ڈرائیور'' وغیرہ۔ برمن دا کی سحر طراز موسیقی نے ساحر کے گیتوں کو امر کر دیا۔ فلم ''سزا'' کا یہ گانا کوئی بھول سکتا ہے کیا۔ ''تم نہ جانے کس جہاں میں کھو گئے۔ ہم بھری دنیا میں تنہا ہو گئے۔'' لتا منگیشکر کی آواز میں یہ درد بھرا گیت آج بھی سننے والے کی آنکھیں نم کر دیتا ہے۔ اسی طرح طلعت محمود کا گایا ہوا فلم ''دیوداس'' کا یہ گیت۔ متوا۔ لاگے نا جیا'' ماحول پر رقت طاری کر دیتا ہے۔ ایسا لگتا ہے جیسے ساحر نے دیوداس کے دل کی کیفیت نہیں بلکہ اپنے دل کی کیفیت بیان کی ہو۔

فلم ''بازی'' کے بعد برمن دا کے ساتھ ساتھ ساحر بھی گورودت کے ساتھ جڑ گئے۔ گورودت نے اپنے جدوجہد کے ایام میں ایک کہانی لکھی تھی جس کا نام اُنہوں نے ''کشمکش'' رکھا تھا۔ شاید وہ ساحر کی ''تلخیاں'' سے اسقدر متاثر ہوئے تھے کہ جب اُنہوں نے اس کہانی کو فلم کا روپ دینا چاہا تو سب سے پہلے اُنہوں نے ساحر کو بلا کر اُن سے ''تلخیاں'' کے کئی گانے منتخب کر لئے۔ کچھ لوگوں کا کہنا ہے کہ اس کہانی میں کی جدوجہد کے ابتدائی دنوں کا عکس ملتا ہے۔ فلمی نقادوں نے کھل کر اس بات کا اعتراف کیا کہ اس فلم کے بے جان جسم میں ساحر کے گانوں نے جان ڈال دی۔ ساحر کے یہ گانے جب برمن دا کو دھن بنانے کے لئے دئے گئے تو دادا اتنی ثقیل اُردو کو سمجھ نہ سکے۔ اُنہوں نے گورودت سے گیت کار بدلنے کے لئے کہا۔ گورودت نے جواب میں اُن سے جو کہا وہ سن کر برمن دا گورودت کا منہ تکتے رہ گئے۔ گورودت نے برمن دا سے کہا کہ اس فلم کا موسیقار بدل سکتا ہے گیت کار نہیں۔ اب برمن دا کے لئے یہ چیلنج کی بات تھی۔ اُنہوں نے رات دن ایک کیا اور ان گانوں کی دھنیں بنائیں۔ فلم ''پیاسا'' کے گانے اسقدر مقبول ہو گئے کہ ساحر شہرت کی بلندیوں کو چھونے لگے۔ کہا جاتا ہے کہ گانوں کی مقبولیت دیکھ کر ساحر اتنے پھول گئے کہ اُنہوں نے یار دوستوں سے کہنا شروع کر دیا کہ یہ گانے اگر مقبول ہوئے تو صرف اُنکی شاعری کی وجہ سے۔ یہ بات برمن دادا تک پہنچ گئی۔ اُنہیں سن کر بڑا دکھ ہوا۔ اُنہوں نے ساحر کو کہلوا بھیجا کہ وہ اپنا ایک گانا بنا موسیقی کے ہٹ کر کے دکھائیں تو میں مانوں۔ کچھ لوگوں کا کہنا ہے کہ بے پناہ شہرت نے ساحر کو مغرور بنا دیا تھا۔ وہ کسی کو کچھ سمجھتے ہی نہیں تھے۔ وہ اپنے محسن برمن دا کو بھی آنکھیں دکھانے لگے تھے۔ برمن دا بھی بڑے انا پرست تھے۔ اسی انا کی وجہ سے اُنہوں نے راج پاٹ چھوڑ دیا تھا اور فقیرانہ زندگی بسر کرنے کو ترجیح دی تھی۔ اُنہیں ساحر صاحب کے رویے سے اتنا دکھ ہوا کہ اُنہوں نے اُن کے ساتھ کام کرنے سے منع کر دیا۔ اس طرح دو عظیم فن کار ہمیشہ ہمیشہ کے لئے الگ ہو گئے۔

ساحر کے لئے کام کی کوئی کمی نہیں تھی۔ کئی سارے پرڈیوسر اُنکی شاعری کے دیوانے تھے۔ خاص طور سے کامیاب فلمساز بی۔ آر۔ چوپڑہ۔ وہ بنا ساحر کے فلم بنانے کے بارے میں سوچ بھی نہیں سکتے تھے۔ اصل میں وہ اچھا خاصا ادبی ذوق وشوق رکھتے تھے۔ اُنکے برادر اصغر یش چوپڑہ بھی اُردو شاعری کے دلدادہ تھے۔ جب بی۔ آر۔ چوپڑہ ''نیا دور'' بنانے کی تیاریاں کر رہے تھے تو اُنہوں نے ساحر کو اس فلم کے لئے بطور گیت کار سائن کیا اور او۔ پی۔ نیر کو اس کی موسیقی کا ذمہ سونپا گیا۔ ساحر اس بات پر اڑ گئے کہ وہ او۔ پی۔ نیر سے زیادہ معاوضہ لے کر ہی گانے لکھیں گے۔ چوپڑہ اُنکی ضد کے آگے جھک گئے۔ وہ چند روپیوں کے لئے ساحر کو کھونا نہیں چاہتے تھے۔ ساحر نے بھی اُنہیں مایوس نہیں کیا۔ اُنہوں نے اس فلم کے لئے ایک سے بڑھکر ایک گانا لکھا۔ آنا ہے تو آ راہ میں کچھ دیر نہیں ہے۔ بھگوان کے گھر دیر ہے اندھیر نہیں ہے۔ یہ فلم ریلیز ہوئی تو فلم کے ساتھ ساتھ اس فلم کی موسیقی نے بھی دھوم مچادی۔

ساحر اپنے باغیانہ مزاج کی وجہ سے خاصے بدنام تھے۔ ایک بار اُنہوں نے برمن دا سے کہا کہ وہ دھن پر گیت نہیں لکھیں گے بلکہ وہ گیت پر دھن بنائیں گے۔ انڈسٹری میں یہ قاعدہ برسوں سے چلا آ رہا تھا کہ موسیقار پہلے دھن تیار کرے گا۔ پھر اُس پر گیت کار گیت لکھے گا۔ سبھی گیت کار اسی فارمولے کے تحت کام کر رہے تھے۔ حالانکہ وہ اس طرح کی بندش سے ناخوش تھے مگر وہ دبے لفظوں میں اس کا اظہار کرتے تھے۔ کھل کے کوئی بولنے کی ہمت نہیں کرتا تھا۔ یہ

ساحر تھے جنہوں نے بیانگ دہل بغاوت کا بگل بجادیا۔اسی طرح اُنہوں نے برمن دا کے سامنے یہ شرط رکھی کہ وہ تبھی گانا لکھیں گے جب اُنکا معاوضہ لتا منگیشکر سے ایک روپیہ زیادہ ہوگا۔ برمن دا کو طوعاً وکرہاً اُنکی مانگ قبول کرنی پڑی۔

بی۔آر۔چوپڑہ نے جتنی بھی فلمیں بنائیں ، اُنکے گانے ساحر لدھیانوی نے ہی لکھے۔فلم''دھول کا پھول'' کے اس گانے کو بھلا کون بھول سکتا ہے۔''تو ہندو بنے گا نہ مسلمان بنے گا۔انسان کی اولاد ہے انسان بنے گا''۔یہ گانے ساحر جیسا شاعر ہی لکھ سکتا تھا۔اسی طرح فلم''سادھنا'' میں لتا منگیشکر کی آواز میں یہ گانا''عورت نے جنم دیا مردوں کو۔مردوں نے اُسے بازار دیا۔جب جاہا مسلا کچلا۔جب جاہا دھتکار دیا''۔کہا جاتا ہے کہ اس گانے میں اُنہوں نے اُس درد کو کاغذ پر اُتارا تھا جس درد سے اُنکی ماں کو برسوں گزرنا پڑا تھا۔بی۔آر۔چوپڑہ نے ساحر کے ساتھ برسوں تک کام کیا۔فلم''انصاف کا ترازو'' سے وہ ساحر سے الگ ہوگئے اور اُنہوں نے حسن کمال سے اس فلم کے گانے لکھوائے جب کہ یش چوپڑہ نے جو کہ اپنے بڑے بھائی سے الگ ہوئے تھے اور اُنہوں نے اپنی ذاتی فلم کمپنی کھولی تھی۔اُنہوں نے ساحر کا دامن تب تک نہیں چھوڑا جب تک وہ حیات تھے۔یہی ایک بینر تھا جو ساحر کا تا زندگی وفادار رہا۔

ساحر نے ایس ڈی برمن کے علاوہ موسیقار روشن،این دتہ،خیام اور روی کے ساتھ بھی کام کیا۔فلم''پھر صبح ہوگی''،جس کی موسیقی شنکر جے کشن دینے والے تھے کیونکہ راج کپور کی بیشتر فلموں کی موسیقی شنکر جے کشن ہی دیا کرتے تھے۔یہ ساحر تھے جنہوں نے خیام کی سفارش کی اور اس طرح اس فلم کی موسیقی خیام کو سونپی گئی۔خیام نے فلم شیدائیوں کو مایوس نہیں کیا۔اُنہوں نے اس فلم کے لئے ایک سے بڑھ کر ایک دھن تیار کی۔اس فلم کے ٹائٹل سانگ کو بھلا کون بھول سکتا ہے''وہ صبح کبھی تو آئے گی''۔اسی طرح یش چوپڑہ نے ساحر کی شاعری کو فلم ''کبھی کبھی'' میں بھرپور طریقے سے پیش کیا۔

ساحر موڈی آدمی تھے۔میں ایک واقعہ آپ کو سناتا ہوں۔ایک پرڈیوسر ساحر کی شاعری کے دیوانے تھے۔اُن کی یہ دلی تمنا تھی کہ وہ جب فلم بنائیں گے تو ساحر سے گانے لکھوائیں گے۔جب وہ فلم کی تیاریاں کرنے لگے تو ساحر کے گھر پہونچے اور اُن سے گزارش کی کہ وہ اُنکی فلم کے لئے کم سے کم ایک گانا تو لکھیں۔ساحر صاحب نے پہلے تو انکار کردیا مگر جب وہ پرڈیوسر مصر رہے تو ساحر نے اُسے بھگانے کے لئے ایک گانے کے پچیس ہزار روپے کی مانگ کی۔ پرڈیوسر کا والہانہ پن دیکھئے کہ اُسنے جیب سے پچیس ہزار نکالے اور تپائی پر رکھ دئے۔اب کے ساحر لاجواب ہوکے رہ گئے۔بڑی دیر بعد اُنہوں نے پرڈیوسر سے کہا کہ اگر اُنکا موڈ بنا تو اسی تپائی پر اُنکا گانا رکھا ہوگا اور اگر موڈ نہیں بنا تو یہ پیسے جوں کے توں یہاں پڑے ملیں گے۔اُسنے پرڈیوسر کو دو دن کے بعد آنے کے لئے کہا۔پرڈیوسر خوشی خوشی وہاں سے اُٹھ کر چلا گیا۔

دو دن کے بعد جب وہ ساحر سے ملنے اُن کے جوہو والے گھر ''پرچھائیاں'' پر پہونچا تو وہاں اُسے ساحر صاحب نہیں ملے البتہ اُنکی بہن ملی۔اُسنے اُس پرڈیوسر کو پچیس ہزار کی رقم واپس کی جو کہ تپائی پر اُسی جگہ پڑی ہوئی تھی جہاں وہ رکھ کے گیا تھا۔

ساحر کا مزاج لڑکپن سے ہی عاشقانہ تھا۔زندگی میں اُنہوں نے کئی لڑکیوں سے پیار کیا مگر کہیں پر بیل منڈھے چڑھی نہیں۔کہا جاتا ہے کہ سب سے پہلے پریم چودھری نام کی ایک لڑکی سے پیار کیا۔اُسکے بعد ایشر کور سے پیار کیا۔حاجرہ مسرور سے اُنکی منگنی ہوئی جو کچھ دنوں بعد ٹوٹ گئی۔اُس کے بعد لتا منگیشکر اور ساحر کے عشق کے خوب چرچے ہوئے۔کہا جاتا ہے کہ لتا اُنکے گھر آیا جایا کرتی تھیں۔ساحر اُن سے شادی کرنا چاہتے تھے مگر مذہب کی دیواریں آڑے آگئیں۔ساحر نے لتا منگیشکر کی شان میں کئی نظمیں لکھیں۔''تیری آواز'' میں یوں رقمطراز ہیں۔یوں اچانک تری آواز کہیں سے آئی۔جیسے پربت کا جگر چیر کے جھرنا پھوٹے۔یا زمینوں کی محبت میں تڑپ کر ناگاہ آسمان سے کوئی شوخ ستارا ٹوٹے۔دیر تک یوں تری مستانہ صدائیں گونجیں۔جس طرح پھول چٹکنے لگیں ویرانے میں'' ساحر کو پیار کرنا راس نہ آیا۔اُنہوں نے جس جس سے پیار کیا وہ یا تو اُس کے غم میں گھٹ گھٹ کے مرگئی یا اُس سے دور چلی گئی۔ساحر کو پیار کے بدلے مایوسی اور ناکامی کے سوا کچھ نہ ملا۔وہ بھی ایک ناؤ پر سوار نہ رہے۔کبھی امرتا پریتم کے ساتھ پیار کی پینگیں بڑھائیں تو کبھی گلوکارہ سدھا ملہوترہ کے ساتھ دل لگایا۔

امرتا پریتم سے اُنکے تعلقات ہمیشہ شبہ سرخیوں میں رہے۔اسکی وجہ یہ تھی کہ امرتا پنجابی ادب میں ایک خاصا مقام رکھتی تھیں۔امرتا سے اُنکی پہلی ملاقات پریتم پورگاؤں کے ایک مشاعرے میں ہوئی تھی۔پہلی بار دونوں کی آنکھیں چار ہوئیں۔دونوں کے دل میں پیار کے پھول کھلے۔ساحر قبول صورت نہیں تھے۔وہ معمولی سے خدوخال کے مالک تھے۔چپٹی ناک،لمبوترا چہرہ۔چوڑی پیشانی۔چہرہ مہرہ جیسا بھی رہا ہو پر اُنکی جو دو آنکھیں تھیں،اُن میں جادو تھا۔یہ دو آنکھیں مقناطیسی تھیں۔ایک بار جس سے مل جاتی تھیں اُسے اپنے اور کھینچ لیتی تھیں اور اُسے دیوانہ بنا کے چھوڑ دیتی تھیں۔امرتا پریتم بھی اُنکی آنکھوں کے سحر کا شکار ہوگئی۔وہ جب ساحر سے ملیں پہلے سے ہی شادی شدہ تھیں۔اُنکی شادی پریتم سنگھ نامی ایک شخص سے ہوئی تھی۔اصل میں یہ شادی والدین کی مرضی سے بچپن میں ہی طے ہوئی تھی۔امرتا پریتم کی ازدواجی زندگی خوشحال نہیں تھی۔وہ جب ساحر کے رابطے میں آگئی تو دونوں کے بیچ خط وکتابت شروع ہوگئی۔امرتا پریتم دلی میں رہتی تھیں جب کہ ساحر لاہور میں مقیم تھے۔وہ اُسے''میرے شاعر،میرے محبوب،میرے خدا،یا میرے دیوتا'' کے نام سے مخاطب ہوتی تھیں۔یہ ایسی خاموش عشق کی داستان تھی جو بس بے زبانی میں سمٹ کر رہ گیا تھا۔امرتا اپنی آپ بیتی''رسیدی ٹکٹ'' میں لکھتی ہیں کہ ہم جب ایک دوسرے سے ملتے تھے تو کچھ بولتے نہیں تھے۔بس دیر تک ایک دوسرے کو گھورتے رہتے تھے اور نگاہوں نگاہوں سے ایک دوسرے کو اپنے دل کی کیفیت

بیان کرتے تھے۔ ساحر بلا کے سگریٹ نوش تھے۔ وہ جب چلے جاتے تھے تو میں سگریٹ کے یہ ٹکڑے اُٹھا کر اُنہیں اپنے منہ میں رکھتی تھی اور پھر ان ٹکڑوں کو اپنے ہونٹوں سے بھینچ لیتی تھی''۔

ساحر برسوں سے مجرد بن کر جی رہے تھے۔ امرتا اُنکے ساتھ زندگی بھر رہنا چاہتی تھیں۔ یہ ساحر تھے جو اُمید وبیم میں ڈول رہے تھے۔ ایک طرف وہ اپنی ماں کے آغوش کو چھوڑ نا نہیں چاہتے تھے۔ دوسری طرف وہ امرتا کے ساتھ رہنا چاہتے تھے۔ ایک بار وہ اپنی ماں کے ساتھ کہیں جا رہے تھے کہ راستے میں اُنہوں نے امرتا کو دیکھ لیا تو وہ اپنی اماں سے بولے۔''وہ امرتا ہے۔ یہ آپ کی بہو بن سکتی تھی۔'' ساحرامرتا سے پیار تو کرتے تھے مگر اس کا اظہار نہیں کر پا رہے تھے۔ وہ اپنی نظموں اپنی غزلوں میں سب کچھ کہہ جاتے تھے مگر جب امرتا سامنے ہوتی تھی تو وہ ایسی دنیا میں کھو جاتے تھے جہاں خموشیاں نغمے چھیڑتی ہیں اور دھڑکنیں ساز بجاتی ہیں۔ جو بھی ہوا مرتا اُنکے گیتوں کا محور اور محاصل بنی رہی۔ گو کہ ان گیتوں میں ساحر کی مایوسی اور ناکامی صاف جھلکتی ہے۔ جیسے''چلو ایک بار پھر سے اجنبی بن جائیں ہم دونوں۔(گمراہ) محفل سے اُٹھ جانے والو۔(دوج کا چاند) جانے وہ کیسے لوگ تھے جن کو پیار سے پیار ملا۔ ہم نے تو جب کلیاں مانگیں۔کانٹوں کا ہار ملا(پیاسا) وغیرہ۔ وہ پیار کے اس کھیل میں ہمیشہ لاچار رہے۔ اس پریم کہانی کا انت اُس دن ہوا جب امرتا اپنے دوست امروز کے ساتھ بمبئی آ گئی۔ امرتا سے رشتہ توڑ کر اُنہوں نے گلوکارہ سدھا ملہوترہ سے دل لگانے کی کوشش کی مگر یہ سلسلہ بھی زیادہ دنوں تک چل نہیں پایا۔

ایک بار موسیقار جے دیو ساحر سے ملنے اُنکے گھر پر گئے۔ جے دیو نے ایک گندا سا کپ ٹیبل پہ پایا۔ اُنہوں نے ساحر سے کہا۔''یہ کپ دیکھئے تو کتنا گندا ہے۔ آپ اسے دھلواتے کیوں نہیں؟'' جواب میں ساحر بڑے افسردہ لہجے میں بولے۔''ایک بار امرتا گھر پر آئی تھی اور اُس نے اسی کپ میں چائے پی تھی۔''

ساحر نے جوہو ہوٹل کے سامنے ایک بنگلہ خریدا تھا جس کا نام اُنہوں نے''پرچھائیاں'' رکھا تھا۔ ساحر ابتدا سے ہی باغیانہ سوچ رکھتے تھے گھر کی ابتر حالت، والدہ کی لاچاری اور باپ کی بے رخی اور ستم گاری نے اُنکے ذہن پر گہرا اثر چھوڑا۔ اُنہوں نے عام ڈگر سے ہٹ کر شاعری کی۔ فلمی گیت کار جو کہ خدا، حسن اور جام کو اپنی شاعری کا محور ومرکز بنا بیٹھے تھے، یہ ساحر تھے جنہوں نے سماج کی برائیوں کو بے نقاب کیا۔ اُنہوں نے سماج میں پھیلی گند وکثافت پر اخلاق وتہذیب کا لبادہ پہنانے کی بجائے اُن لبادوں کو اٹھا کر پھینک دیا اور اُس حقیقت کو بیان کیا جو ہر چند تلخ اور تکلیف دہ تھی۔ وہ اُس کریہہ اور بدصورت سچائی کو سامنے لانے میں کبھی نہیں جھجکے جسے بیان کرنا دوسرے شاعروں کے بس میں نہیں تھا۔''یہ کوچے یہ نیلام گھر دلکشی کے، یہ لٹتے ہوئے کاروں زندگی کے۔ کہاں کہاں ہے محافظ خودی کے۔ جنہیں ناز ہے ہند پر وہ کہاں ہیں؟'' اتنی تلخ بات کہنے والے ساحر ہی ہو سکتے تھے۔ بقول شخصے ساحر کی شاعری میں فیض احمد فیض کا رنگ جھلکتا تھا۔ ساحر نے جب تاج محل پر ایک نظم لکھی تو وہ بھی عام روش سے ہٹ کے تھی۔''میرے محبوب کہیں اور ملا کر مجھ سے۔ بزم شاہی میں غریبوں کی گزر کیا معنی''۔ اُنہوں نے امارت شاہی کا مذاق اُڑایا تھا۔ ساحر کو 1958 میں فلم''سادھنا'' کے لئے لکھے گانے۔''عورت نے جنم دیا مردوں کو۔ مردوں نے اُسے بازار دیا'' کے لئے فلم فیئر ایوارڈ ملا۔ اسی طرح اُنہیں 1977 میں فلم''کبھی کبھی'' کے گانے''کبھی کبھی میرے دل میں خیال آتا ہے'' کے لئے فلم فیئر ایوارڈ ملا۔

اُنکی آخری فلم''لکشمی'' 1982 میں ریلیز ہوئی۔ وہ اپنی زندگی سے ہمیشہ لاپرواہ بنے رہے۔ وہ مذہب سے دور تھے مگر انسانیت کے قریب تھے۔ زندگی کی تلخیوں کو کم کرنے کے لئے بادہ نوشی کا سہارا لیتے رہے۔ ایک دن سگریٹ نوشی اور بادہ خواری نے اُنکی جان لے لی۔ 25 اُکتوبر 1980 کو اُن پر دل کا دورہ پڑا اور اُنہوں نے اپنے دوست ڈاکٹر آر۔کے۔ کپور کی بانہوں میں دم توڑ دیا۔ گو کہ وہ 59 سال کی عمر میں اس دار فانی سے کوچ کر گئے مگر وہ اپنے پیچھے ان گنت گیتوں کا خزانہ چھوڑ گئے جو اُنہیں رہتی دنیا تک یاد کرنے کے لئے کافی ہے۔

سلام بحضور امام عالی مقامؑ

ہے جو ٹکڑا فاطمہؑ دے جگر دا اس تے سلام
باپ ہے جس دا علی المرتضیٰؑ اس تے سلام
موڈھیاں تے جیس نوں چایا شہ کونینؐ نے
گود دیوچ آپؐ دی جو کھیڈیا اس تے سلام
جو نہ جُھکیا بربّریت تے ظلم دے سامنے
کٹ گیا جو دین لئی وچ کربلا اس تے سلام
جیس نے حق و صداقت دا بلند رکھیا علم
بولیا جس نوک تے وی لا الہٰ اس تے سلام
آسرا دیندا اے جہدا نام ہر مظلوم نوں
جین دا کیتا اے ول جس نے عطا اس تے سلام
قتل کر کے جس نوں اپنی موت مویا خود یزید
کہہ رہی ہے اَج وی ساری فضا اس تے سلام
جیس دا غم بن گیا انور رہِ حق دا نقیب
جیس نے بخشی مرے دل نوں ضیاء اس تے سلام

انور اداس

(ابرار حسین اکبر کی مرتبہ رثائی کلام بزبان پنجابی سے منتخبہ)

صفحات: دو چالیس مجلد، قیمت: ۳۵۰ روپے، دستیابی: مثال پبلشرز، فیصل آباد

رس رابطے

جستجو، ترتیب، تدوین

وقار جاوید (راولپنڈی)

محبی گلزار جاوید، تسلیم۔

دعا ہے کہ صدا گلزار رہو، مہکتے رہو اور ادب کے چمن زار میں مہکتے رہو۔ آپ نے ''چہارسُو'' میں مجھے سرفراز کیا۔ مجھ کملے کو کیا سے کیا بنا دیا۔ تو گلزار میں تیرا شکر گزار۔

میں ہر گز کسرِ نفسی سے کام لیتے ہوئے اپنے آپ کو ایک حقیر، بندہ پُر تقصیر اور ایک فقیر ثابت نہیں کروں گا کہ میں کچھ ایسا حقیر نہیں ہوں، کسی حد تک فقیر ہوں لیکن پُر تقصیر نہیں ہوں۔ میں نے زندگی بھر کوئی کاروبار نہیں کیا، کوئی ملازمت نہیں کی، سرکاری، درباری عہدوں کی پیش کش اگرچہ بہت ہوئی لیکن میں ان زنجیروں میں نہ جکڑا گیا کہ میرے لیے نہ سرکار دربار اور نہ ہی وزارت سفارت میں کچھ لگاؤ ہے۔ میں نے اس عمرِ عزیز کو ادب کے لیے وقف کیا تو کیا بُرا کیا۔ کسرِ نفسی سے کام لینے والے بیشتر ادیب دراصل اپنے آپ کو حقیر ثابت کر کے آپ سے توقع رکھتے ہیں کہ آپ احتجاج کریں گے کہ اجی حضرت یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں، آپ تو ایک مہان ادیب اور شاعر ہیں۔ اور یوں وہ ادیب کورنش بجا لاتے ہوئے کہتے ہیں کہ ''من آنم کہ من دانم'' تو میں اُن میں سے نہیں ہوں۔

میں شبہ طراز کا خصوصی طور پر شکر گزار ہوں کہ وہ ایک کمال کی میرے دل میں اُتر جانے والی افسانہ نگار ہے۔ مجھے افسوس ہے کہ میرے سفرناموں کے حوالے سے پشاور یونیورسٹی سے کسی بھی حیات ادیب پر پی۔ ایچ۔ ڈی کرنے والی خاتون سلمٰی کاشمیری کا مضمون بوجوہ آپ تک رسائی حاصل نہ کر سکا۔ شاہ حسین نے بلکہ مادھو لال حسین نے کہا تھا:

وشاہ حسین۔۔۔ جولاہا۔۔۔ جو آہا سو آہا۔

تو میں بھی شاہ حسین کی مانند ایک لاہوری یہی کہہ سکتا ہوں کہ:

جو میں ہوں، سو میں ہوں!

مستنصر حسین تارڑ (لاہور)

گلزار صاحب، السلام وعلیکم۔

چہارسو کا شمارہ (مارچ۔ اپریل) ابھی میرے ہاتھوں میں ہے جو مجھے ایک تکلیف دہ دنیا سے نکال کر خوبصورت خواب سی دنیا میں لے چلا ہے۔ آپ کا شکریہ۔ مشمولات کے علاوہ اس بار سرورق بہت فکر انگیز ہے جس نے مجھے بے ساختہ کہا کہ آپ کو ابھی لکھوں۔ میں اسے دیکھ رہی ہوں اور سوچ رہی ہوں کہ زندگی کا راستہ کتنے پیچ وخم کے ساتھ، کتنا طویل ہوتا ہے، زندگی سے بھی طویل، ہمارا سفر تو راستے کے درمیان ہی تمام ہو جاتا ہے اور راستہ خود چلتا چلا جاتا ہے۔ نہ جانے کہاں، کتنی دور، اتنی دور کہ پھر نظریں اسے دیکھ بھی نہیں پاتیں۔ زندگانیاں اس پر ساتھ ساتھ چلتی ہیں اور سفر کے طول سے تھک کر کے بعد دیگرے بیچ راستے پر رک کر بچھڑتی جاتی ہیں۔ دور جاتا ہوا سنسان راستہ ساتھ چلتا رہتا ہے۔ اتنے Thought provoking سرورق کے لیے مبارکباد جس نے سوچ کے دروازے کھول دیے۔

تارڑ صاحب کا یہ نمبر انمول ہے۔ ابھی اہم براہ راست میں گُم ہوں۔ چہارسو میں سلسلہ وار ''چند سیپیاں سمندروں سے'' کی اشاعت کی وجہ سے میرے پاس پسندیدگی کے کئی فون اور برقی خطوط آ رہے ہیں۔ اس بار رس رابطے نے بھی خوشی عطا کی۔ خاص کر جناب یوگیندر بہل تشنہ اور ڈاکٹر رینو بہل کی تہہ دل سے ممنون ہوں جنہیں میری کاوش اچھی لگی اور میری حوصلہ افزائی ہوئی۔ مجھے خوشی ہوئی کہ ڈاکٹر رینو بہل نے ڈک گریگری کی سوانح Nigger، جس کا ذکر میں نے اپنی کتاب میں کیا ہے نیٹ کے ذریعہ خرید لی اور انہیں بہت پسند آئی۔ میں جمیلہ شبنم، نوید سروش، سیمیں کرن، اور مہندر پرتاپ چاند سبھی کی بے حد شکر گزار ہوں کہ انہوں نے میری کوشش کو سراہا۔

پروین شیر (کینیڈا)

بھائی گلزار جاوید، السلام علیکم۔

تازہ شمارہ اگر ایک طرف ایک لیجنڈ ادیب، افسانہ نگار، ڈرامہ نگار، اداکار، سیاح اور سفرنامہ نگار مستنصر حسین تارڑ کے قرطاس اعزاز سے مزین تھا تو دوسری جانب موصوف کی ایسی تاریخی تصاویر سے بھی سجا ہوا تھا جن میں گزرتی عمر کی علامات بتدریج نمایاں ہوتی گئی ہیں۔۔۔ مبارکباد!

تارڑ صاحب نے براہِ راست میں کچھ ایسی باتیں بھی کہی ہیں جن سے میرے علم میں اضافہ ہوا ہے۔ اللہ انہیں ایک صحت بخش عمر طویل عطا فرمائے۔ آمین۔ موصوف کے تعلق سے یوں تو ایک سے بڑھ کر ایک مضمون لکھا گیا ہے لیکن مجھے ذاتی طور پر میرے مرحوم دوست ریاض صدیقی کا ''کھیتوں کے سلگتے سہاگ'' بہت زیادہ پسند آیا۔ ''ایک صدی کا قصہ'' دیپک کنول نے کشور کمار کی دوڑتی بھاگتی زندگی کو دوڑتی بھاگتی تحریر کا روپ دیا ہے جو واقعی خوبصورت لگتی ہے۔ گلزار جاوید ایک عرصے کے بعد نظر آئے اور اپنے مخصوص رنگ میں نظر آئے پڑھ کر اس بات پر خوشی ہوئی کہ ابھی تک اُن کے اسلوب کا دم خم بھی ویسا ہے اور لکھنے میں اختصار کی کشش بھی وہی موجود ہے پھر اس افسانے کا عنوان بھی ''اس رزق سے موت اچھی'' اگلے مصرع کی خود بخود تفہیم کرتا نظر آ رہا ہے:

''جس رزق سے آتی ہو پرواز میں کوتاہی''

''زندوں کا دستور'' میں ڈاکٹر شنکر دیال شرما (سابق صدر جمہوریہ ہند) کی مختصر نظم ''عمل کی کتاب'' پڑھ کر بے اختیار مرحوم ماہر القادری کی معرکہ آرا نظم

''قرآن کی فریاد'' یادآ گئی (مجھے مرحوم سے شرفِ باریابی کا فیض بھی حاصل ہے) جواگر چہ ایک پابند نظم کی ہئیت لئے الگ تاثر کی حامل تھی لیکن یہ نظم ایک غیر مسلم کی تخلیق ہوتے ہوئے بھی عجیب کیفیت جذب ویقین پیدا کر رہی ہے۔

غالب عرفان (کراچی)

گلزار صاحب، آداب۔

چہارسو کے تازہ شمارے میں تارڑ صاحب کا گوشہ پسند آیا۔ میں ان کی تخلیقیت کا قائل ہوں لیکن ایک جگہ ان سے اختلاف بھی ہے۔ آپ کے ایک سوال کے جواب میں وہ کہتے ہیں کہ تخلیق کار کو یہ حق پہنچتا ہے کہ وہ اپنے کرداروں کو جب چاہے جہاں چاہے اور جس طرح چاہے استعمال کرے۔ میں نہیں مانتا کردار ایک بار خلق ہونے کے بعد اپنی راہ خود چلتا ہے۔ یہ اس بات پر منحصر ہے کہ خالق نے اس میں بیج کیسے بوئے ہیں۔ تخلیق کار جس طرح چاہے اسے استعمال نہیں کر سکتا۔ وہ اگر اپنے کردار کے ساتھ من مانی کرتا ہے تو تخلیق بوجھل ہو جاتی ہے۔ اللہ میاں کی مثال لیجیے۔ اس کے بندے کہاں اس کے بس میں ہیں۔ تنگ آ کر بدی کی رسی ڈھیلی کرنی پڑی۔

آپ کو میر صاحبنی کہاں مل گئیں؟ ہمارے ہاں حیدر آباد میں پائی جاتی ہیں۔ معاشرے پر آپ گہری نظر رکھتے ہیں۔ رتن سنگھ کی کہانی بہت دلدوز ہے۔ پشاور حادثے کو لے کر شعری تخلیقات بھی اثر رکھتی ہیں۔

شموئل احمد (پٹنہ، بھارت)

بھیا، سدا گل وگلزار خدا رکھے۔

آج ہی وہ ملا جس کا انتظار تھا۔ ''چہارسو'' وہی اپنی روائتی شان کے ساتھ۔ ارے بھئی آپ بھی کمال ہیں بھیا۔ بھلا میں نے اس شمارے کی تیاری میں کیا ہاتھ بٹایا؟ بس سراہنا تو کوئی آپ سے سیکھے۔ مستنصر کے بارے میں کیا کہوں۔ ان کی تحریر مجھے ہمیشہ سے پسند رہی ہے یعنی وہ میرے پسندیدہ لکھاریوں ،قلمکاروں کی فہرست میں شامل ہیں۔ البتہ ایک مزے کی بات میں مستنصر کو اپنے سے چھوٹا سمجھتی تھی مگر میں ان سے ایک سال چھوٹی نکلی اور عمر کی ایک برس چھوٹائی اس عمر میں بھی مجھے مزہ دے گئی۔ چھپنے کی عمر ان کی بھی وہی ہے جو میری ہے مگر میں نے پچھتر برسوں میں کیا کیا، کیا لکھا؟ پانچ افسانوی مجموعے دو ناول اور ایک ''یادنگاری'' مستنصر نے پچھتر برسوں میں ساٹھ خوبصورت کتابیں ہمیں دیں۔ ایک سے ایک بڑھ کر۔ عینی آپا بہت بڑی قلمکار ہیں۔ انہوں نے آپا الطاف فاطمہ نے بہت اچھا لکھا مگر مجرد ہو کر بھی انہوں نے اتنا کام نہیں کیا جتنا مستنصر نے گھر باروالا ہو کر کیا۔ اس کا کریڈٹ یقیناً میمونہ کو بھی جاتا ہے جنہوں نے مستنصر کو گھریلو ذمہ داریوں سے آزاد رکھا۔ عورتوں کی یہی تو مصیبت ہے گھر سنبھالیں، کنبہ سنبھالیں، بچے، شوہر، سسرال، میکا اور اگر بدبختی سے وہ ادیب بھی ہو۔۔۔تو؟

خیر یہ تو الگ بات ہے مستنصر کے قلم میں جو انفرادیت ہے اس کا حسن الگ ہی ہے۔ ہم شخصی اختلاف تو رکھ سکتے ہیں مگر ان کے فن کی تعریف کھلے دل سے کرنی چاہیے۔ اس دور میں فنکار خود کو بڑا فنکار سمجھتا ہے۔ یہ فعل حقیقت سے آنکھ چرانے کے مترادف ہے۔ مجھے خوشی ہے کہ میں مستنصر کے ہمعصروں میں شامل ہوں۔ بطور انسان بھی وہ خوش اخلاق اور ملنسار ہیں۔ مجھے یہ بھی خوشی ہے کہ میرے دور میں ایک ایسا ادیب موجود ہے جو تاریخ ادب کا تابندہ ستارہ بن کر ہمیشہ چمکتا رہے گا۔

ہمارے مزاجوں کا یہ بھی المیہ ہے کہ زندگی میں کسی کی تعریف کرنے سے گریزاں رہتے ہیں۔ بعد از مرگ ایک آدھ ریفرنس کر کے سبکدوش ہو جاتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ مستنصر کو صحت وسلامتی عطا کرے اور وہ یونہی لکھتے رہیں۔ میری طرف سے ان کو اس پذیرائی پر بہت بہت مبارکباد۔ آپ کے لیے بیشمار دعائیں کہ آپ نے بھی بڑی انفرادیت کے ساتھ ''چہارسو'' کی پہچان بنا رکھی ہے۔ ابھی میں نے ''چہارسو'' تھوڑا سا پڑھا ہے۔ مستنصر کا انٹرویو، بائیوگرافی اور ''پاروشنی کا سایہ'' مگر یہ خط چونکہ مجھے آج ہی روانہ کرنا ہے اس لیے قبل از وقت ہی اپنے مختصر تاثرات قلمبند کر رہی ہوں۔ ''چہارسو'' کے اس شمارے میں بہت اچھے اچھے نام ہیں جنہیں پڑھ کر میں یقیناً فیضیاب ہوں گی اور لطف ومسرت سے ہمکنار۔ مگر فیروز عالم کا نام نہ پا کر اچھا نہیں لگا۔ لکھو بھئی۔ کچھ نہ کچھ لکھو۔ آپ کو ہم پڑھنا چاہتے ہیں۔

عذرا اصغر (کراچی)

میرے یار، اردو ادب کے دلدادہ، خوش رہو۔

اس بار حمد باری تعالیٰ نے کچھ اس طور دل ودماغ کو گرفت میں لیا کہ بتلانا مشکل اور تحریر کرنا مشکل تر ہے۔ اوّل چہارسو کی ترتیب، اشاعت اور ترسیل پتہ پانی کرنے کے برابر ہے مگر شخصیات کا انتخاب اُس سے بھی زیادہ کڑا کام ہے جس سے آپ اسی قدر آسانی اور اعلیٰ ذوقی سے گذر جاتے ہیں کہ کبھی رشک اور کبھی حسد کرنے کو جی چاہتا ہے۔ مستنصر حسین تارڑ صاحب کا نام اور کام دونوں دل ودماغ کو روشن کئے ہوئے ہیں ایک بار پڑھنے کے بعد لگا کہ میں اس جہاں سے سرسری گذر گیا ہوں لہٰذا دوبارہ پڑھنا شروع کیا تو اپنی رائے کا خود قائل ہونا پڑا۔ تارڑ صاحب کے قلم میں چیزیں لکھنے کے ساتھ دکھانے کا کرشمہ بھی موجود ہے۔ ناول کا باب، سفرنامے کا حصہ، شفیق الرحمان صاحب کا خاکہ اور براہِ راست میں آپ کے محققانہ سوالات کے مشفقانہ اور مدبرانہ جوابات بہت سے نئے در وبام وا کر گئے۔ مضامین تعداد میں کم لگے مگر معیار میں پورا اُترے۔ ڈاکٹر فیروز عالم کی کمی شدت سے محسوس ہو رہی ہے۔ پروین شیر صاحبہ کی موجودگی اور دلچسپ اندازِ بیاں دل کو ڈھارس دئے ہوئے ہے۔ جب پروین شیر کے قلم سے مجبور و بے بس لوگوں کے حالات پڑھتا ہوں تو دل رونے لگتا ہے۔

''She is Great, The was sher describes''

تقی عابدی صاحب نے بھی حالی محترم کے حوالے سے خوب میلا مارا ہے۔ ہائے کیا لوگ تھے جن کا ذکر عابدی صاحب نے مختصر مضمون میں کر کے کمال ہی کر ڈالا۔ کہانیوں میں ''عرس کملے شاہ'' مزہ دے گیا اگر یہ کہانی سچی ہے تو کرم

صاحب کو اس دریافت پر مبارکباد۔شائستہ عالم کا ''اللہ کا وعدہ'' بھی خوب ہے۔
''دلیر سنگھ ولد شمشیر سنگھ'' بھی دھمیجہ صاحب نے خوب لکھا۔منشی پریم چند کی یاد تازہ کر دی۔کٹھن بھری دھند،گم شدہ لاش،طائرِ لاہوتی بھی کامیاب افسانے ہیں۔

ڈاکٹر یوگیندر بہل تشنہ (کینیڈا)

ڈیئر گلزار جاوید صاحب،سلام مسنون۔

چہارسو کا تازہ شمارہ ملا۔بہت بہت شکریہ۔سخت سردی کے موسم میں خوشگوار ادبی فضا چھا گئی۔ دوستوں سے ملاقات ہوگئی۔ اگر چہ کبھی ملاقات کے امکانات معدوم ہیں۔مگر ان کی تخلیقات کے باعث سخت اپنائیت محسوس ہوتی ہے۔

مستنصر حسین تارڑ پہ گوشہ خوب ہے،آپ ہمارے سینئر قلم کار ہیں اور سفرنامے کو الف لیلیٰ والی پراسرار اور دلچسپ دنیا دی ہے۔یہ بڑی بات ہے کہ سفرنامہ کو ادبی چاشنی سے فکشن کے پہلو میں لے آئے۔نہایت ہی خوش طبع انسان ہیں۔پہلی ہی ملاقات میں گرویدہ کر لیتے ہیں۔Good Listener ہیں۔دوسروں کو زیادہ بولنے کا موقع دیتے ہیں۔زندگی میں اکثر ادیب شعراء خوار رہے۔ ہومر جن شہروں میں بھیک مانگتا پھرا وہی شہر اس پہ فخر کرنے لگے۔یاس یگانہ چنگیزی سے کیا ناروا سلوک کیا اور ساغر صدیقی تھڑوں پہ کمبل اوڑھے کوکین کے ایک سگریٹ کا متلاشی رہتا۔اس دور میں وہ سگریٹ پانچ روپے کا ملتا جبکہ چائے کی چینک ایک روپے کی۔

جانے زمانہ ادیبوں،شاعروں،تخلیق کاروں کو ان کی زندگی ان کے دورِ حیات میں تسلیم کیوں نہیں کرتا۔تارڑ کا گوشہ نکلا ادھر الحمراء نے نیلم احمد بشیر کا گوشہ نکالا۔بہت ہی خوشی ہوئی ہے۔افسانہ نگار کے علاوہ آپ منصف بھی ہیں ادبی منصف!

کشور کمار میرا پسندیدہ گلوکار ہے۔اس کی وفات پر مارے غم کے دفتر نہ گیا بلکہ گھر پہ افسوس کرتا رہا۔جان وین کا افسوس بھی میں نے کیا تھا۔دیپک کنول ہر ماہ ایک عظیم فنکار پہ لکھتے ہیں۔انہیں پشتو محاورہ کے مطابق دونوں ہاتھوں سے سلام کرتا ہوں۔کیا محنت ہے،کیا تحقیق ہے۔یوگیندر بہل تشنہ نے گویا انگریزی ادب کو یوں ڈھالا کہ ترجمہ و تخلیص کا گماں نہیں ہوتا۔ترجمہ بے حد مشکل کام ہے میں نے جارج برکلے کا ترجمہ کرنے کی کوشش کی تھی پھر تائب ہو کے بیٹھ رہا۔

ڈاکٹر شنکر دیال شرما کی نظم ہمارے لیے باعث عبرت ہے اور ڈاکٹر شرما کا وژن قابل تعریف ہے۔ پاکستانی ادیب نہیں جانتا کہ ایران، بھارت، افغانستان اور سری لنکا میں کیا کچھ لکھا جا رہا ہے۔حکمرانوں نے سب پر دشمن کی چھاپ لگا رکھی ہے۔آپ عالمی ادب پیش کر رہے ہیں اور بٹے ہوئے انسانوں کو قریب لا رہے ہیں۔زندہ باد اور شاباش۔

آغا گل (کوئٹہ)

مکرمی گلزار جاوید صاحب،السلام علیکم۔

''چہارسو'' کا تازہ شمارہ مارچ اپریل ۲۰۱۵ء مستنصر حسین تارڑ نمبر موصول ہوا۔اس بار آپ کی جہاندیدہ نظر انتخاب ایک ایسی ادبی و علمی شخصیت پر پڑی ہے جن کا نام گرامی پاکستان کے ہر اُس گھر میں متعارف ہے جہاں پاکستان ٹیلی ویژن یا ''جیو ٹی وی'' کی نشریات دیکھی اور سنی جاتی ہیں۔البتہ اُن کے علمی اور ادبی کام کی وسعت اور گہرائی سے قارئین کو روشناس کرانے کے لیے ''براہِ راست'' کے خوبصورت انداز پر نہ صرف آپ مبارک باد بلکہ ''تمغۂ حسنِ کارکردگی'' کے مستحق ہیں کیونکہ گزشتہ چوبیس سالوں سے یہ اہم ادبی خدمت کا کٹھن کام صرف آپ ہی کا طرۂ امتیاز ہے اور آپ کی نظرِ انتخاب کی داد دینی پڑتی ہے۔

جناب مستنصر حسین تارڑ صاحب کی کامیابی کا راز ان کی انتھک محنت ، ہمہ وقتی بسیار نویسی ، انسانی معاشرے پر گہری نظر، موروثی اور ذاتی خصوصیات اور دردِ دل رکھنے والے حساس مزاج کی مرہونِ منت ہے۔تقریباً نصف صدی پر پھیلے ادبی کام کا احاطہ آسان تو نہیں اور جس پر یونیورسٹی اور کالجوں میں ایم فل اور پی ایچ ڈی تک کی ڈگریاں جاری ہو چکی ہیں البتہ سفرنامہ، ناول، افسانہ اور کالم نگار کے علاوہ ٹی وی میزبان کی جہتوں نے انہیں ایک منفرد مقبول شخصیت کی حیثیت عطا کی ہے۔خصوصاً ان کے ناولوں ''بہاؤ'' اور ''راکھ'' نے ناول نویسی کو نیا اسلوب دے کر بہت مقبولیت کا درجہ دیا ہے اور صدارتی ، وزیراعظم اور دیگر عالمی اعزازات ان کی ادبی خدمات کا بجا اعتراف ہیں۔

''نگری نگری گھومنے والا مسافر'' میں ڈاکٹر سفیر اعوان صاحب نے خوبصورت تکنیکی انداز میں ان کے ادبی کام پر تفصیلی تجزیہ پیش کیا ہے۔

اسی شمارے میں دلچسپ افسانوں مثلاً ''طائرِ لاہوتی''، ''داڑھی''، ''عرس کملے شاہ''، ''کٹھن بھری دھند'' اور ''ادھوری لڑکی'' کے علاوہ خوبصورت نظموں اور غزلوں نے چہارسو کو خوبصورت تر بنا دیا ہے۔

ڈاکٹر ریاض احمد (پشاور)

برادرِ محترم جاوید صاحب،سلام و رحمت۔

''چہارسو'' پابندی سے ملتا ہے۔اس کرم گستری کا کن الفاظ میں شکریہ ادا کروں۔یقین جانئے کہ دعا کے سوا میرے پاس اور الفاظ نہیں ہیں۔خدا آپ کی توفیقات میں اضافہ کرے۔بفضل تعالیٰ ''چہارسو'' کو آپ نے اس مقام پر پہنچا دیا ہے جہاں وہ محتاج ستائش نہیں رہا۔اس پر تو اب یہ کہاوت صادق آتی ہے ''عیاں راچہ بیاں''۔پرچے کا فارمیٹ بدستور دلکش و دلآویز ہے۔کہیں بھی نظر ڈالیں، کرشمہ دامن دل می کشد۔۔۔۔والی کیفیت کا احساس ہوتا ہے۔

ڈاکٹر فیروز عالم کی نہایت اثر انگیز،معلومات افزا اور افسانوی رنگ و آہنگ کی خودنوشت کا اختتام ہو گیا ہے۔قارئین یقیناً ''چہارسو'' میں جاری تجربہ و مشاہدہ کی بصیرت سے معمور نگارشات کے ایک دلچسپ سلسلے سے محروم ہو گئے ہیں۔

ڈاکٹر صاحب سے التماس ہے کہ ''چہارسو'' کے ہم ایسے قارئین آپ کی تحریروں سے مانوس ہو چکے ہیں۔ہمیں اپنے رشحات قلم سے نوازتے رہیے۔

قیصر نجفی (کراچی)

گلزار جاوید صاحب، السلام علیکم۔

''چہارسُو'' کا تازہ شمارہ مارچ اپریل ۲۰۱۵ء مل گیا۔ ''براہِ راست'' پڑھتے ہوئے مستنصر حسین تارڑ کی ایمانداری کا زندہ ثبوت اُن کا یہ جملہ ہے ''تحریر جو ہوتی ہے وہ لکھنے والے کی شخصیت کا آئینہ ہوتی ہے۔'' براہِ راست میں تارڑ صاحب نے آپ کے سوالات کے جوابات بڑی بیبا کی اور حق گوئی سے دیے ہیں اور مجھے یعنی زہیر کنجاہی کو اُن کی حق گوئی اور بیبا کی پر ناز ہے۔ مستنصر حسین تارڑ اور گلزار جاوید کی ادبی خدمات میں کوئی فرق نہیں۔ مستنصر حسین تارڑ اچھی تحریریں پیش کر رہے ہیں اور گلزار جاوید ''چہارسُو'' میں اچھی تحریریں جمع کرنے میں لگے ہیں۔ اللہ کرے زورِ انتخاب اور زیادہ!

''رس رابطے'' لے بیٹھے ہیں ختم ہی نہیں ہوتے باقی رسالہ بھی پڑھنا ہے۔ اچھا دیکھتے ہیں کیا گزرتی ہے دل کے خونِ جگر ہونے تک۔ حیرت کی بات ہے کہ ڈاکٹر انور سدید صاحب نے شگفتہ نازلی سے ملاقات کر لی جبکہ میں یعنی زہیر کنجاہی پچھلے سال جب راولپنڈی سے لاہور پہنچا اور ڈاکٹر انور سدید صاحب سے ملاقات کے لیے گیا تو انہوں نے واضح الفاظ میں فرمایا کہ ''میں نے ملاقات بند کر دی ہے'' میں اُنہیں قدموں لاہور سے واپس راولپنڈی آ گیا۔ ہائے افسوس کہ دیدار نہ کر پائے۔

دونوں حصّوں کی غزلیں اور نظمیں سب پڑھ ڈالیں۔ غزلوں میں کوثر صدیقی کی غزل اور غالب عرفان کا یہ شعر پسند آیا۔

عمل سے علم کو مربوط ہونے دو تو پھر
شعور و فکر میں عرفان کا جہاں گزرے

نظموں میں شبہ طراز کی نظم (دھنک کے جھولنے میں) ظریف احسن کی نظم (میں جب کسی کو۔۔۔) اور عظمیٰ صدیقی کی نظم ''وہ جو میرے گلشن کے پھول تھے'' پسند آئیں۔ اللہ یوں کسی کے پھول بہار آنے سے قبل ہی نہ نوچ لے۔ ''خاک سے افلاک تک'' میں حمد باری تعالیٰ اور نعتِ رسولِ اکرمؐ دونوں خوب ہیں۔ بار بار پڑھنے کو جی چاہتا ہے۔ حمد اور نعت کے دو شعر حاصلِ مطالعہ ہیں:

جسم و جاں جس کی امانت ہے اُسے لوٹایئے
لیکن اُس کی حمد سے غافل نہ ہو بندہ کوئی

جان دے کر یہ دیں جس نے زندہ کیا
آپؐ کے اُس نواسہ پہ لاکھوں سلام

پہلے چار افسانوں میں شائستہ عالم کا افسانہ ''اللہ کا وعدہ'' پسند آیا۔ اللہ کا وعدہ برحق اور سچا ہوتا ہے اسی لیے شائستہ عالم نے اپنا افسانہ اللہ کا وعدہ درج ذیل پیراگراف پر ختم کیا۔ ''میری نظر میں دنیا میں آنے کا مقصد انسان کی انسان سے بھلائی ہے ورنہ اطاعت کے لیے کچھ کم نہ تھے کرّوبیاں، ہمیں صرف خدا کے بندوں کو راضی رکھنا ہے۔ خُدا ہم سے خود ہی راضی ہو جائے گا۔''

منیرہ احمد شمیم کا افسانہ ''ادھوری لڑکی'' کوئی مزیدار نہیں۔ ذرا سی بات تھی جسے افسانہ کر دیا۔ آپ کا افسانہ ''طائر لاہوتی'' پڑھتے ہوئے دل دھک سے رہ گیا۔ جس طرح آپ ''قرطاسِ اعزاز'' کے لیے بہترین شخصیت کا انتخاب کر لیتے ہیں اُسی طرح افسانے کے لیے بھی ایک پُرکشش اور حقیقت پر مبنی افسانے کا پلاٹ تلاش کر لیتے ہیں جس کا ثبوت آپ کے افسانے کا یہ آخری پیراگراف ہے۔ ''میر صاحبنی! اتنی بھولی کیوں بنتی ہو۔ تم اگر یہ سمجھتی ہو کہ نکاح کے دو بول پڑھنے یا پڑھانے سے کاروبار کی نوعیت تبدیل ہو گئی ہے تو تم سخت غلطی پر ہو۔ تم نے اوّل روز سے میر صاحب کی دولت کے عوض خود کو فروخت کر کے اپنی نسل کو غلاظت کے جس کاروبار پر لگایا ہے اُس کا نصب العین حصولِ زر ہے۔ اس کاروبار میں ریاض، سیٹھ صاحب یا عابد کی تمیز وقت کا ضیاع ہے۔''

ڈاکٹر سید تقی عابدی نے کینیڈا سے الطاف حسین حالؔی کی صد سالہ سالگرہ ۱۹۳۵ء پر شائع ہونے والی تحریر کا انتخاب پیش کر کے یہ جتانے کی کوشش کی ہے ''اگر ہم آپس میں رواداری کا برتاؤ کرنے لگیں تو یقیناً ہمارے سارے جھگڑے مٹ جائیں گے۔

''ایک صدی کا قصہ'' میں دیپک کنول نے کشور کمار کے کردار کو خوب اجاگر کیا ہے۔ حق گوئی مشکل کام ہے مگر دیپک کنول نے ''ایک صدی کا قصہ'' میں یہ کام کر دکھایا۔ شاید کشور کمار موجود نہیں اس لیے۔

پروفیسر زہیر کنجاہی (راولپنڈی)

مدیر محترم، سلام مسنون۔

گزشتہ دنوں علم و ادب کی ترسیل برائے لائبریری ایف۔سی کالج اور چیف لائبریرین بشریٰ الماس سے رابطہ خوشگوار اور بالخصوص ''چہارسُو'' کا تحقیقی و تجزیاتی حوالہ باعثِ افتخار و وقار ہے کہ اس کے جملہ قرطاسِ اعزاز نہ صرف طلباء کے لیے بلکہ فیکلٹی ممبران کے لیے بھی ریسرچ لیول پر یکساں معیاری، مفید اور معلومات افزا ثابت ہوں گے انہی تاثرات پہ مبنی ''لیٹر آف تھینکس'' بھی ملا۔ ذہنی آسودگی کے اس تناظر میں ''ویمن ڈے'' کے آس پاس تارڑ صاحب کے قرطاسِ اعزاز سے مرصع و مزین جریدہ دستیاب ہوا تو لگا باعثِ مسرت یہ ہے کہ مسلسل جھلملاتے ناموں اور جگمگاتے حرفوں کی قندیلوں میں اضافہ ہوتا چلا جا رہا ہے۔ ''جنہوں نے مسکرانا سکھایا'' کے عنوان سے تارڑ صاحب نے شفیق الرحمٰن صاحب کی شاداب شخصیت کو اُس کے تمام تر پسندیدہ پہلوؤں کے ساتھ یوں لکھا کہ وہ خاکے میں تبدیل ہوتا گیا جس میں وہ اُن کی ظاہری و معنوی خوبیوں سے انسپائر ہی نہیں، جمالیاتی زاویوں کے معترف بھی جس کے نتیجے میں وہ اس منتظر جزیرے میں اُترنے والے ایسے تخلیق کار ہیں جن کی تحریریں تمام اسرار و سارے سحر یوں بیان کرتی چلی جاتی ہیں کہ پڑھنے والے بھی حیران ہو جاتے ہیں۔ ''براہِ راست'' کے بیشتر سوالات بہت خوب و برجستہ تھے جن میں قاری کے لیے کچھ نیا دریافت کرنے کے امکانات بہت روشن اور جوابات بھی وسیع المطالعے و مشاہدے کی

روشنی میں مختلف تخلیقی جہات کی پروموشن، مارکیٹنگ کے لیے امثال وحوالوں سے واضح کیے گئے جومروجہ اقداراور آج کے ویو پوائنٹ سے ہم آہنگ رہے۔سبھی عمدہ مضامین کے ساتھ بالخصوص ''شالا پردیسی تھیوے''ایک اور پُر لطف سفرنامے کی پُر خلوص خواہش کے ساتھ ''اندلس میں اجنبی'' اجنبیت کے منفرد زاویے سے اور فریموں کے اندر ''اے غزالِ شب'' کے فنی وتکنیکی سطح پرایک فریم سے دوسرے میں منتقل ہونے کا میاب ایڈیٹنگ کے جامع اثرات عصری تقابل کے باعث پسند آئے۔ ''قصۂ پارینہ'' کا متوقع یا غیر متوقع موڑ گہرا نقش لئے تھا۔فیض صاحب کی چائے میں گھلتی مسکراہٹ، ملکہ ترنم کی رعنائی وزیبائی، کاک پٹ میں کتابی چہرہ شناسائی اور تارڑ صاحب بزبان صوفی تبسم صاحب۔اللہ اللہ کہ یہ ایک ایسا البم ہے جوگئے دنوں کا اچھوتا ئسراغ دیتا چلا گیا۔

''دوسری کربلا'' وہ جو میرے گلشن کے پھول ۔۔۔ اور شہدائے پشاور کے سانحۂ پشاور کے پس منظر میں موثر بیانیے اور متاثر کن ہیں۔طائر لاہوتی کی میر صاحبنی ماضی تا حال ایک نوع کی ریپیٹ ٹیلی کاسٹ سے گزرتی ہوئی محسوس ہوتی ہے جس میں بالخصوص نوشی کی صورت مکافاتِ عمل سے دو چار رہتی ہیں اسی باعث آخر میں الفاظ ساتھ چھوڑتے اور جذبات کی ترجمانی دل سے ہوتی ہوئی محسوس ہوتی ہے۔ کہنے سننے کی گنجائش ناپید۔کلوزنگ نوٹ اس اَن کہی پہ منتج ہوا کہ کہانی کے تاثر کو مزید گہرائی سے ہمکنار کر جاتا ہے۔مزاج ناقہ را مانندِ عرفی، مولانا حالی کی علمی ادبی خدمات وتصانیف، حالی سکول کا جلسہ مقتدر شخصیات کی شرکت اور سب سے بڑھ کر علامہ اقبال کے فارسی استقبالیہ اشعار سے تزئین پا کر مختصر مگر گرانقدر نشانِ راہ میں تبدیل ہوگیا، ہمارے محکمہ پوسٹ نے صد سالہ تقریب کے ضمن میں ایک یادگاری ٹکٹ اُن کے درج ذیل خوبصورت شعر کے ساتھ شائع کیا تھا۔

ہے جستجو کہ خوب سے ہے خوب تر کہاں\
اب دیکھئے! ٹھہرتی ہے جا کر نظر کہاں

یہ بات کئی پہلوؤں سے حیران کئے دیتی ہے کہ فن موسیقی کی باقاعدہ تعلیم نہ ہونے کے باوجود کشور کمار نے بہت خوب گایا اور ہر طرح کی گائیکی سے خود کو باکمال تسلیم کروایا۔اس سلسلے میں محمد رفیع نے واقعتاً پروفیشنل فیاضی کی انتہائی روشن مثال قائم کی جبکہ کشور کمار نے بھی کشادہ دلی سے ہمارے دو بہت شوخ وشنگ گلوکاروں احمد رُشدی اور اے۔نیئر کے سٹائل کو سراہا تھا۔

شگفتہ نازلی (لاہور)

گلزار جاوید بھائی، السلام علیکم۔

''چہار سُو'' کا تازہ شمارہ ناول نگار، افسانہ نویس، سفرنامہ نگار، ڈراما نگار، اداکار، صداکار، میزبان اور بقول کرنل محمد خان طنز ومزاح نگار مستنصر حسین تارڑ کے نام قرطاسِ اعزاز کر کے ایک اور ادبی کارنامہ، اردو رسائل کی تاریخ میں رقم کیا ہے۔ ''براہِ راست'' میں آپ کے سوالات اس بات کے شاہد ہیں کہ کسی متنوع صلاحیتوں کے تخلیق کار سے کس طرح انٹرویو کیا جاتا ہے۔تارڑ صاحب نے جوابات تفصیل، دلیل اور دلچسپی سے دیے ہیں ان جوابات سے تارڑ صاحب کا عمیق مطالعہ اور گہرا مشاہدہ صاف ظاہر ہوتا ہے۔

گلزار جاوید صاحب آپ نے درست لکھا ہے کہ ''پاکستان کے نامور باغ و بہار بلکہ صدا بہار تخلیق کار۔۔۔'' مستنصر حسین تارڑ صاحب پر پورا اترتا ہے۔''عشق کے امتحان'' میں محبوب بگٹی نے تارڑ صاحب کا مقام پیدائش نہیں لکھا۔''جنہوں نے مسکرانا سکھایا'' میں تارڑ صاحب نے شفیق الرحمٰن کو محبت سے یاد کیا ہے۔کرنل محمد خان، ڈاکٹر وزیر آغا، پروفیسر ریاض صدیقی، منشا یاد ان مرحومین کی یہ زندہ تحریریں تارڑ صاحب کے فکر وفن کے مختلف زاویے روشن کرتی ہیں۔۲۶۔اگست ۱۹۸۳ء کا محمد خالد اختر کا خط تارڑ صاحب کے نام دلچسپ ہے۔

غالب عرفان کی حمد اور خورشید انور رضوی کا نعتیہ سلام میں اطاعت، محبت اور فکر کی خوشبو بسی ہوئی ہے۔اختر شاہ جہاں پوری، مظفر حنفی، صدیق شاہد، ڈاکٹر رؤف خیر، کرامت بخاری، پروفیسر زہیر کنجاہی، شگفتہ نازلی، عارف شفیق، اسد اعوان، ابراہیم عدیل، سبھاش گپتا شفیق اور علی شاہ کی غزلوں کی ندرت اور تازگی نے متاثر کیا۔کوثر صدیقی نے اپنی غزل کی ردیف ''بیٹا'' سے منفرد معنی کشید کیے ہیں۔سلیم انصاری کی غزل ثقافت کی ترجمان محسوس ہوتی ہے۔

یہ دادی اور نانی کھو رہے ہیں\
کہ بچے اب کہانی کھو رہے ہیں

الیکٹرانک میڈیا (جدید سائنس) نے بچوں سے بچپن چھین لیا ہے۔''چند سیپیاں سمندروں سے'' میں پروین شیر صاحبہ نے اپنے دل کش اسلوب گرفت میں لے رکھا ہے۔موجودہ قسط میں ۱۸۷۳ء کی قائم کردہ یونیورسٹی گورے کالے میں امتیازی بلکہ نسلی تعصب Soweto student Representative Council یا تحریک، جہیز اور شادی کی رسم کی روداد دل خراش بھی ہے اور پُر تجسس بھی۔

''ایک صدی کا قصہ'' دیپک کنول نے اداکار، گلوکار، فلم ساز اور منفرد شخصیت کشور کمار کی دلچسپ کہانی سنائی ہے۔واقعات بڑے عجیب بیان کیے ہیں۔گلزار جاوید بھائی آپ کا افسانہ ''طائر لاہوتی'' لالچ، ہوسِ زر اور گناہوں کی تلخ حقیقتوں کا بیان ہے اور پھر قلم گلزار جاوید بھائی کا ہو تو کیا بات ہے۔''گھٹن بھری دھند'' دیوی ناگرانی نے ایک عام سی کہانی خط کی طرز پر تحریر کی ہے۔محبت کے نام پر بے راہ روی کی طرف اشارہ کیا ہے۔شائستہ عالم اور منیرہ احمد شمیم کے افسانے پیش کش کے لحاظ سے پسند آئے۔یعقوب نظامی صاحب نے پروفیسر غازی علم الدین کی کتاب ''لسانی مطالعے'' کا جائزہ محنت سے کیا ہے۔نظموں میں عبداللہ جاوید کی نظم ''نیند کی ماتا'' ڈاکٹر جواز جعفری کی ''میں اپنے قبیلے کا رزمیہ نگار ہوں'' اور سانحۂ پشاور کے حوالے سے عظمٰی صدیقی اور ڈاکٹر انیس الرحمان کی تخلیقات نے متاثر کیا۔

نوید سروش (میر پور خاص)

گلزار جاوید صاحب، آداب و تسلیم۔

اس مرتبہ قرطاسِ اعزاز جناب مستنصر حسین تارڑ صاحب کے نام ہے۔ایک زمانے میں بڑا شاندار جریدہ بنام ''رابطہ'' شائع ہوتا تھا۔راقم مکہ مکرمہ میں مقیم تھا۔اس جریدے میں تارڑ صاحب کے چند سفرنامے پڑھے۔وہ دن اور آج کا دن میری لائبریری ان کی تصانیف سے مزین ہے۔ان کا اسلوب، تیکھا انداز اور قوت اظہار ایک زمانہ ان کا گرویدہ۔افسانہ نگار کی حیثیت سے ایک دنیا ان کی پرستار۔میں بھی سیکھنے کی کوشش کرتا ہوں۔گزشتہ عالمی اردو کانفرنس میں وہ کراچی آئے ہوئے تھے۔آرٹس کونسل میں ان سے سرسری ملاقات ہوئی حالانکہ دل بے چین ان سے تفصیلی گفتگو کا خواہاں تھا جو بوجوہ پورا نہیں ہو سکا۔پاکستان کے خوبصورت اور جنّت نظیر شمالی علاقے کے سفرناموں نے ہمیں وہ سیر کروائی کہ اب جی چاہتا ہے کہ ان علاقوں کو جا کر دیکھا جائے۔مثلاً ہنزہ داستان، سفر شمال کے، کے ٹو کہانی، نانگا پربت، پاک سرائے، کیلاش، سنولیک اور شمشال بے مثال وغیرہ۔ایک لطیفہ۔۔۔ان کا نام ذرا مشکل ہے۔پاکستانی تو خیر اہلِ زبان ہیں۔یورپ میں یہ مشکل دیدنی ہوتی ہے۔جناب تارڑ صاحب نے اس کا حل یہ نکالا کہ وہ اپنا نام مستنصر کو Must Answer بتائے۔

نجیب عمر (کراچی)

گلزار جاوید صاحب، السلام علیکم۔

آپ کی محبت بصورت ''چہارسوٗ'' بہم ہے۔آپ جانیں ہم بہت ثروت مند ہیں۔عصری تقاضوں اور جدید رجحانات سے عبارت ''چہارسوٗ'' اپنی مثال آپ ہے۔خوبصورت نثری اور منظوم تحریریں انفرادیت کی حامل ہیں۔میرے خیال میں ''چہارسوٗ'' واحد ادبی جریدہ ہے جو ہر لحاظ سے منفرد ہے اوّل تا آخر قاری کا انہماک اور تجسس برقرار رہتا ہے۔استفادے کی ہزار ہا صورتیں نکلتی ہیں۔مستنصر حسین تارڑ صاحب پر ''قرطاسِ اعزاز'' کا بھی جواب نہیں۔

تصور اقبال (اٹک)

گلزار جاوید صاحب، السلام علیکم۔

اس بار قرطاس اعزاز اپنے پسندیدہ افسانہ نگار، سفر نامہ نگار اور اناؤنسر محترم مستنصر حسین تارڑ کے نام پڑھ کر بے پایاں مسرت ہوئی ہم بچپن سے انہیں پڑھتے آئے ہیں وہ ملک کے نامور اہل قلم میں شمار ہوتے ہیں۔معروف اہل قلم کے لکھے ہوئے مضامین نے صاحبِ اعزاز کے فن اور شخصیت کو مزید اجاگر کر دیا ہے۔براہِ راست کے سوال ہمیشہ کی طرح گیرائی اور گہرائی کے حامل ہیں۔افسانے ''عرس کملے شاہ'' (نند کشور وکرم) ''اللہ کا وعدہ'' (شائستہ عالم) ''ادھوری لڑکی'' (منیرہ احمد شمیم) ''طائر لاہوتی'' (گلزار جاوید) بے حد خوبصورت افسانے ہیں۔پروین شیر صاحبہ کا سفر نامہ معلوماتی سفرنامہ ہے جسے انہوں نے اپنے اچھوتے اسلوب میں بڑی خوبصورتی سے تحریر کیا ہے۔

ابراہیم عدیل (جھنگ)

جناب گل زار جاوید، السلام علیکم۔

مارچ، اپریل ۲۰۱۵ء کے شمارے کا مطالعہ کیا۔اس کے لکھنے، پڑھنے والوں میں امریکہ کے لوگ بھی ہیں، ہندوستانی، پاکستانی بھی ہیں، روسی، برٹش اور کینیڈین بھی ہیں؛ گویا چہارسو میں پوری دنیا سمائی ہوئی ہے۔اب معلوم ہوا کہ اس مجلّے کا ''چہارسوٗ'' نام رکھنے والوں کو اس کی وسعت کا اندازہ تھا۔حسب معمول اس بار بھی آپ ایک نابغہ شخصیت کو زیر دام لانے میں کامیاب ہوئے۔مستنصر حسین تارڑ نہ صرف خود بہت بڑے ادیب ہیں بلکہ ان کی تحریر سے تحریک پا کر کئی لوگ اچھے خاصے لکھاری بن گئے ہیں۔مستنصر حسین تارڑ ایک اکیڈمی کا نام ہے۔انٹرویو چونکہ تازہ ہی لیا گیا ہے اس لیے مستنصر کی روایتی شرارت اور شگفتگی کو برقرار دیکھ کر خوشی ہوئی۔ان پر لکھے گئے مضامین میں سے مجھے وزیر آغا مرحوم کا مضمون مجھے زیادہ اچھا لگا۔مستنصر صاحب ''قصۂ پارینہ'' میں آپ نے کیسا خوبصورت ماحول بنا کر اس جوڑے کو مار دیا۔مجھے آپ سے اس معاملے میں اختلاف ہے۔

''عرس کملے شاہ'' پڑھ کر سکتے میں آ گیا کہ کیا نند کشور وکرم جیسا نامور ادیب ایسی پُر تعصب تحریر لکھ سکتا ہے؟ انھیں ایک لمحے کے لیے بھی یہ خیال نہیں آیا کہ برصغیر پاک و ہند میں کروڑوں لوگ مزارات سے وابستہ ہیں اور مزارات کی باقاعدہ تاریخ ہے۔صغیر رحمانی نے ''ڈاڑھی'' میں یہ بات سمجھانے کی کوشش کی ہے کہ ہر ڈاڑھی والا مسلمان دہشت نہیں ہوتا، اگرچہ دنیا اس وقت کچھ ایسا ہی سمجھ رہی ہے جس میں قصور خود ان لوگوں کا ہے جو ڈاڑھی رکھ کر اور اسلام کے نام پر قتل عام کرتے ہیں اور اسلام کی بدنامی کا سبب بن رہے ہیں۔اس افسانے میں یہ پیغام بھی ہے کہ جب انسانی نفسیات ایک نقطے پر ہی ٹھہر جائے تو اس کو لوگوں کے تمام افعال اپنی نفسیات کے تابع نظر آتے ہیں۔گل زار جاوید کا افسانہ طاہر لاہوتی کلاسیکی اسلوب میں لکھا ہوا عمدہ افسانہ ہے۔اصل میں افسانہ ہوتا ہی وہ ہے جس میں افسانہ نگار داخلیت اور خارجیت دونوں سے استفادہ کرتے ہوئے کہانی مرتب کرے لیکن ترقی پسندی کے سیلاب نے مشاہدے اور خارجی مشاہدے کو زیادہ اہمیت دی؛ جس سے پختہ افسانہ نگاروں کو تو یقیناً فائدہ ہوا لیکن عام آدمی نے رپورٹنگ کو بھی افسانہ سمجھ لیا اور یوں خام افسانہ نگاروں کی ایسی فصل تیار ہو گئی رپورٹنگ کے انداز میں افسانے لکھ رہے ہیں اور وہ رسائل میں شائع بھی ہو رہے ہیں۔ادھوری لڑکی کا موضوع عمدہ ہے مگر اس کی پیش کش میں عجلت سے کام لیا گیا۔اس پر مزید غور کرنے سے ایک اچھا افسانہ برآمد کیا جا سکتا ہے۔غزلیات میں مظفر حنفی، صدیق شاہد، غالب عرفان، عارف شفیق، ابراہیم عدیل و رسلیم انصاری کی غزلیں پسند آئیں۔ایک غزل برائے اشاعت پیش کرتا ہوں۔

سید نصرت بخاری (اٹک)

برادرِعزیز گلزار جاوید صاحب، تسلیمات۔

اس بار قرطاس اعزاز جناب مستنصر حسین تارڑ صاحب کے نام کر کے آپ نے نمایاں کام کیا ہے۔ میری ذاتی طور پر تو تارڑ صاحب سے جان پہچان نہیں ہے لیکن اُن کی بہت ساری تخلیقات مثلاً ''جنھوں نے مسکرانا سکھایا''، ''پاروشنی کا سایہ''، ''بہے تو رُو'' وغیرہ پڑھنے پر ایسے لگا جیسے اُن سے حقیقی ملاقات ہوگئی۔ ادب کی دنیا میں یہی تو ایک خاص بات ہے کہ ہر ادیب کی تخلیق خود بولتی ہے اور یہ اس بات کا ثبوت ہے کہ اُس کا راقم الحروف ایک اونچے درجے کا قلمکار ہے۔ اور ساتھ ہی ایک بہت اچھا انسان بھی ہے۔ جناب تارڑ صاحب کو بہت بہت مبارکباد۔ میں جیسے جیسے جناب مستنصر حسین تارڑ صاحب کے افسانے پڑھتا گیا تو مجھے احساس ہوا کہ اس طرح کا طرزِ بیاں میں نے پہلے کبھی نہیں پڑھا۔ بعد میں جب پروفیسر ریاض صدیقی کا ''کھیتوں کے سلگتے سہاگ'' نظر سے گذرا جو جناب تارڑ صاحب کے اور بجنل افسانے ''بہاؤ'' میں سے منتخب کیا گیا ہے تو میرا یقین اور بھی مضبوط ہوگیا۔ پاروشنی کا کردار اُس قدر طاقت ور بنادیا گیا ہے کہ وہ حقیقی لگتا ہے۔ شاید اُسی لیے تارڑ صاحب پچھلے بیس سالوں سے پاکستان کے بیسٹ سیلر اُردو مصنف ہیں۔

جب میری نگاہ ''براہِ راست'' پر جاتی ہے تو ایسا محسوس ہوتا کہ محفل آپ نے انتہائی خوبصورتی سے سجائی ہے اُس میں کہیں نہ کہیں میں بھی موجود ہوں اور تمام سوال جواب میرے سامنے ہو رہے ہیں شاید اس لیے بھی کہ یہ پروگرام میرا پسندیدہ پروگرام ہے اور میں ''چہارسُو'' ملنے پر ''براہِ راست'' پڑھنے سے ہی شروع کرتا ہوں۔ ''لائبریری والے جب تارڑ صاحب کو دیکھتے ہی انکار میں ہاتھ ہلاتے ہوئے کہتے ہیں کہ کوئی نئی کتاب نہیں ہے یعنی تم نے لائبریری کی تمام کتابیں تو پڑھ ڈالی ہیں اب روز نئی کتاب ہم کہاں سے لائیں؟'' تارڑ صاحب یہ بھی فرماتے ہیں کہ ''جو لوگ ایک کتاب ہفتہ دس روز میں ختم کرتے تھے میں ایک دن میں ہی ختم کرلیا کرتا تھا''، بہت خوب۔ یہ بات بھی سچ ثابت ہو گئی کہ ''ہونہار بروا کے چکنے پات''

تارڑ صاحب کو سفرنامے کا ''باوا آدم'' کا خطاب جو اخبار ''ڈان'' نے دیا ہے وہ بھی پُرمعنی ہے۔ جابہ جا اُن کے سفرناموں کا ذکر آتا ہے میں سمجھتا ہوں کہ اگر کسی کو ٹورا اینڈ ٹریول کا شوق ہو تو اُس کو سب سے پہلے ہنس مُکھ، من موجی اور صدا بہار انسان تو ہونا ہی چاہیے لیکن تارڑ صاحب نے تو اس کے بالکل برعکس کہا ہے ''میرے اندر کی دنیا سوگوار ہے۔ آپ کو میرے ناول میں اکثر موت کا ذکر ملتا ہے جس سے قاری کو فضا سوگوار نظر آتی ہے لیکن میں موت کو مثبت انداز میں لیتا ہوں۔ میرے خیال میں کائنات میں جو حسن ہے وہ موت کا مرہون منت ہے۔'' وادیاں، چشمے اور کوہ دمن وغیرہ اپنی تعریف خود نہیں کر سکتے جب تک تخلیق کار اپنے قلم سے اُنہیں زبان عطا نہ کرے۔''

۱۶۔دسمبر۲۰۱۴ء کے شہدائے پشاور پر جناب رتن سنگھ کا ''دوسری کربلا''، اور جناب ڈاکٹر انیس الرحمٰن اور محترمہ عظمیٰ صدیقی کے خراجِ عقیدت پڑھ کر ماحول ایک بار پھر سوگوار ہوگیا۔ میں نے بھی اُسی دن آپ کو اسی موضوع پر ایک عریضہ ارسال کیا تھا جس میں اپنا دُکھ درد ان لفظوں میں بیان کیا تھا کہ:

پھول تو دو دن بہارِ گلستاں دِکھلا گئے
حسرت اُن غنچوں پہ ہے جو بِن کھلے مُرجھا گئے

جناب نند کشور وکرم صاحب کا ''عرس کملے شاہ'' بہت ہی عمدہ اور معیاری ہے انہوں نے ایک طوطے اور مینا کے منہ سے عرس کی پوری داستاں سُنا کر حقیقت سے بخوبی پردہ اٹھایا ہے جس کے لیے وہ مبارکباد کے مستحق ہیں۔ منیرہ احمد شمیم کی ''ادھوری لڑکی'' بھی باکمال ہے۔ چند سال ایک ساتھ رہنے کے باوجود وہ اپنی سہیلی کا ہینڈ رائٹنگ پہچان نہیں پائی جو اُس کی تنہائی دُور کرنے کے لیے وہ اُس کو لگاتار خط لکھتی رہی۔ بحرحال منیرہ بی کی یہ تخلیق بھی خود بولتی ہے کہ اُس کو لکھنے والا ادیب ایک ہنرمند اور معتبر قلمکار ہے۔ آپ کی ''طائر لاہوتی'' سماج میں بڑھتے ہوئے جرائم بالخصوص جب نصب العین فقط حصولِ زر ہو تو اُنسان کسی بھی حد تک گر سکتا ہے۔ ایک عمدہ کہانی ہے، بہت بہت مبادکباد۔

غزلوں میں جناب حسن عسکری کی غزل بہت عمدہ ہے جب وہ کہتے ہیں:

آیا تھا کون رکھ گیا گلدستہ میز پر
مرنے کے اب قریب ہے بیمار سامنے

دو بار جنم لینے والے ڈاکٹر جواز جعفری صاحب کی غزلیں ''میں اپنے قبیلے کا رزمیہ نگار ہوں'' بہت خوبصورت کہا ہے کہ

مجھے دو بار پیدائش کے تجربے سے گذرنا پڑا
ایک بار تو اپنی ماں کی کوکھ سے پیدا ہوا
اور دوسری بار جب میں نے بطور شاعر جنم لیا۔۔۔

کرشن نندہ (چندی گڑھ، بھارت)

گلزار بھائی، بے حد سلام۔

یوں تو چہارسو کا ہر شمارہ اپنی نوع کا۔۔۔لیکن اس بار مستنصر حسین تارڑ پر سرورق اور خاصا گوشہ۔۔۔مزہ آیا۔ سکیچ بہت عمدہ ہے۔ جب میں پاکستان ٹیلی ویژن اسلام آباد مرکز پر نئی نئی پروڈیوسر نیوز تعینات ہوئی تھی تو تارڑ صاحب صبح کی نشریات کے میزبان تھے۔ ثقافت کے موضوع پر میری مختصر نیوز رپورٹس جب بلیٹنز میں چلتیں تو خبروں کے بعد اپنی نشریات کے دوبارہ شروع ہونے پر وہ ان ثقافتی رپورٹس کا اکثر تذکرہ کرتے اور سراہتے تو اس حوصلہ افزائی پر نوآموز رپورٹر بڑی خوش ہوتی۔ تارڑ صاحب اردو ناول اور سفرنامے کا ایک معتبر نام ہیں۔ چھوٹی چھوٹی جزئیات، منظر نگاری، مقامِ سیاحت کا جغرافیائی اور تاریخی تعارف، کرداروں کے مکالمے اور باڈی لینگویج وہ تمام ہی اجزائے ترکیبی پر نظر رکھتے ہیں۔ خوب خوش رہیں اور لکھتے جائیں یہ دعا ہے میری!!

فرخندہ شمیم (راولپنڈی)

...... معیارِ ہنر ......

یقیناً اے۔جی جوش سادہ دل، سادہ مزاج اور سادگی پسند تھے یہی وہ اوصاف ہیں جو اس عہد بے تعبیر میں کم بہت کم ہوکر رہ گئے ہیں۔ ہمعصر ادیبوں نے جوش کی دریا دلی دیکھی ان کی ضیافت اور دعوت پرخوش دلی کے ساتھ موجود پائے گئے۔ اسی طرح ان کی رخصت آخری کے وقت بھی رنجیدہ خاطر دکھائی دیئے۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ اے۔جی جوش کے تخلیقی سرمائے اور شخصیت وفن کے حوالے سے کتنے لوگ ''ادب دوست'' بن کر سامنے آتے ہیں۔ ان کو خراجِ تحسین پیش کرنے کا یہی طریقہ ہے کہ عصر حاضر میں ان پر تحقیقی کام کا آغاز اور ان کی ادبی خدمات کا اعتراف کیا جائے۔ یقیناً وہ اُردو غزل گوشعرا میں اپنے منفرد لہجے اور سچے جذبوں کے اظہار کے حوالے سے ایسی جانی پہچانی شخصیت کے حامل تھے کہ سہلِ ممتنع شعر کہنا ان کی فطرتِ ثانیہ بن گئی تھی اس کے باوصف مروجہ متوازن بحور کے استعمال پر انہیں پوری قدرت حاصل تھی، اے۔جی جوش سراپا محبت تھے اور ان کی غزل محبت اور احترام آدمیت کا آئینہ اور کلاسیکی اندازِ اظہار کا عکسِ جمیل ہے۔

......حسن عسکری کاظمی

(معیارِ ہنر سے منتخبہ)

قیمت: ۵۰۰ روپے، دستیابی: اظہار سنز پرنٹرز، اردو بازار، لاہور۔

...... تھوڑی سی روشنی ......

پرویز کی شاعری میں اپنے بزرگوں سے انحراف اگر ہے تو وہ اس کی نسل کی سوچ کے عین مطابق ہے، ورنہ تو جدت، تلخی، طنز، بے خوفی وغیرہ ان کے بزرگوں کا ورثہ ہے۔ پرویز کا شعری آہنگ اگر تلخ ہے تو اس کے یہاں موسیقی اور شاعری کے تال میل سے جو سمفنی بنتی ہے اس کی نغمگی روح پر محسوس کی جا سکتی ہے۔ پرویز کے یہاں جو حساسیت ہے وہ اتنی شفاف ہے کہ اس کا قاری اور سامع دونوں شرابور ہو جاتے ہیں۔ وہ اپنی شاعری کو آخری لمحوں تک سوچتا اور پھر لکھتا ہے۔ پرویز کا محور و مرکز انسان ہے اور وہ ذات کے پرکار سے دُنیا کو دائرہ کر کے اپنے احساسات اور جذبات کو اجتماعی سطح پر دیکھتا اور سوچتا ہے۔ وہ مصور ہے اس کے پاس کائنات بھر رنگ ہے۔

...... افتخار امام صدیقی

قیمت: ۳۰۰ روپے، دستیابی: موڈرن پبلشنگ ہاؤس، دہلی، بھارت۔

...... میرے کشکول میں ہیں چاند سورج ......

اردو شاعری کے ایوان میں داخل ہوئے اب عارف شفیق کو کم وبیش تیس برس ہو چکے ہیں اور یوں ان کا تعلق اس نسل سے بنتا ہے جس کی شناختی کارڈ والی عمر پچاس اور ساٹھ برس کے درمیان ہے اور شاعری میں احتجاج مزاحمت انقلاب اور بغاوت کے مضامین یوں تو اس کے ہر دور میں مل جاتے ہیں لیکن بیسویں صدی میں پہلے اقبال اور جوش پھر ترقی پسند تحریک کے شعراء کے ہاں اس کا خوب چرچا رہا۔ ان میں ایک اہم نام عارف شفیق کا بھی ہے عارف شفیق ایک سوچنے، غور تجزیہ اور سوال کرنے والے پرگو شاعر ہیں وہ نہ صرف ہر نوع کی بے انصافی اور زیادتی کی کھل کر نشاندہی کرتے اور اس پر اپنا احتجاج ریکارڈ کرواتے ہیں بلکہ اس کی وجوہات اور علاج کے طریقوں پر بھی بات کرتے ہیں۔

......امجد اسلام امجد

قیمت: ۱۵۰ روپے، دستیابی: ماہنامہ ادبی دنیا، کراچی۔

علی عباس حسینی کی کہانیاں

(جناب نند کشور وکرم کی مرتب کردہ کلیات حصہ اول سے منتخب)

(میرے افسانے) دیہاتی زندگی سے متعلق ہیں۔ وہ حقیقت بھی ہیں اور خواب بھی اور وہم بھی۔ لیکن ہمارا دیہاتی معاشرہ انہیں تانوں بانوں سے بنا ہے۔۔۔ یہ افسانے کس معیار کے ہیں اور ان سے اپنے دیہاتوں کو سمجھنے میں کتنی مدد مل سکتی ہے، اس کا فیصلہ میرے ذمہ نہیں۔ میں نے تو ایک مصور کی طرح جو کچھ دیکھا، اس کی مرقع کشی کر دی۔ ہاں کبھی کبھی دُکھتی رگوں پر بھی انگلیاں رکھ دی ہیں اور کہیں مداوا کی طرف بھی اشارہ کر دیا ہے لیکن میں آرٹ کو پروپیگنڈا بنانے کا قائل نہیں اور نہ افسانہ نگار کی جگہ سیاسی لیڈر بننے کا خواہشمند۔

علی عباس حسینی

ہوا کے دوش پر

''ہوا کے دوش پر'' میں ہمیں مشرق و مغرب کا تقابل بھی نظر آتا ہے۔ مشرقی روایات، تہذیب و تمدن، رشتوں کا تقدس، خاندانی مراسم، سماجی رابطے، یکجا خاندانی نظام، احترام اور ایثار اور مغربی رکھ رکھاؤ، وقت کی پابندی، اپنے پیشے سے محبت، ملکی ترقی کا احساس، رشتوں کی ٹوٹ پھوٹ، اخلاقی ناہمواریاں، مغرب میں مسلمان خاندانوں کی اولاد کے مسائل اور معاملات۔ غرض ''ہوا کے دوش پر'' ایک مکمل خودنوشت سوانح عمری ہے۔ بقول مشتاق یوسفی: ''ماضی انہیں یاد نہیں ہوتا جن کا داغ دار ہو اور مستقبل انہیں عزیز نہیں ہوتا جن کا تاریک ہو۔''

نوید سروش

دردکا رشتہ

بہل صاحب کا اندازِ بیاں، صاف اور شستہ ہے، پُر اثر شاعری جو لطف تو دیتی ہی ہے سوچنے پر مجبور بھی کرتی ہے مگر تنہائی کا دردقاری کو رنجیدہ کر جاتا ہے۔ اللہ کرے اُن کی شاعری سے تنہائی کا کرب ختم ہو جائے یہ تبھی ممکن ہے جب یہ سناٹا، یہ اکلاپا اُن کے اندر سے نکل جائے اور اُس کی جگہ خوشیوں بھری ایسی زندگی لے لے جس کی آرزو بقتہ صاحب کے کلام میں جا بجا عیاں اور پنہاں ہے۔ بقول غالب:

رنج سے خُوگر ہوا انساں تو مٹ جاتا ہے رنج
مشکلیں مجھ پہ پڑیں اتنی کہ آساں ہو گئیں

ڈاکٹر رینو بہل